

”آج جو دنیا داری کی آخری رسم تھی۔ سو وہ بھی پوری ہو گئی آج چہلم بھی ہو گیا اور مرے ہوؤں کے ساتھ بھلا کوئی کب مرا ہے۔ دنیا کے سب سلسلے یونہی چلتے رہتے ہیں بس جانے والوں کا ہی سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ سکندر جیسا بھائی اور شہلا جیسی بھابھی بھلا بھلائے جانے والے لوگ ہیں، اتنے ملنسار، اتنی محبت کرنے والے، سب کا سب موقعوں پر خیال کرنے والے، اتنی جلدی ہم سے منہ موڑ گئے کہ یقین نہیں آتا ابھی تک یوں تو ہماری ساری زندگی کو جیسے ویران کر گئے ہیں اور اگر سانس لینے کا نام ہی زندگی ہے تو ہم واقعی زندہ ہیں۔“

تایا جی کی ڈوبتی ابھرتی آواز ان کے دلی غم اور دکھ کی غمازی کر رہی تھی۔ وہ ایک گہرا سانس لے کر چپ کر گئے۔

”صحیح کہتے ہیں بھائی صاحب آپ! نہ ان کی زندگی بھلائی جاسکتی ہے نہ موت۔ اتنی خوش باش خوشگوار محبت بھری زندگی انہوں نے گزاری اور ایسی جواں مرگی میں اٹھ گئے کہ پھر بھی ایشک بار تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت خاص میں جگہ دے ہم تو اب یہی کر سکتے ہیں۔“ نکل جمال کی آواز غم آلود تھی۔

”آمین، ہم سب کی تو اب یہی دعا ہے۔ ان کے فانی وجود تو اس دنیا سے ختم ہو گئے، لیکن جو نشانیاں وہ دونوں چھوڑ گئے ہیں۔ ایک طرح سے خدا کے بعد ہماری امان میں ہیں۔ خدا ہمیں روز قیامت ان کے سامنے سرخرو ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔“

رُخسانہ نگارِ علان



تایا جی کی آواز خاصی مدہم تھی، مگر کمرے میں اس قدر خاموشی تھی کہ دو سرے کمرے کی کھڑکی سے چپکی ایمن بھی ان کی آواز بخوبی سن سکتی تھی۔

”اگر دونوں میں سے ایک بھی زندہ رہتا تو یہ مسئلہ کبھی نہ اٹھتا۔ ماں یا باپ خود ہی بچوں کو اپنے پروں میں سمیٹ کر بیٹھ جاتا، ہمیں یہ فکریں نہ ہوتیں۔“

”نہوں تو یہی تو سارا مسئلہ ہے۔“ تائی جی کی ”ہوں“ خاصی طویل معنی خیز اور دردناک تھی۔ سفینہ پھوپھو نے ایک ناگوار سی نظر ان پر ڈال کر ذرا سا رخ پھیر لیا۔

”اب یہ تو ظاہر ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی اس قدر خوشحال نہیں کہ سب بچوں کی ذمہ داری اٹھا سکے اگر اٹھا بھی لے تو اس سے عمدہ بر آہونا کوئی آسان کام ہے، سب ہی ماشا اللہ سے فیملی والے ہیں۔ میرے حالات بھی آپ لوگوں کے سامنے ہیں ورنہ میں ہی سب کو سمیٹ لیتا۔“ انہوں نے ایک لمحے کو سب کی طرف دیکھا۔

”مہنگائی آسان سے باتیں کر رہی ہے بھائی صاحب! اور بچے بھی ماشا اللہ ایک دو نہیں اکٹھے چار ہیں، جانے والے تو چلے گئے اصل امتحان تو اب ہمارا شروع ہوا ہے یہاں تو اپنے گھروں کے اخراجات سر اٹھانے نہیں دیتے

اوپر سے یہ ذمہ داریاں۔ "عائف چچا کا لہجہ کچھ بیزار سا تھا۔

"ہوں" اسی لیے میں نے سوچا ہے کہ ہم یہ ذمہ داریاں بانٹ لیتے ہیں ویسے بھی سفینہ کی پرسوں صبح کی فلائٹ ہے۔ اس لیے سب کچھ آج ہی طے ہو جانا چاہیے، ٹھیک ہے سکندر بڑا اچھا گھر چھوڑ کر گیا ہے اور بینک میں بھی کچھ رقم موجود ہے، پھر کچھ حساب اس کے بینک والوں کی طرف سے بھی نکلتا ہے، اتنا ہے کہ مل کر بچوں کی اچھی پرورش ہو سکتی ہے لیکن سب کچھ پیسہ ہی نہیں ہوتا اصل ضرورت تو اچھے سرپرست کی ہے جو ان بچوں کی اچھی تربیت کر سکے، اب انہیں فی الحال اس گھر میں بھی نہیں چھوڑا جاسکتا۔ بچے چھوٹے ہیں ابھی اور پھر اگر کچھ بڑے بھی ہوتے تو بھی بڑی تینوں تو بچیاں ہی ہیں ماموں تو ابھی بہت چھوٹا ہے اور آج کل کون سا زمانہ ہے یوں بچیوں کے تنہا رہنے کا؟ اس لیے میں نے سوچا ہے۔"

انہوں نے ذرا رک کر سب کے چہروں کے تاثرات دیکھے سب ہی ان کی طرف متوجہ تھے۔

"ہم چاروں ایک ایک بچے کی ذمہ داری اٹھا لیتے ہیں۔" اور کھڑکی سے چپکی ایمن لرز کر رہ گئی "گھر کرائے پر اٹھا دیتے ہیں۔ ان کے بڑے ہونے پر جتنا کرایہ اکٹھا ہو گا بینک میں وہ ان کی شادیوں پر لگا دیں گے کیا خیال ہے آپ لوگوں کا۔؟" انہوں نے بات مکمل کر کے از سر نو سب کا جائزہ لیا۔

"ہوں خیال تو اچھا ہے مجھے پسند آیا ہے۔ اس طرح سب بچوں کو انفرادی توجہ اور محبت بھی مل جائے گی اور ان کی جائیداد بھی محفوظ رہے گی کل کو ان کے کام آئے گی اور ہم میں سے کسی پر کوئی بوجھ بھی نہیں پڑے گا۔" سفینہ پھوپھو سب سے پہلے بولیں۔

"لیکن کیا اس طرح بچوں کے ذہن ڈسٹرب نہیں ہوں گے، کہاں تو ماں باپ کے ساتھ سب اکٹھے رہتے تھے اور کہاں اس طرح سے انہیں ایک دوسرے سے اور دور کر دینا جبکہ ابھی ان کے زخم بھی ہرے ہیں۔ ایک تو ماں باپ کی جدائی اوپر سے ایک دوسرے سے دوری اور بچے تو پھول کی طرح تازک ہوتے ہیں۔ دونوں میں ملنا جائیں گے پھر سکندر اور شملہ کے بچے، جنہوں نے اپنے بچوں کو کبھی لہجے کی گرم ہوا بھی نہیں لگائی تھی اب ایک دم ان کو ایک دم سے دوریوں کی دوزخ میں جھونک دیا جائے میرا تو خیال ہے یہ مناسب نہیں۔" انکل جمال کچھ ناگواری سے بولے۔

"ہاں تو بچے اب اتنے بھی بچے نہیں ہیں کہ موت کا مفہوم نہ سمجھ سکیں یہ تو انہیں بھی پتا ہے کہ جو ایک بار چلا جاتا ہے دوبارہ نہیں آسکتا اب ان کے ماں باپ تو آنے سے رہے اور یہ زخم انہیں قدرت نے لگایا ہے ہم نے نہیں۔ ہم تو ظاہر ہے ان کی بھلائی کے لیے سب کچھ کر رہے ہیں اب چاروں کو اکٹھا رکھنے کا مطلب ہے کہ ہم میں سے کسی ایک پر ساری ذمہ داری ڈال دی جائے اور بھی صاف بات ہے کم از کم میں اکیلا تو اتنی بھاری ذمہ داری نہیں اٹھا سکتا۔"

عائف چچا کا لہجہ اور انداز بہت کچھ سمجھا دینے والا تھا۔

"خیر اگر اٹھانا چاہو تو اٹھا بھی سکتے ہو، سرائکس کی فیکٹری ہے مل ہے کپڑے کی اور کئی کنال کا اتنا بڑا گھر ہے اور ایک ہی تو بیٹی ہے تمہاری اور ایسا کرنا میرے خیال میں تمہارے لیے زیادہ مشکل نہیں ہو گا۔" انکل جمال نے جتاتے ہوئے کہا۔

"سرائکس کی فیکٹری اور مل میری نہیں میری بیوی کی ہے یہ سب آپ کو بھی پتا ہے اور فیکٹریوں والے بھی محنت کرتے ہیں اس مگنگ نہیں کرتے نہ ان کی فیکٹریوں میں نوٹ بنتے ہیں، کپڑے کو فیکٹری آئے ہیں مگر ہاتھ ایک تنخواہ دار ملازم سے زیادہ کچھ نہیں آتا۔ آئے دن مزدوروں کے مطالبات اور ہڑتالیں، اوپر سے گورنمنٹ کے نئے نئے ٹیکس ہمارے پاس بچتا ہی کیا ہے جیسے ہم لوگ زندگی گزارتے ہیں یہ ہم ہی جانتے ہیں آپ کو تو چاہے گورنمنٹ ڈسبے

چاہے تیرے، پہلی کی پہلی تنخواہ مل ہی جاتی ہوتی ہے۔ یہ عذاب تو ہم جیسوں کے لیے ہے خود چاہے مر مر کر جیو، در کر کر کو تنخواہیں دینا ہی پڑتی ہیں اور ٹیکس سے بھلا کون بھاگ سکتا ہے اوپر سے اس وقت جو بزنس کا حال ہے سب کے سامنے ہے بین الاقوامی، نگران آیا ہوا ہے بزنس ورلڈ میں۔"

عائف چچا کی دکھتی ہوئی رگ پر جیسے کسی نے ہاتھ رکھ دیا، وہ ہر بزنس مین کی طرح اپنے دکھڑے بلا ٹکان سنانے لگے۔

"اگر ایسی ہی ہماری قوم ٹیکس دینے والی ہوتی تو آج ملک کی ترقی کا یہ عالم نہ ہوتا، اور مزدور طبقہ اتنا ہی آپ لوگوں کی اعلا ظنی سے فیض یاب ہو رہا ہوتا تو بھوک اور تنگ کا یہ عالم نہ ہوتا۔" جمال انکل بھی ٹیچر تھے وہ کہاں ہارنے والے تھے۔

"اس ملک کی حکومتوں کو تو عادت پڑی ہوئی ہے، ہر وقت دیوالیہ ہونے کا دوا بٹا کرنے کی اور عوام اس سے زیادہ ڈھونگی۔ جتنا دے دو ان کی جھولیاں بھرتی ہیں نہ فیکس۔" عائف چچا نخوت بھرے لہجے میں بولے۔

"یہ کیا فضول کی بحث لے کر بیٹھ گئے تم لوگ۔ اس وقت یہ موضوع شروع کرنے کی کیا تک ہنٹی ہے۔ بھلا فضول میں ہونہ؟" تایا جی غصے میں آگئے۔ "بات کچھ ہو رہی تھی۔ یہ دونوں پتا نہیں کون سی راگنی چھیڑ کر بیٹھ گئے۔" ان کی بات پر لاؤنج میں پھر خاموشی چھا گئی۔

"اسی لیے تو کہتا ہوں کہ نہ کسی ایک پر یہ ذمہ داری پڑے نہ کوئی اس قدر تنگ دل ہو کہ بچوں کی زندگی بھی اجیرن ہو جائے اور اس کی اپنی بھی۔ ہم سب مل بانٹ کر ان ذمہ داریوں کو اٹھا لیتے ہیں اور بظاہر میرے خیال میں اس میں کوئی برائی بھی نہیں، گھر کی بات گھر میں ہی رہ جائے گی۔" تایا جی نے دھیرے دھیرے اپنا پر سکون لہجہ بحال کرتے ہوئے کہا۔ "ہر بچوں کے ڈسٹرب ہونے کا سوال آہستہ آہستہ انہیں محبت اور توجہ ملے گی تو خود ہی سب کچھ بھول بھال جائیں گے اس کے علاوہ کم از کم سال میں ایک دو دفعہ ان کو آپس میں ملوا دیا جائے تو ان کے ذہن سیٹ ہو جائیں گے۔"

"بھائی جان صحیح کہتے ہیں، میں تو ایگری ہوں ان کی بات سے۔ اس طرح ہر بچے کو انفرادی طور پر توجہ اور محبت مل جائے گی، آخر سب کا ان سے خون کا رشتہ ہے اور کسی پر بوجھ بھی نہیں پڑے گا۔"

سفینہ پھوپھو نے تایا جی کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"بناوہ کر لیں بچوں کا۔ ہاں یہ دن بھی آنے تھے میری بہن کے پھولوں جیسے بچوں کی تقسیم ہوگی۔ جائیداد کا بناوہ تو شتا تھا آج ان معصوموں کا بھی۔" غزالہ آنٹی رونے لگیں۔

"بہت تکلیف وہ حقیقت ہے غزالہ! بلکہ دل پر کاری چوٹ لگتی ہے۔ پر کیا کریں اور کوئی چارہ بھی تو نہیں۔ سب صورتحال تمہارے سامنے ہے یا ہم لوگ جان بوجھ کر کر رہے ہیں اور پھر ان کو اس گھر میں اکیلا بھی تو نہیں چھوڑا جا سکتا، ساتھ کون رہے گا سب اپنی زندگیوں میں مصروف ہیں اور اس کے علاوہ آج کل کوئی بھروسے کا آدمی ملتا کہاں ہے پھر بچوں کا معاملہ ہے۔ ماں لو کی طریقہ صحیح ہے ان کے حق میں بہتر ہے۔" تایا جی نے غزالہ کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے غمگین لہجے میں کہا۔

"ظاہر ہے اب اور کوئی صورت بھی تو نہیں۔ بھائی جان میری تو پرسوں صبح کی فلائٹ ہے، زیر کا شارجہ سے تین بار فون آچکا ہے کہ اب ایک دن بھی اور نہ لگانا پورے ڈیڑھ ماہ سے دونوں بچیوں اور گھر بار کو چھوڑا ہوا ہے میں نے مون کو اپنے ساتھ لے جاتی ہوں۔ میرے بھائی کی نشانی ہے مجھے اپنی جان سے بڑھ کر پیارا ہو گا مون اور پھر میری بچیوں کی محرومی دور ہو جائے گی۔ دونوں کو ہی بھائی کا بڑا ارمان تھا، اللہ نے کسی صورت میں ان کی دعا قبول

سفینہ پھوپھو نے جلدی جلدی اپنا مدعا بیان کیا۔

”اور جو ایمن اور عبیرہ نے اللہ سے دعا میں کر کے مون کو مانگا تھا سفینہ وہ بھول گئیں تم۔“ غزالہ روتے روتے بولیں۔ ”وہ یہ جدائی سہہ لیں گی؟“

سفینہ پھوپھو ایک بل کو چپ رہ گئیں۔

”اب اس کا کیا کیا جاسکتا ہے غزالہ! حکم رہی کو تو کوئی نہیں ٹال سکتا اس میں ہمارا تو کوئی قصور نہیں ہے یہ سب تو۔“ تایا جی کہتے کہتے چپ ہو گئے۔ ”اب جتنی گہرائی سے اس مسئلے پر سوچو گی اتنا ہی دشوار ہو جائے گا جینا۔“

”تنی دور چلا جائے گا مون۔ بہنیں تو بھائی کی صورت کو ترس جائیں گی۔“

غزالہ نے چہرہ دھوئے سے رگڑا ”آپ عبیرہ کو لے جائیں یا فضہ کو نمون کو بھائی صاحب کے پاس رہنے دیں۔“

”نہیں۔ میں مون کو ہی لے کر جاؤں گی۔ میں نے زہیر سے بات کر لی تھی۔ انہوں نے بھی یہی کہا تھا اور شارچہ

کون سا دور ہے میں لے آیا کروں گی مون کو ملوانے یہاں۔ مون تو بنا بنایا سکندر بھائی ہے۔ مجھے بھائی کی صورت نظر

آتی رہے گی۔ اسے کسی قسم کی کمی نہیں آئے دنوں کی نہ محبت میں نہ توجہ میں اور نہ ضروریات میں۔“ سفینہ نے اپنی

بات کو باور دلایا۔

”ٹھیک ہے پھر مون کو تم لے جاؤ۔ ایمن کے تو اس سال مل کے ایگزام ہونے والے ہیں ویسے بھی وہ سمجھ دار

ہے وہ میرے پاس رہ لے گی فضہ چھوٹی ہے وہ کھلونوں سے اور اچھی چیزوں سے ہل جائے گی۔ عاکف اسے تم لے

جاؤ۔ اسے بہت پیار و نواہ سکندر کو بہت پیاری تھی اور بہن بھائیوں میں بھی سب سے زیادہ معصوم اور پیاری ہے۔

اسے خوش نما کھلونوں اور کپڑوں سے بہلاؤ گے تو ہل جائے گی۔“

کہتے کہتے تایا جی کی آواز بھیک گئی لاؤنج ٹیبل میں موجود سب لوگ مزید افسردہ ہو گئے اور کھڑکی سے چکی ایمن کو تو بتا بھی

نہیں تھا کہ آنسوؤں کی قطاروں نے اس کی قمیص کا سارا آگرایا بھگودیا ہے۔

”اور عبیرہ کو غزالہ لے جاتی ہے وہ ذرا شوخ اور شرارتی ہے تمہاری بچیوں کے ساتھ مل کر سلجھ جائے گی آگے

جو اللہ کو منظور۔ انسان تو اچھا ہی سوچتا ہے یہ تو آپ کو معلوم ہے ناکیا اچھا ہے یا برا۔ میرا خیال ہے اب تو کسی کو کوئی

اعتراض نہیں ہو گا۔“ انہوں نے سب کی طرف دیکھا۔

”آپ نے خود ہی کہا کہ ایمن سمجھ دار ہے تو میرے خیال میں اس موقع پر اگر اسے سمجھا کر ساتھ بٹھالیا جاتا تو

زیادہ مناسب نہیں تھا۔“ انکل جمال سنجیدگی سے بولے۔

”ایمن سمجھ دار ہے لیکن اب اتنی بھی نہیں۔ تمہیں معلوم ہے جمال وہ اس بات پر پریشان ہو کر بالکل الجھ کر نکلا۔

کھڑا کر دیتی۔ میرا خیال ہے وہ یہ سب کبھی برداشت نہیں کرے گی اب یہ سب کچھ خاموشی سے کرنا ہے خود ہی

آہستہ آہستہ صبر آجائے گا اور زندگی تو خود سب سے بڑا سمجھوتہ ہے۔ ایمن کو میں سمجھاؤں گا اور باقی تو ابھی چھوٹے

ہیں۔ مون اور فضہ تو دوسرے شہروں میں جانے کے خیال ہی سے خوش ہو جائیں گے اب میرا خیال ہے سب کچھ

طے ہے سفینہ تو پرسوں جانے گی اور عاکف کو کل جانا ہے عاکف تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے نا؟“

”نہیں بھائی جان جیسی سارا ویسی فضہ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

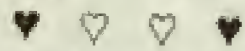
”چلو پھر اب سونا چاہیے کافی رات ہو گئی ہے اور سردی بھی زیادہ ہو گئی ہے انیسہ! تم نے سب کے بستر وغیرہ

لگوا دیے ہیں۔“ وہ مڑکائی جی سے بولے۔

”ہاں وہ تو کافی دیر سے لگوا دیے ہیں اب واقعی کافی ٹائم ہو گیا ہے سردیوں کے دس بھی تو وحی رات کے برابر

ہوتے ہیں میرا خیال ہے اب اٹھتے ہیں۔“

وہ بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئیں تو سب ان کی تقلید میں سست روی سے باہر نکل گئے۔



وہ شام ان کی زندگیوں کی یادگار شام بن گئی اگر اس حسین شام کا اختتام اتنی بھیا نک شکل میں نہ ہوتا تو بھی وہ شام

ان کی یادوں کا ایک خوبصورت حصہ ہوتی جیسی اب تک کی زندگی کا ہر دن اور ہر شام خوبصورت اور یادگار تھی۔

فضہ کی آنکھیں سالگرہ تھی جس کی تیاریاں کتنے دنوں سے جاری تھیں کچھ تو پچھلے ماہ یا پکی پر موشن ہوئی تھی۔

دوسرے ماما نے اسی ماہ سارے گھر میں از سر نو پینٹ کروایا تھا۔ ڈرائنگ روم سمیت سب کمروں کے پردے بدلے

تھے۔ سارے گھر کی سیٹنگ نئے انداز میں کی تھی۔ کاریڈور میں کاریٹ ڈالوایا تھا۔ سارے فرنیچر کو پولش کروایا تھا۔

ٹی وی لاؤنج کافی وی ماما نے اپنے بیڈ روم میں رکھ لیا تھا اور ٹی وی لاؤنج کے لیے نیا خوبصورت چوبیس انچ کافی وی

خریدا تھا۔ چھوٹے سے لان میں بہت خوبصورت پودوں اور پھولوں کے گملوں کا اضافہ ہوا تھا۔ سارے گھر کا جیسے

نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ اس کے ایک ایک انچ سے ماما یا پکی محبت اور اس محبت کی خوشبو منک رہی تھی۔

سالگرہ کے لیے سب بچوں کے کپڑے بھی تو نئے نئے تھے خود ماما نے اپنے لیے رائل بلو گھر کی ساڑھی بنوائی

تھی جس کے بارڈر پر گولڈن کام تھا اور پیانے بھی نیا بلو گھر کا نوپس بنوایا تھا دونوں ہی ان ڈریسز میں بہت اسٹارٹ

اور ہنڈسم لگ رہے تھے۔ ان کا کیل یوں بھی پورے خاندان میں سب سے زیادہ خوش باش اور اسٹارٹ کیل سمجھا

جاتا تھا۔ ان دونوں کے درمیان کبھی معمولی سی لڑائی جھگڑا تو کیا ذرا سی تو تکرار بھی نہیں ہوئی تھی۔ ایک دوسرے کا

احترام ان کی عائلی زندگیوں کا سب سے پہلا اور ٹھوس اصول تھا۔ پایا کہتے تھے۔

”محبت تو ہر میاں بیوی میں قدرتی طور پر ہوتی جاتی ہے اگر باہمی احترام نہ ہو تو یہ محبت بھی پانی کے بلبلے کی طرح

ہوتی ہے جس کا کوئی بھر دسا نہیں ہوتا۔ یہ باہمی احترام ہی دونوں کو ایک دوسرے کے احساسات کا خیال رکھنے پر

مجبور کرتا ہے۔ جس سے محبت بڑھتی ہے۔ اسی لیے وہ ماما کا ان کی ہر بات کا بہت احترام کرتے بہت خیال رکھتے

تھے اگرچہ اس بات کو ان کے اپنے بہن بھائی ستائش کی نظر سے نہ دیکھتے تھے وہ اس بات کو ”زن مریدی“ میں شمار

کرتے تھے مگر پیانے کبھی پروا نہیں کی تھی وہ دونوں ایک دوسرے میں مگن اپنے گھر اور بچوں کے ساتھ بہت

خوشحال اور پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔

انہوں نے یہ گھر بھی بہت سالوں کی محنت سے بنایا تھا جب تایا جی نے انہیں ان کا حصہ دے کر آبائی گھر سے

الگ کیا تھا۔ اس وقت ایمن فقط دو سال کی تھی۔ پیانے اسی پیسے سے پلاٹ خریدا اور خود نو سال تک کرائے کے گھر

میں رہ کر اس پلاٹ پر یہ خوبصورت خوابوں کا محل تعمیر کیا تھا اور اس جدوجہد میں ماما نے بھی ان کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔

انہوں نے کئی سال ایک انگلش میڈیم اسکول میں پڑھایا تھا۔ یوشن بھی کی تھیں۔ گھر میں کئی کئی دن گوشت نہیں

پکاتا تھا۔ بچوں کے بہت اچھے کپڑے نہیں بنتے تھے رشتہ داروں سے ملنا ملنا بھی بہت کم ہو گیا تھا۔ رشتہ داروں

سے میل ملاپ بونسی تو نہیں بڑھایا جاتا۔ لیکن دین رشتہ داری کا پہلا تقاضا ہوتا ہے اور وہ دونوں اس تقاضے کو نبھانے

سے قاصر تھے۔ اس لیے انہوں نے تقریباً ”سب سے کنارہ کر لیا تھا صرف قریبی عزیزوں سے خاص خاص موقعوں

پر ملتے تھے پیانہ بینک میں جاب کرتے تھے اور پھر شام کو ایک پرائیوٹ فرم میں پارٹ ٹائم جاب بھی کرتے تھے آخر

خدا خدا کر کے آٹھ نو سالوں کی طویل اور کٹھن جدوجہد کے بعد ان کا گھر مکمل ہو گیا تھا۔ وہ ادھر شفٹ ہو گئے ادھر

شفٹ ہونے کے بعد بھی گھر میں کافی کام ہوتا رہا تھا۔

اگرچہ مشکل سے مشکل وقت میں بھی ماما پیانے نے ان بچوں میں سے کسی کی سالگرہ نظر انداز نہیں کی تھی خواہ ایک

پونڈ کا کیک خرید کر کیوں نہ اس موقع کو سیلیبریٹ کیا جاتا وہ ان مواقع کا خاص خیال رکھتے تھے اور اب تو قدرت

نے فراغت اور خوشحالی دونوں سے نوازا تھا تو وہ کیوں اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہوئے خوشی نہ مناتے۔
سب کو بلایا تھا پیانے حتیٰ کہ لاہور سے عاکف چچا کو بھی بلایا تھا اور تو اور سفینہ پھوپھو کو تین چار بار فون کر کے
انوائٹ کیا تھا اور غزالہ آئی تو خیر ہر دفعہ ہی آیا کرتی تھیں۔ حیدر آباد کون سا کراچی سے بہت دور تھا اور سب نے
آنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

اور حیرت انگیز طور پر سب نے وعدہ ایفا بھی کیا۔ اس شام واقعی سب ایک مدت بعد اکٹھے ہوئے تھے سب سے
بڑھ کر سفینہ پھوپھو آئی تھیں۔ عاکف چچا جو پورے خاندان میں مشہور تھے کہ وہ اپنی بیوی کی اجازت کے بغیر شہر نہ گیا
گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے۔ وہ بھی لاہور سے کراچی آگئے سب تیاریاں مکمل تھیں۔ پیانے شہر کے بہترین
ہوٹل کا ٹک باڑ کیا تھا اس کے علاوہ گھر کے دونوں ملازم بھی تھے کچن کا کام تو شام سے پہلے ہی مکمل ہو گیا تھا۔ مہمان
آنا شروع ہو چکے تھے۔ ایمین اور عبیدہ کب سے تیار ہو کر مون کو بھی تیار کر کے اپنے ساتھ لیے پھر رہی تھیں۔
صرف فضلہ کے ہی خرے پورے نہ ہو رہے تھے۔ ماما کب سے اسے تیار کرنے میں لگی ہوئی تھیں جب ماما نے اس
کے گولڈن بالوں میں آخری بار برش پھیرتے ہوئے اسے جوتے پہن کر تختی سے باہر آنے کا کہا تو اس نے ایک دم
سے شور مچا دیا کہ گولڈن جوتی اسے ٹائٹ ہے اس کے پاؤں کو کاٹ رہی ہے ماما نے جھک کر اس کے جوتے کا جائزہ لیا
جوتی واقعی اسے تنگ تھی پاؤں اس میں بری طرح سے گھٹا ہوا تھا اس صورتحال پر انہیں غصہ بھی آیا اور پریشانی بھی
ہوئی کہ سب مہمان آرہے ہیں اور اب عین وقت پر۔

”تمہیں پہلے کہا تھا میں نے اچھی طرح سے پہن کر چیک کر لوں گا اسے لوز تو نہیں ہے۔ تم نے ہی کہا تھا کہ ٹھیک
ہے۔ اب نئی مصیبت کھڑی کر رہی ہو۔“ ماما نے جھنجھلا کر اسے ڈانٹا۔

”تو اس روز آپ نے کون سا ساکس کے ساتھ پہنا کر دیکھی تھی اس کے بغیر تو ٹھیک تھی اب۔۔۔!“ وہ اپنی
گولڈن براؤن آنکھوں میں فوراً ”آنسو بھر لائی۔ گولڈن جھلمل کرتے فراک میں وہ اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ ماما کو
غصے کے باوجود اس پر پیار آگیا۔

”اچھا اب فضول میں روؤ نہیں۔ سارا منہ خراب ہو جائے گا۔ میں تمہارے پیانے سے بات کرتی ہوں اتنا
جوتے۔“ انہوں نے اسٹیپ کھولتے ہوئے ذرا پیار سے کہا۔

پھر پیانے کتنی مشکل سے راضی ہوئے طارق روڈ جانے کے لیے (کاش وہ نہ مانتے) انہیں بھی بہت غصہ آیا تھا کہ
عین وقت پر اس طرح بازار جانا اچھا نہیں لگتا، لیکن پھر فضلہ کے آنسو اور ماما کی منت نے انہیں مجبور کر دیا۔ دونوں
مہمانوں سے معذرت کرتے ہوئے تھوڑی دیر کا کہہ کر گاڑی میں جا بیٹھے اگرچہ ایمین نے اس وقت ضد کی کہ وہ بھی
ساتھ جائے گی مگر ماما نے اسے ڈانٹ دیا۔

”تم بڑی ہو تمہیں خیال کرنا چاہیے۔ چھوٹے بچوں کی طرح ضد کر رہی ہو اگر تم بھی ساتھ چل پڑیں تو گھر کا اور
چھوٹے بہن بھائی کا کون خیال کرے گا اور تمہارے جانے سے یہ بھی ضد کریں گے جانے کی ہم ابھی آرہے ہیں تم
فون کا خیال رکھو اور دیکھنا فضلہ کہیں ننگے پاؤں باہر نہ آجائے سارے ساکس خراب کر لے گی۔ چلو اب اندر۔“ تو وہ
منہ بسورتی ہوئی اندر کی طرف چلی گئی۔

انہیں کیا معلوم تھا کہ وہ تھوڑی دیر اب کبھی نہیں آئے گی۔ ان کا وہ خوبصورت سجا سجا یا روپ ہمیشہ کے لیے اس
کی نظروں میں جامد ہو کر رہ جائے گا۔ بلو ساڑھی میں ان کا چمکتا دکھتا چہرہ اور صراحی دار گردن میں پڑا خوبصورت
نیکلس اسے کبھی نہیں بھولے گا اور پیانے؟

پایا کو تو وہ کبھی بھی نہیں بھلا سکے کی جب ماما کے ڈانٹنے پر انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگا کر چکارا تھا۔
 ”ایمی جان! ہم ابھی آرہے ہیں بس آدھے گھنٹے میں“ آپ اندر جاؤ۔“

اور پایا نے تو اس سے کبھی ذرا سا بھی جھوٹ نہیں بولا تھا پھر اب اتنا بڑا جھوٹ کیسے بول گئے۔ آدھے گھنٹے کا کہہ کر وہ ساری زندگی کو انتظار بنا گئے۔ پھر جب دو تین گھنٹے گزر گئے اور وہ دونوں نہ لوٹے مہمان انتظار کر کر کے تھک گئے آخر تایا جی نے ابرار بھائی کو موٹر بائیک پر بھیجا کہ جا کر ان کا پتا کرے۔ ابرار بھائی کو بھی گئے گھنٹہ گزر گیا سب کو بے چینی ہونے لگی۔ فضا اپنی جوتی کو رو دھو کر چپ ہو گئی۔ مون نے ماما کے لیے رونا شروع کر دیا۔ خاندان کے لوگوں کے علاوہ باقی لوگوں نے جانا شروع کر دیا وہ بھی اپنی جگہ جمع تھے۔

رات کے نو بج رہے تھے جبکہ سالگرہ کا ٹائم پانچ بجے کا تھا، مہمان آہستہ آہستہ جانا شروع ہو گئے گھر میں بہت سے لوگوں کے ہوتے ہوئے بھی عجیب سا سناٹا پھیل رہا تھا مون کو تو اس نے بہلا پھسلا کر سلا دیا تھا۔ فضا بھی فینڈ میں ہو چکی تھی۔ سالگرہ کی خوشی میں وہ صحیح بچے کی اٹھی ہوئی تھی۔ ماما کے ساتھ نماز پڑھنے۔ اس کی ساری خوشی ہوا ہو گئی تھی وہ اب باقاعدہ ماما پایا سے روٹھ گئی تھی اور وہ خود بھی تو دل ہی دل میں ان سے خفا ہو گئی تھی جو آدھے گھنٹے کا جھوٹا وعدہ کر کے گئے تھے۔

سفینہ پھوپھو اور عاکف بچا کا غصہ اب پریشانی میں بدل چکا تھا سو اس بچے کا ٹائم تھا جب اچانک لائٹ چلی گئی۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ فضا تو اونچا اونچا روٹھنے لگی۔

”مجھے ماما کے پاس جانا ہے۔“ ایمن نے اسے ڈانٹ کر اپنے ساتھ لگا لیا کہ ”ماما ابھی آنے والی ہیں“ عین اسی وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی سنانے میں اس کی آواز کسی بھیانک چیخ کی طرح سنائی دی تھی پتا نہیں کون اندھیرے میں ٹوٹا ہوا فون تک پہنچا تھا۔ فون کے دوسری طرف کون تھا۔ یہ تو اسے پتا نہ چل سکا ہاں چند لمحوں بعد تایا جی کا چہرہ ہوا۔

”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔“

اسے دہلایا گیا۔ اندھیرے میں جب وہ ریپورر رکھ کر ملنے تو اسے پہلی بار لائٹ پر اس قدر غصہ آیا تھا وہ تایا جی کا چہرہ دیکھنا چاہتی تھی مگر اندھیرے میں تو کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

عین اسی وقت لائٹ آگئی اور کاش وہ کبھی نہ آئی ہوتی بلکہ اب اس کا آنا یا نہ آنا ایک برابر تھا۔ تایا جی کے سوتے ہوئے چہرے کا جیسے کسی نے لہو نچوڑ لیا تھا اور ان کا وجود ہولے ہولے کپکپا رہا تھا۔

”بہت بڑا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ سکندر کی گاڑی کا لوکل بس سے۔ ہاسپٹل جا کر ان دونوں نے چند سانسیں بھی نہیں لیں اور۔“ ان کی آواز کسی گڑھے میں سے آرہی تھی۔ کہتے کہتے وہ ہچکیوں سے رونے لگے۔

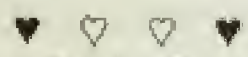
تائی جی نے ”ہائے میرے اللہ“ کہہ کر سینے پر دو ہتھ مارے تھے اور سفینہ پھوپھو ”نہیں بھائی جان ایسے نہیں ہو سکتا۔ نہیں نہیں۔“ وہ چیخنے لگی تھیں اور غزالہ آنٹی یا گلوں کی طرح ایک ایک کی شکل دیکھ رہی تھیں۔

اور ایمن نے فضا کو اتنی زور سے اپنے ساتھ چھینا تھا کہ اس کی چیخ نکل گئی جس کی آواز سے مون کو سلائی، عبیدہ بھاگ کر باہر آگئی تھی پھوپھو اور تائی جی تو اب باقاعدہ رو رہی تھیں۔ عبیدہ کے قدم جیسے زمین میں گڑ گئے تھے۔ وہ کچھ نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ ایمن سب کچھ سمجھنے سے قاصر تھی وہ تو پھر اس سے دو سال چھوٹی تھی۔

”عبیدہ میری بچی! تمہارے پاپا ماما چلے گئے تمہیں چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے۔ میری بچی ادھر آ۔ دیکھ کیا ظلم ہو گیا تمہارے ساتھ۔“ تائی کی دردناک پکار نے اسے جیسے سب کچھ سمجھا دیا۔

”وہ نہیں نہیں“ کہہ کر ایمن کی طرف بڑھی۔

”ایمی! ایمی! ماما پایا کہیں نہیں جاسکتے ہمیں چھوڑ کر۔ ایمی! ماما! ماما!“ وہ پتھری ایمن کے گلے سے جھول گئی وہ تو پہلے ہی فضا کے سہارے گھڑی تھی تینوں دھڑام سے نیچے گر گئیں۔ عاکف بچا اور جمال انکل انہیں اٹھانے آگے بڑھے ایمن بے ہوش ہو چکی تھی۔



اور ہوش میں آنے کے بعد اس کے دل نے پارا تمنا کی کہ کاش وہ ہوش میں کبھی نہ آئی ہوتی اور اگر آئی بھی تھی تو اسے ارد گرد کی کچھ خبر نہ ہوتی اور اگر خبر بھی ہوتی تو اس میں کم از کم وہ دل خراش منظر نہ ہوتا جس کو اس کی آنکھیں شاید تا عمر نہ بھول پائیں گی۔ اس کے سچے سنورے پایا اور ماما سفید بے دماغ کفنوں اور پٹیوں میں جکڑے ان کی طرف سے آنکھیں بند کیے پہلو پہ پہلو لیٹے تھے۔ ماما کی پانچ ہزار کی وہ قیمتی ساڑھی ان ہی کے لمبو میں رنگی کتنے دن اسٹور میں بڑی رہی اور پایا کا خون میں ڈوبا ٹوپی جسے اس نے تائی جی کو ان کے ڈرائیور کو دیتے دیکھا تھا تو کمرے میں آکر اسے اپنی پیچوں پر قابو نہ رہا تھا اور ان کے پہلو پہ پہلو اس طرح بے خبر بے نیاز لیٹے دیکھنے کا منظر تو فقط چند لمحے ہی اس کی بینائی کے سامنے رہا تھا کہ وہ پھر بے ہوش ہو چکی تھی اور جب دوبارہ اسے ہوش آیا تو گھر کے مالکان گھر خالی دیران کر کے ہمیشہ کے لیے خاک میں ملانے چلے گئے تھے۔ وہ تو انہیں آخری بار جاتے ہوئے بھی نہ دیکھ سکی تھی اور آنسو تو جیسے کہیں آنکھوں کے پیچھے ہی جم کر رہ گئے تھے۔

مون اور فضا تو بے تحاشا رو رہے تھے۔ ان کی ماما پایا کی پکار تو پتھروں کو بھی رلا رہی تھی۔ عبیدہ البتہ اس کی طرح ہم صم تھی دونوں بڑی اور باشعور ہونے کی سزا جھیل رہی تھیں اور وہ دونوں بے شعور ہونے کی وجہ سے رو رو کر اپنے ساتھ ہونے والے اتنے بڑے نقصان کا اعلان کر رہے تھے۔ سب لوگ ان دونوں کو ہی بہلانے میں لگے ہوئے تھے۔ مون تو مستقل سفینہ پھوپھو کے پاس تھا اور فضا کبھی تائی جی کی گود میں ہوتی اور کبھی غزالہ آنٹی کے پاس اور ایمن کا دل چاہ رہا تھا کہ یہ سب لوگ چلے جائیں۔ ہر طرف خاموشی ہو جائے۔ سکون جیسا پہلے ہوتا تھا پھر ماما اور پایا بھی آجائیں گے۔ وہ دونوں تو شور شراب سے بہت بھاگتے تھے اسی لیے تو وہ دونوں آئیں رہے تھے۔ اسے ابھی بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ دونوں ہمیشہ کے لیے جا چکے ہیں جب سے ہوش سنبھالا تھا یہ تو اسے پتا ہی تھا کہ جو ایک بار مر جاتا ہے۔ اس دنیا سے چلا جاتا ہے وہ پھر دوبارہ نہیں آسکتا زمین آسمان ایک ہو سکتے ہیں مگر مرنے والا نہیں لوٹ سکتا لیکن اسے اب اسی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کے والدین دوبارہ نہیں آسکتے۔

ماما کہتی تھیں کہ اللہ سب سے زیادہ بچوں کی دعائیں قبول کرتا ہے اس نے دل میں طے کر لیا تھا کہ جب سب لوگ چلے جائیں گے تو وہ چاروں۔ بسن بھائی مل کر خوب زور زور سے رو کر اللہ سے دعا کریں گے تو اللہ ضرور ماما اور پایا کو واپس بھیج دیں گے۔ اس خیال سے جیسے اس کا دل اندر سے مطمئن ہو گیا اور رات کو جب عبیدہ اس کے ساتھ لٹ کر بہت رونے لگی تو اس نے آہستہ سے یہ راز کی بات اسے بھی بتائی۔

”عبیدہ! سب لوگوں کو جانے دو، پھر ہم اللہ میاں سے خود ہی ماما اور پایا کو مانگ لیں گے اللہ میاں ہماری بات ضرور مانیں گے۔“ تو روٹی روٹی عبیدہ ایک دم سے چپ ہو گئی اس کی بات پر جیسے غور کرنے لگی۔

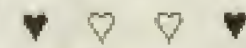
”نہیں ایمی! ایسے نہیں ہو سکتا۔ مرے ہوئے لوگ اس دنیا میں واپس نہیں آسکتے۔“ اس نے زور سے نفی میں کہلایا۔

”جی نہیں آسکتے ہیں اللہ میاں سب سے زیادہ بچوں کی دعا قبول کرتے ہیں اگر ہم اللہ میاں پر زور دیں گے تو وہ ضرور ہماری بات مان لیں گے۔“ اگرچہ اسے خود بھی اپنی بات کے بودے پن کا احساس تھا مگر پھر بھی وہ اسے عبیدہ

سے منوانا چاہ رہی تھی۔

”نہیں اکی! ایسے نہیں ہو سکتا۔ تمہیں یاد نہیں ماما! جو ہمیں حدیث سنایا کرتی تھیں کہ جب شہدائے بدر کو جنت میں اعلا مقامات اور درجات پر پہنچا دیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے شہداء سے کسی اور خواہش کی فرمائش کرنے کو کہا تو انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کچھ اور ہمیں اللہ تعالیٰ نے اصرار کیا انہوں نے پھر انکار کیا جب اصرار زیادہ برہا تو انہوں نے کہا کہ اللہ میاں ہمیں ایک بار پھر دنیا میں بھیج دیں ہم پھر جا کر کفار سے لڑیں اور شہید ہو کر آئیں تو اس فرمائش پر اللہ تعالیٰ نے خاموشی اختیار کر لی تھی کہ جو ایک بار اس دنیا سے چلا گیا وہ دوبارہ نہیں آسکتا۔“

عبیدہ کی بات اس قدر جان دار تھی اور یہ بات تو مانا نے ان کے سامنے کہی تھی وہ اکثر انہیں احادیث کی روشنی میں اچھی اچھی باتیں بتایا کرتی تھیں اور وہ یہ بات بھول گئی تھی۔ عبیدہ کو یاد تھی وہ اسے کیسے جھٹلا سکتی تھی اس نے بے بسی سے سر اٹھا کر عبیدہ کو دیکھا آنسو اس کے گالوں پر اٹکے ہوئے تھے ایمین کو دوسری بار لگا کہ اس کے ماں باپ واقعی ہمیشہ کے لیے ان سے روٹھ چکے ہیں اور اب کوئی مناجات کوئی اسم اعظم انہیں واپس نہیں لاسکتا۔ دعا کی آخری آس بھی ٹوٹ گئی۔ وہ ایک دم سے بے قابو ہو کر عبیدہ کے گلے لگ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔



پھر دوسری بار وہ اس روز روئی جب تائی جی نے ان چاروں کے کپڑے اور چھوٹی موٹی ضرورت کی چیزیں سمیٹ کر انہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہا۔ عبیدہ اور ایمین دونوں جانا نہیں چاہ رہی تھیں۔ مگر ان کی ضد کی اب کسے روک تھامی ان کے لاڈ اٹھانے والے اور ان کی ذرا ذرا سی ضد کی پروا کرنے والے تو پوند خاک بن چکے تھے۔ تائی جی کا آفس ان کے گھر سے دور پڑتا تھا پھر تائی جی کو دنیا میں صرف اپنے گھر سے پار تھا۔ پتا نہیں وہ اتنے دن گھر سے دور کیسے رہی تھیں۔ عاکف چچا تو قتل کرنے کے اگلے روز ہی چلے گئے تھے۔ ان کی فیکٹری اور بیوی ان کی اتنی لمبی غیر حاضری کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں۔ غزالہ آنٹی اور انکل جمال کو بھی اپنے اسکول سے اتنی لمبی چھٹی نہیں مل سکتی تھی۔ غزالہ آنٹی ایک ہفتے بعد ہی چلی گئیں۔ سفینہ پھوپھو البتہ ان کی وجہ سے رک گئی تھیں اور پھر ڈیڑھ ہفتے بعد ہی آیا جی ان سب کو اپنے گھر لے آئے گاڑی تو ایک سیمنڈنٹ میں ہی چکنا چور ہو گئی تھی اور دھانچہ تائی جی نے اونے پونے بیچ دیا تھا۔ ان کے گھر کو تالا لگا دیا گیا تھا۔

عبیدہ تو چل چل کر رو رہی تھی کہ وہ گھر چھوڑ کر نہیں جائے گی۔

”ماما! پاپا آجائیں گے“ آپ لوگ چلے جائیں ہم نہیں جائیں گے۔“ وہ روتے روتے بے ہوش ہو گئی تھی ابراہ بھائی نے اسی طرح اسے اٹھا کر گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھی تائی جی کی گود میں ڈال دیا تھا۔ ایمین کے رونے پر تائی جی نے اسے بڑی طرح سے جھڑک کر ایک پھیڑ لگا دیا تھا۔

”ایمین! تم بھی نہیں ہو سمجھ دار ہو خبردار جواب روئیں تو۔ فضول میں داغ خراب کر دیا ہے چپ کر کے گاڑی میں بیٹھو ورنہ تم کو ہمیں چھوڑ جاؤں گا پھر اکیلی بیٹھی روو گی۔“

اس کے تواتر سے بتے آنسو ہیں ختم گئے تھے۔ ہاں اندر بہت کچھ ترخ گیا تھا۔ مستقبل کی دھندلی سی تصویر واضح ہونے لگی تھی۔ جوں جوں گاڑی گھر سے دور ہو رہی تھی وہ روتوں کے تانے بانے جوڑ کر اپنا اور بہن بھائیوں کے مقام کا تعین کرنے کی کوشش کر رہی تھی اس نے پلٹ کر نہ تو ہوش میں آتی عبیدہ کو دیکھنے کی کوشش کی اور نہ پھوپھو کی گود میں بخار میں جھکتے مولیٰ پر ایک نگاہ ڈالی وہ بس کھڑکی سے باہر بھاگتے دوڑتے منظر میں گم تھی۔

تائی جی کے گھر آئے ہی جیسے سب لوگ بے تحاشا مصروف ہو گئے تھے۔ تائی جی صبح کے نکلے شام گئے پلٹتے تھے اور اگر بھی انہیں کم از کم ان چاروں میں سے کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا اگر دیکھ بھی لیتے تو قصداً ”بے نیاز سے“ بن جاتے۔

شاید ان کا وجود بھی انہوں نے گھر کی دیواروں یا ساز و سامان کی طرح تصور کر لیا تھا جو وجود تو رکھتے ہیں مگر ہر وقت نظروں کے سامنے ہونے کی وجہ سے روئین کا حصہ لگتے ہیں۔ بے وقعت اور بے مصرف۔ تائی جی کا گھر ان کے گھر جتنا ہی بڑا تھا مگر رائے فیشن کا بنا ہوا تھا۔ بہت اونچی اونچی چھتیں اور بڑے بڑے کمرے اور تائی جی تو آتے ہی اپنی راجدھانی کی صفائی ستھرائی میں لگ گئی تھیں۔ باقی ہر چیز ہر موضوع ان کے لیے بے معنی تھا اور سفینہ پھوپھو وہ دن بعد ہی اپنے سسرال والوں سے ملنے راولپنڈی چلی گئی تھیں۔ مولیٰ کا بخار نہیں اتر رہا تھا۔ پہلے دن ہی ڈاکٹر کو دکھایا تھا۔ اس کے بعد ایمین اور عبیدہ کے کہنے کے باوجود کسی کو ٹائم ہی نہیں مل سکا تھا۔ اسے دوبارہ ڈاکٹر کو دکھانے کا۔

مولیٰ بہت کمزور ہو گیا تھا اور بے حد چڑچڑاہی۔ ہر وقت اس کا بدن بخار کی حدت سے تھپتا رہتا تھا اس کا کھانا پینا نہ ہونے کے برابر ہو گیا تھا، ہر بات میں ضد کرتا تھا جب بھی ذرا اس کی طبیعت بدتر ہوتی وہ ”ماما ماما“ پکارنا شروع کر دیتا اسے سنبھالتے سنبھالتے ایمین اور عبیدہ بکھر بکھر جاتیں۔ فضا تو ویسے ہی گم صم ہو کر رہ گئی تھی۔

تائی جی اب ایمین سے کہہ رہے تھے کہ وہ اسکول جانا شروع کرے اتنی لمبی چھٹی کرنا ٹھیک نہیں اس کی کلاس سینئر ہے۔ عبیدہ اور فضا کو تو انہوں نے ایک دفعہ بھی نہ کہا اسکول جانے کو۔

”ان کو کیوں نہیں کہتے یہ بھی اسکول جائیں اب۔“ ان کے دن رات کے اصرار پر وہ بھی چمک کر بولی۔

”تمہاری کلاس بڑی ہے نا اس لیے۔“ اس کے اعتراض پر انہوں نے اسے سمجھایا مگر اس نے ان کی بات نہ مانی نہ پیار سے نہ غصے سے۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل غصہ تھا کہ کچھ ہونے والا ہے وہ ہو چکے تو پھر وہ کچھ کرے گی۔

ابراہ بھائی تو بہت اچھے تھے۔ ان چاروں کا خیال بھی رکھتے تھے۔ کالج اور کرکٹ کی مصروف روئین میں سے وقت نکال کر ان کی دل جوئی کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن ولید بہت بے حس اور ظالم تھا۔ وہ آتے جاتے ان چاروں کو خوب تنگ کرتا تھا۔ کبھی کہتا۔

”امی ابو مظلوموں کا چوکڑا پتا نہیں کہاں سے اٹھا لائے ہیں بھلا شرم میں اتنے یتیم خانے بھی تو ہیں وہاں چھوڑ آتے۔ لا کر یہ مظلوم صورتیں ہمارے اوپر طاری کر دیں ہر وقت کارونا دھونا۔“ اسے ولید سے نفرت ہو چکی تھی۔

”نہ تمہارے پاپا ماما کو ہم نے مارا ہے جو ہر وقت یہ محسوس پھیلائے رکھتے ہو تم لوگ۔“ ان میں سے کوئی بھی روٹا تو وہ دھاڑنے لگتا۔ اگرچہ تائی جی اسے ڈانٹتے تھے لیکن تائی جی اس کی اتنی بکواس پر بھی اسے کچھ نہیں کہتی تھیں۔ وہ ان کا بہت لاڈلا تھا اور پھر لاڈلوں کو کون کچھ کہتا ہے۔

ان کے پاپا ماما نے انہیں کبھی کچھ کہا تھا جو تائی جی ولید کو کچھ کہتیں، لیکن انہوں نے کبھی اس طرح کسی کی دل آزاری بھی تو نہیں کی تھی۔

وہ دل ہی دل میں دعا مانگتی کہ تائی جی انہیں ان کے گھر چھوڑ آئیں پھر اسے ولید سے بھی کوئی شکایت نہیں رہے گی۔ بھلے ماما پاپا بھی نہ آئیں لیکن وہ اپنے گھر چلے جائیں۔

مگر ایسا کوئی اشارہ انہیں سے نہیں مل رہا تھا کہ ان لوگوں کا ارادہ انہیں واپس بھیجنے کا ہے۔ پھوپھو پوند وہ دن بعد واپس آئیں اور آج ہونے والی بات ہو بھی گئی۔ ان کی تقدیروں کا فیصلہ انہیں بتائے بغیر کر دیا گیا تھا اس طرح سے انہیں تتر بتر کر کے۔

”نہیں نہیں میں کبھی ایسے نہیں ہونے دوں گی پھوپھو کو اگر بیٹے کی ضرورت ہے تو اللہ میاں سے مانگیں۔ ہمارا مولیٰ کوئی فالتو تو نہیں ہے میں کبھی بھی اسے اپنے سے دور نہیں کروں گی۔ وہ تو بالکل پایا جیسا ہے ان کے جیسی آنکھیں ان کے جیسے بال۔ نہیں کبھی نہیں۔“

اور فضا کو اتنی دور صبح دوں۔ لاہور بھی نہیں۔ عاکف بچانے تو کبھی ہمیں جھوٹے سے بھی پیار نہیں کیا تو کیا فضا کا خیال رکھیں گے اور وہ تو اتنی بزدل اور ڈرپوک ہے کہ رات کو سوتے میں بھی اتنی دفعہ ڈرتی تھی کہ ماما بایا اسے اپنے ساتھ سلاتے تھے وہ اکیلی کیسے رہے گی اور عبیدہ غزالہ آنٹی کے گھر کبھی نہیں۔ جہاں ہر وقت ہلا گا ہوتا رہتا ہے اور غزالہ آنٹی کی پانچ بیٹیوں میں عبیدہ کی بھلا کیا گنجائش۔ اسے تو ذرا سی بھی توجہ نہیں ملے گی اور ان کے گھر تو کھانا بھی ایک وقت پلتا ہے اور تین ٹائم چلتا ہے اور ہر وقت ہر ڈش میں ڈچ قوم کی طرح اکو پکتے ہیں اور عبیدہ کو آکو کتنے ناپسند ہیں وہ کسی کھانے میں بھی آلو نہیں کھاتی سپا اس کے لیے علیحدہ ماما سے کہہ کر کچھ نہ کچھ بنواتے تھے اور غزالہ آنٹی کا گھر کس قدر چھوٹا ہے صرف دو کمرے۔ ایک میں ان کی پانچ بیٹیاں سوتی ہیں عبیدہ اتنے Congested ماحول میں کیسے رہے گی۔ اسے تو گرمی بھی بہت لگتی ہے اور غزالہ آنٹی کے گھر تو اسے سی بھی نہیں ہے اور شام کو جب سارے محلے کے بچے ان کے گھر بیٹھن بڑھنے آتے ہیں تو کتنا شور ہوتا ہے ہر طرف آوازیں ہی آوازیں۔ غزالہ آنٹی عبیدہ کو اپنے سرکاری اسکول میں داخل کرادیں گی۔ نہیں کبھی نہیں۔

اور میں اور حرہ جاؤں تایا جی گے گھر کبھی نہیں۔ تایا جی اتنے سخت ہیں غصیلے اور نجوس اور تائی جی ان سے دو گنی کنبوس اور جھگڑالو۔ بچوں کے ساتھ ٹاپ کر تو وہ دودھ دیتی ہیں ہمیں اور مجھے تو دودھ کے بغیر ساری رات نیند نہیں آتی۔ پھر مجھے تایا جی سے بھی بہت ڈر لگتا ہے وہ بولتے بھی ہیں تو یوں لگتا ہے ابھی مارنے لگیں گے ان کی آواز اتنی گرج دار ہے اور خوفناک بھی۔ پھر سب سے بڑھ کر یہاں وہ ولید کا بچہ ہے۔ جو اتنا بد تمیز ہے کہ اسے بات کرنے کی بھی تمیز نہیں جب وہ ہمیں منجوس کھتا ہے تو میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس کا منہ نوچ لوں۔

میں یہاں کبھی نہیں رہوں گی چاہے کچھ ہو جائے۔ یہ کوئی ہمیں زبردستی تو نہیں رکھ سکتے۔ ہمارا گھر ہے ہم وہاں اٹھنے بھی رہ سکتے ہیں اور کھانے پینے کا انتظام پاپا کے بینک میں موجود پیسوں سے ہو سکتا ہے۔ دو چار سالوں کی بات ہے پھر میں کہیں جاب کر لوں گی پھر مون بھی تو بڑا ہو جائے گا۔ جن کے ماں باپ مرنے لگے ہیں کیا انہیں اس طرح رشتہ داروں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے کبھی نہیں۔ ہم چاروں اکٹھے رہیں گے اپنے گھر میں چاہے کچھ ہو جائے۔ ایک بار اگر ہم یہاں سے نکل جائیں پھر یہ لوگ ہمیں زبردستی تو نہیں لاسکتے۔ ٹھیک ہے مجھے ہمت کرنی ہوگی۔ ماما نے کہا تھا کہ تم بڑی ہو تمہیں سب بہن بھائیوں کا اور گھر کا خیال رکھنا چاہیے ہاں مجھے یاد ہے ماما نے جاتے جاتے یہی کہا تھا اور میں یہی کروں گی میں اپنے بہن بھائیوں کو بکھرے نہیں دوں گی کبھی نہیں۔

وہ ایک عزم لیے سوچ کر کھڑکی سے ہٹ گئی اپنا چہرہ اس نے قمیص کی آستینوں سے رگڑ کر صاف کیا۔ "مجھے عبیدہ سے بات کرنی چاہیے۔ آج کی رات تو ہے بس۔ صبح تو عاکف پچا فضا کو لے جائیں گے اور غزالہ آنٹی عبیدہ کو۔ بس جو کچھ کرنا ہے آج ہی کرنا ہے ابھی۔ وہ سوئی ہوئی عبیدہ کی طرف بڑھی۔



پہلے تو عبیدہ کو نیند کی وجہ سے اس کی باتیں سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ "مجھے عاکف بچا لے جائیں گے جی نہیں میں ان کے ساتھ نہیں جاؤں گی ان کی مسز اتنی فضول ہیں اور عاکف بچانے تو کبھی مجھے اتنا سا بھی پیار نہیں کیا میں تو نہیں جاؤں گی ان کے ساتھ۔" وہ گرمی نیند کے اٹھنے کی وجہ سے سرخ آنکھوں کے ساتھ ذرا غصے سے بولی۔

"بے وقوف! عاکف بچا تمہیں نہیں فضا کو لے کر جائیں گے تمہیں تو غزالہ آنٹی لے کر جائیں گی حیدر آباد۔"

غزالہ آنٹی اتوبہ کر دی۔ "اس نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "وہ تو اتنی غریب ہیں ہر وقت آلوں کاتی ہیں۔ وہ مجھے آلو کھا کر ماریں گی اور تمہیں پتا ہے مجھے آلو کھاتے ہی اتنی آجاتی ہے میں تو نہیں جاؤں گی اور ان کی وہ ایک نہ دو

انھی پانچ بیٹیاں اتوبہ کرو اور سب کی سب ایک ڈربے میں بند۔" وہ اب ذرا ہوشیار ہو بیٹھی تھی۔ "اور پتا ہے مون کو پھوپھو لے جائیں گی اتنی دور۔ شارچہ۔" اس نے "آتی" کو کھینچ کر خوب لہا کیا "پھر ہم اسے کیسے دیکھیں گے ہیں نا۔" اس کی آنکھیں اس سوچ پر ہی بھر آئیں۔

"کیوں ہماری کوئی سیل لگی ہے جو کوئی بھی آکر ہمیں لے جائے۔" عبیدہ چمک کر بولی۔

"میں پھوپھو کو بھی سیدھا کر سکتی ہوں۔ ہمارا بھائی کوئی فالٹو ہے میں تو اسے کبھی نہیں جانے دوں گی۔" اس نے ڈپ کر سوتے ہوئے مون کا ہاتھ چوم لیا۔

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے ورنہ یہ لوگ ہمارے ساتھ زبردستی کریں گے پھوپھو رسول صبح چلی جائیں گی اور عاکف پچا صبح ہی فضا کو لے جائیں گے وہ تو اتنی ڈرپوک ہے کچھ کہے گی نہیں بس رورو کر مرجائے گی۔" ایمین کا بس نہیں چل رہا تھا کہ تینوں بہن بھائیوں کو سلیمانی ٹوپی پہنا کر غائب کر دیتی۔

"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو اگر ہم اپنے گھر چلے جائیں تو یہ لوگ زبردستی تو نہیں کر سکیں گے سپا کے بینک میں اتنے سارے پیسے ہیں ہم گزار کر لیں گے اگر ان لوگوں نے زبردستی کی تو ہم سپا کے دوستوں سے کہیں گے انکل آصف اور انکل وحید تو روز آتے ہیں ہم سے ملنے۔" عبیدہ نے بھی اسے حوصلہ دیا۔

"تو چلو پھر فضا اور مون کو اٹھاؤ ہم ابھی چلے جاتے ہیں۔" ایمین فوراً بولی۔

"ابھی۔" عبیدہ کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں اس نے پلٹ کر وال کلاک کی طرف دیکھا جہاں گیارہ بج رہے تھے۔

"ایمی! بہت رات ہو گئی ہے اور اب تو سردی بھی اتنی زیادہ ہے ہم کیسے جائیں گے گھر بھی تو اتنا دور ہے یہاں سے بس کا کرایہ بھی تو نہیں ہے ہمارے پاس۔ پھر راستے میں کوئی ہمیں پکڑ نہ لے۔ مون کو تو ابھی بھی بخار ہے اسے ہم کیسے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔" اس نے ڈر ڈر کر سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ دیا۔

"کرایہ تو میرے پاس ہے مجھے ابراہیم بھائی نے مون کو چاکلیٹ لینے کے لیے دیے تھے۔ وہ میرے پاس ہیں اور رات تو یہاں لگ رہی ہے سڑکوں پر تو خوب رونق ہوتی ہے اور ہمیں بھلا کوئی کیسے اغوا کر سکتا ہے ہم چار ہیں تم از کم تین بندے تو ہونے چاہئیں ہمیں اغوا کرنے کے لیے۔ تم فضول میں نہ ڈراؤ۔ بس آج ہی کی رات سے کل ہم کچھ بھی نہیں کر سکیں گے یہاں سے نکلنے کا ہے مون کو میں خود سنبھال لوں گی۔" ایمین پوری طرح ٹھان کر بیٹھی ہوئی تھی کہ کچھ لو تمہیں پتا ہے نا تایا جی کو کتنا غصہ آتا ہے اگر پکڑے گئے تو وہ پٹائی کر دیں گے اب تو پاپا بھی نہیں ہیں بھانے والے۔ پھر ہر اس قدر اندھیرا ہے اور میں گیٹ پر تو تالا لگا ہوتا ہے رات کو۔" عبیدہ نہیں مان رہی تھی۔

"مجھے تو ڈر لگ رہا ہے اتنا اندھیرا ہے اور سردی بھی۔" وہ کانپ کر بولی۔

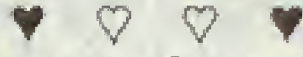
"بس بونہی فضول میں ڈرتی رہنا یہ ہمیں اوہر اوہر کر دیں گے پھر نہ رونا۔" ایمین ذرا غصے سے بولی۔ "ہم صحن والے بجھلے دروازے سے نکلیں گے اوہر سے اسٹاپ بھی نزدیک ہے اور اوہر تو تالا بھی نہیں ہوتا۔ بس تم فضا اور مون کو اٹھاؤ ان کو گرم کپڑے پہنا دو پھر چلتے ہیں میں نے کہہ دیا ہے کہ بس ابھی چلنا ہے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ مالک ہے ہمیں صرف اسی سے ڈرنا چاہیے۔ بندوں سے نہیں یہ ماما کہتی تھیں نایا ہے نا تمہیں۔" اس نے اسے یاد دلایا۔ "اور ہم کوئی گناہ تو نہیں کر رہے آٹھ ہی تو رہنا چاہ رہے ہیں اور وہ بھی اپنے گھر میں۔ پھر ڈر کس بات کا۔ تم بس اٹھو جلدی کرو۔"

وہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور الماری سے فضا اور مون کے گرم کپڑے نکالنے لگی۔ عبیدہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی

پھر مڑ کر بے خبر سوئے مون اور فضلہ کو اٹھانے لگی۔ دونوں ہی گہری نیند سوئے ہوئے تھے اس کے ہلانے پر ذرا سا کسمسا کر پھر بے خبر ہو گئے۔

”ایمی! یہ نہیں اٹھیں گے۔ بہت گہری نیند سوئے ہوئے ہیں۔“ اس نے کچھ دیر کی کوشش کے بعد بے بسی سے کہا۔

”میں اٹھاتی ہوں۔ تم تو یہ جرسی اور جرابیں پہنوا تنی دیر۔“ اس نے جرسی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور خود ان دونوں کو اٹھانے لگی۔



باہر واقعی گہرا اندھیرا تھا اور پچھلے صحن میں تو یوں بھی کم ہی آنا جانا ہوتا تھا۔ اجڑی ہوئی گھاس پھوس اور ٹنڈ منڈ سے پودے تھے۔ ایک چالیس واٹ کا مرل سا بلب برآمدے میں جل رہا تھا۔ جس کی نیلی روشنی میں ماحول اور بھی خوفناک اور پراسرار لگ رہا تھا۔ تائی جان کے کبوتروں کے خالی ڈربے ایک کونے میں تھے آج کل اس میں کوئی کبوتر نہیں تھا دوسرے کونے میں ہاتھ والا پانی کا ٹکا تھا باہر گھپ اندھیری رات تھی۔

چاند بھی نہیں نکلا ہوا تھا اور آسمان پر بادل تیر رہے تھے ایمن اور عبیرہ نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ ایمن نے مون کو کندھے سے لگا رکھا تھا۔ وہ ابھی بھی سو رہا تھا جبکہ فضلہ ڈر اور نیند کی ملی جلی کیفیت میں عبیرہ کے ساتھ چٹٹی ہوئی تھی ایمن نے اسے خوب ڈانٹ ڈپٹ کراٹھایا۔

”کہیں بارش نہ ہو جائے جاتے جاتے۔“ عبیرہ نے خدشہ ظاہر کیا۔
 ”ہم نے اتنی دور نہیں جانا۔ بس ابھی بس میں بیٹھیں گے اور گھر کے آگے ہی اتر جائیں گے اور اب تم بولو نہیں کوئی سن لے گا۔“ ایمن نے اسے کچھ ڈانٹتے ہوئے تنبیہ کی۔
 ”ابھی سب سو رہے تھے۔ تم نے اچھی طرح دیکھا تھا نا؟“ ان کے چلنے سے فرش کی خود رو گھاس اور پتے چرچارے تھے۔

”پھر بولیں تم؟“ ایمی نے دھیمی آواز میں اسے گھر کا ”کہنا جو ہے سب سو رہے تھے اب نہیں بولنا۔ کوئی نہیں آئے گا۔ مون کے بچے تم اٹھ کر چل نہیں سکتے۔“ اس نے جھنجھلا کر مون کے بھاری بوجھ کو دوسرے کندھے پر شفٹ کیا۔

عبیرہ اس کے بعد کچھ نہ بولی۔
 ”آئی! ہم کہاں جا رہے ہیں! ماما پاپا کے پاس؟“ کچھ دیر بعد فضلہ کی سہمی ہوئی آواز سنائی دی۔

”کاش ہم ان کے پاس جا سکتے۔“ ایمن کے لمبے میں بے بسی تھی اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔
 ”نہیں فضی! ہم گھر جا رہے ہیں۔ بس ابھی تھوڑی دیر میں پہنچ جائیں گے، تمہیں ڈر تو نہیں لگ رہا نا؟“ ایمن نے اسے ذرا پیار سے چکارا۔

”مجھے ڈر لگ رہا ہے آئی! اتنا اندھیرا ہے اور سردی بھی۔ ہم گھر کیسے جائیں گے اکیلے۔ ابراہ بھائی سے کہیں وہ ہمیں چھوڑ آئیں۔“ فضلہ رگ کر کھڑی ہو گئی۔

”نہیں ہم خود ہی جائیں گے۔ ہمیں دوسروں کے سہارے تلاش نہیں کرنے چاہیں بس تم تیزی سے قدم اٹھاؤ۔“ ایمن نے ذرا سختی سے کہا۔

وہ دونوں پھر خاموشی سے چلنے لگیں اور گیت کون سا اور تھا ایمن دروازے کے پاس پہنچ کر رک گئی۔

”شکر ہے۔ تالا نہیں لگا ہوا۔ عبیرہ تم کنڈی کھولو۔ میں نے مون کو اٹھا رکھا ہے۔“ ایمن دروازے سے ذرا ہٹ کر بولی۔

عبیرہ فضا کا ہاتھ چھوڑ کر آگے بڑھی۔
کنڈی کھولنے کے لیے اس نے کنڈی کے ہینڈل کو ذرا سا اوپر اٹھایا۔
دروازہ لوہے کا بنا ہوا تھا اور کنڈی نامعلوم کب کی بند تھی۔ زنگ آلود ہینڈل چیخ اٹھا اور وہ سخت بھی بہت تھا۔
عبیرہ نے ذرا ڈر کر ایمن کی طرف دیکھا۔

”یہ نہیں کھلے گا۔“ وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔
”کھل جائے گا ذرا دو چار بار اوپر نیچے کرو۔ جلدی کرو۔ کوئی اٹھ کر نہ آجائے۔“ ایمن نے پھر سختی سے کہا۔
عبیرہ نے ہینڈل کو نیچے کیا۔ اس نے پھر زوردار آواز نکالی عبیرہ نے ایمن کو دیکھا۔
”اچھا۔ تم مون کو پکڑو۔ میں کھولتی ہوں تمہارے ہاتھوں میں تو جان ہی نہیں ہے۔“
جتنا وقت گزر تا جا رہا تھا ایمن کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ تینوں تو بالکل ہاتھ پاؤں چھوڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔
عبیرہ نے جلدی سے مون کو اس سے لے لیا، مون اب گری نیند کے غلبے سے نکل آیا تھا اور اب گردن اٹھا کر عبیرہ اور ایمن کو دیکھ رہا تھا۔

ایمن نے آگے بڑھ کر چٹختی کے ہینڈل کو زور سے دو تین بار اوپر نیچے کیا مگر زنگ آلود کنڈی کھلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

”آئی! سردی لگ رہی ہے۔“ فضا کپکپا کر بولی۔ اس کے ہاتھ برف ہو رہے تھے۔
”چپ کرو تم میں بھی یہاں کھیل نہیں رہی ہوں، دروازہ کھول رہی ہوں۔“ وہ جھڑک کر بولی۔
”ماما۔ ماما کے پاس جانا ہے عبیرہ۔ ماما کے پاس ہوں ہوں۔“ مون نے ایمن کی ڈانٹ سے گھبرا کر ایک دم سے رونا شروع کر دیا ایمن گھبرا کر کنڈی چھوڑ کر اس کی طرف بڑھی۔

”مون! ہم ماما کے پاس ہی جا رہے ہیں۔ شاباش مانی رویتے نہیں۔ چپ کر جاؤ۔ بس تھوڑی دیر اور۔“ اس نے آگے بڑھ کر مون کو گلے سے لگایا اور اس کا منہ چوم کر اسے تسلی دی۔
”نہیں نہیں۔ مجھے ماما کے پاس جانا ہے ابھی۔“ وہ پھر رونے لگا۔

”جا رہے ہیں نامون ماما کے پاس ہی جا رہے ہیں۔ اب چپ کر جاؤ۔“ عبیرہ نے بھی اسے پیار کیا۔
”بس ابھی دروازہ کھل جائے گا پھر ہم اپنے گھر جائیں گے۔ مون اپنے کمرے میں سوئے گا جہاں اس کے کھلونے ہیں اور کئی ماؤں بھی تو ہے نامانی۔ اب نہیں رونا۔“ ایمن نے اسے چکارا تو وہ خلاف توقع خاموش ہو ہی گیا۔

وہ پھر ہٹ کر زور زور سے کنڈی کھولنے لگی، تین چار بار زور سے اوپر نیچے کیا ہینڈل اب کھسکنے لگا تھا۔ اس پر جوش طاری ہو گیا۔ اس نے دو تین جھٹکے اور دیے۔

”یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ ہیں؟“ ایک دم سے پیچھے سے ولید کی زوردار آواز آئی، چاروں اچھل پڑے مون اور فضا تو ڈر کر اور زور زور سے رونے لگے عبیرہ بھاگ کر ایمن سے چمٹ گئی۔

”ہم اپنے گھر جا رہے ہیں۔“ ایمن نے عبیرہ کا بازو تھام کر بے خوفی سے ولید کو دیکھا۔
”اس وقت آدھی رات کو۔ تمہارا دماغ ٹھک ہے۔“ ولید حیرانی سے بولا۔

”ہاں اس وقت آدھی رات کو تمہیں کیا تکلیف ہے؟“ ایمن بد لحاظی سے بولی۔

”اور گھر کا راستہ آتا ہے مار کو پوچھو صاحبہ!“ وہ طعنے سے بولا۔

”آتا ہے ہم خود بھی جاسکتے ہیں۔ تمہیں نہیں کہہ رہے کہ ہمیں چھوڑ کر آؤ۔“

”عجبوہ! چلو دروازہ کھل گیا ہے۔“ وہ پلٹ کر پھر کنڈی کھولنے لگی۔

”ایمن! تم بالکل بالکل ہو گئی ہو اور ساتھ میں ان تینوں کو مارنا چاہ رہی ہو اتنی سردی میں۔ میں بلاتا ہوں ابو کو۔“ اس نے آگے بڑھ کر ایمن کو دروازے سے مرے دھکیلتے ہوئے کہا۔

”تمہیں کیا تکلیف ہے اگر میں بالکل ہو گئی ہوں۔ یہ میرے بہن بھائی ہیں، تمہیں تو کچھ نہیں کہہ رہی ہوں ہمارے راستے سے۔“ وہ چیخ کر بولی اور اسے اپنے آگے سے دھکیلتے لگی۔

”بالکل!“ ولید نے گھور کر کہا آواز بلند کرنا۔

”ابو! امی! چاچو! جلدی آئیں یہ دیکھیں یہ کیا کر رہی ہے مس بائگ کانگ۔ ان کو ٹھنڈ میں مارے گی۔“ گھر کی طرف منہ کر کے وہ زور سے چلایا۔

”ولید میں کہہ رہی ہوں ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ ہمیں یہاں نہیں رہنا۔ اپنے گھر جانا ہے پیچھے ہٹو اور جسے مرضی بلا لو میں کسی سے ڈرتی نہیں ہوں۔“ وہ نڈر ہو کر بولی اور اسے دھکیل کر پھر کنڈی کھولنے لگی۔

”تم ایسے نہیں مانو گی؟“ ولید نے اسے دھمکایا۔

”چلو عجبوہ فضا اور مون کو مجھے دو۔ اس دیوانی کو اکیلی جانے دو۔ خود ہی داغ ٹھکانے آجائے گا۔“ اس نے عجبوہ اور فضا کو اندر کی طرف دھکیلا اور مون کو عجبوہ کی گود سے جھپٹ لیا۔

”چھوڑو مون! عجبوہ! چلو تم۔ دروازہ کھل گیا ہے۔“ وہ زخمی شیرنی کی طرح ولید پر جھپٹی اور مون کو کھینچنے لگی۔

”امی! ابو! چاچو! جلدی آئیں اس ایمن کی بچی کو پوچھیں اگر۔“ وہ اسے دھکا دے کر مون کو لیے برآمدے کی طرف بڑھا اور یہ تو اسے پتا تھا کہ وہ مون کے بغیر وہاں سے مل بھی نہیں سکتی وہی ہوا وہ وہاں دار اس کے پیچھے بھاگی عجبوہ اور فضا بھی ان دونوں کے پیچھے چل پڑیں۔

”ولید! چھوڑو مون کو۔ میں کہتی ہوں۔ چھوڑو اسے۔“ اس نے پیچھے سے ولید کی جرسی زور سے کھینچی۔

”کیا ہو رہا ہے تم لوگوں کو آدھی رات کو۔ کیا اودھم مچایا ہوا ہے اس سردی میں۔“ تالی جی برآمدے میں سردی سے کپکپاتے ہوئے آکر بولیں۔

”امی دیکھیں اس بالکل کو۔ یہ تینوں کو اس وقت لیے اپنے گھر جا رہی ہے دیکھیں، مون کا بخار کتنا تیز ہو گیا ہے۔“ ولید نے جلدی سے مون کو ماں کی طرف بڑھایا۔

”اوئی اللہ بچے کا رنگ تو دیکھو نیلا پیلا ہو رہا ہے۔“ انہوں نے جھپٹ کر مون کو اپنے ساتھ چمٹایا۔ ”اے ایمن کیا کیرانا چاہے آدھی رات کو تیرے پیچھے میں۔“ وہ پلٹ کر ایمن پر برسیں۔

”امی! اس کو ذرا ابو کے پاس لے کر چلیں پھر اسے پتا چلے اس حرکت کا مطلب۔“ ولید نے اسے ڈرانا چاہا۔

”ہاں تو لے جائیں مرضی جس کے پاس میں کسی سے نہیں ڈرتی ہوں ہمیں اپنے گھر جانا ہے بس۔“ اس کا لہجہ از حد گستاخ تھا۔

”میں یہ اسے کیا ہوا ہے؟“ تالی جی اس کے لیے پر حیرت زدہ رہ گئیں۔

”اسے کوئی جن چٹ گیا ہے ای! اتنے اندھے میں باہر جو کھڑی دروازے سے زور آزمائی کر رہی تھی عین درخت کے پیچھے۔“ ولید فوراً بولا۔

”کیسا شور ہے یہ؟ کیا ہو رہا ہے اوھر؟“ تالی جی بھی آوازیں سن کر آنکھیں ملنے باہر آگئے۔

”میں یہ کیا ہو رہا ہے تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو آدھی رات کو۔“ وہ حیرت زدہ رہ گئے۔

”یہ ذرا اپنی بھینچی کے کرتوت سنیں۔ آدھی رات کو بہن بھائی کو لے کر اپنے گھر جا رہی تھی۔ نارزن کی اولاد۔“ ولید نے آتے ہی باپ کو بھڑکایا۔

”منہ سنبھال کر بات کرو ولید! میں تم جیسوں کے منہ نہیں لگنا چاہتی۔“ اس بات پر اس کا جی چاہا کہ وہ ولید کا منہ نوج لے۔

”کیا معاملہ ہے یہ؟ انیسہ! تم بتاؤ۔“ تالی جی کا منہ خراب ہو گیا تھا۔ وہ گرجدار آواز میں بولے۔

”معاملہ کیا ہونا ہے بے چارے بچوں کو اتنی ٹھنڈ میں خدا جانے کہاں لے کر جا رہی تھی۔ میں تو خود شور سن کر آئی ہوں باہر۔ یہ مون کو تو دیکھیں کیسے نیلے کالچ جیسا ہو رہا ہے۔ میں اسے تو اندر لے کر جاؤں۔“ وہ اندر کی طرف بڑھیں۔

”یہ کیا سن رہا ہوں میں؟ ایمن کہاں جا رہی تھیں تم اس وقت۔“ تالی جی گرج کر ایمن سے بولے۔

”سنا نہیں آپ نے۔ ہم اپنے گھر جا رہے تھے ہمیں اپنے گھر جانا ہے۔ اوھر اوھر تقسیم نہیں ہونا۔“ وہ باغی لہجے میں بے خوفی سے بولی۔

”تم۔۔۔ تمہاری اتنی جرات۔“ وہ غصے سے آگے بڑھے اور کھینچ کر اس گال پر اوپر تلے دو تھپڑ جڑ دیے۔ وہ برآمدے کے ستون سے جا لگی۔

”ہاں ہمیں تقسیم ہونا۔ ہمیں اپنے گھر جانا ہے۔“ وہ اسی دیدہ دلیری سے بولی آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔

”گھر جانا ہے، تمہارا باپ خزانے چھوڑ گیا ہے نا جو گھر جا کر کھاؤ گے۔ چلو دفع ہو جاؤ اپنے کمرے میں۔ اب میں نے کوئی بات سنی تو تمہارا گلا گھونٹ دوں گا گستاخ لڑکی!“ انہوں نے بازو پکڑ کر اسے اندر دھکیلا عجبوہ اور فضا پہلے ہی ڈر کر تالی جی کے ساتھ ہولی تھیں۔

”میں نہیں جاؤں گی۔ مجھے اپنے گھر جانا ہے۔ اوھر نہیں رہنا ہے۔“ وہ ان ہی قدموں پر اڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”جانی ہو کہ میں دوں ایک اور ہاتھ۔ اور کہاں ہے یہ سفید کما بھٹی تھا۔ آج رات ان کے پاس سو جانا۔“ انہوں نے زور سے اس کا بازو پکڑ کر اندر کی طرف کھینچا وہ گھسنے لگی۔

”ایمن! چلو اندر کیا بکواس کر رہا ہوں میں۔“ اس کی ہٹ دھرمی انہیں اور تپا گئی پلٹ کر گرجے وہ بستے آنسوؤں کے ساتھ پوری دھڑائی سے کھڑی رہی۔

”تم ایسے نہیں مانو گی۔“ انہوں نے ایک زوردار تھپڑ اور اس کے منہ پر لگا دیا۔

”دفع ہو اندر!“ اور اسے زور سے کھینچتے ہوئے اندر کمرے میں لے آئے۔ اس تھپڑ نے تو اس کے چوہ طبق روشن کر دیے تھے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا تھا۔ عجبوہ اور فضا پہلے ہی اندر پہنچ چکی تھیں۔ اندر جا کر انہوں نے زور سے اسے پٹنگ کی طرف دھکا دیا اس کا سر زور سے پٹنگ کی پشت سے ٹکرایا۔ مارے تکلیف کے اس کی چیخ نکل گئی۔

”کیا کرتے ہیں کہیں چوٹ دھٹ لگ جائے گی۔ جائیں آپ میں سمجھاتی ہوں اسے پیار سے۔“ تالی جی نے مون کو پٹنگ پر لٹا کر اسے پکڑنا چاہا مگر وہ تڑپ کر رہے ہو گئی۔

”چھوڑیں مجھے ہاتھ نہ لگائیں۔ آپ لوگ ظالم ہیں۔ ہمارا سارا کچھ ہڑپ کر کے ہمیں بانٹ دینا چاہتے ہیں تاکہ کل کوئی آپ کو پوچھنے والا نہ رہے مگر اللہ تو سب دیکھ رہا ہے نا وہ یہ ظلم نہیں ہونے دے گا اور اگر اللہ بھی ظالموں کا

ساتھ دے گا تو بھی میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ میں پیپا کے دوستوں سے کہوں گی۔ وہ آپ لوگوں پر کیس کر دیں گے۔ آپ لوگوں نے ہمیں قید کر لیا ہے۔ آپ ظالم ہیں۔“ وہ چیخ چیخ کر رونے لگی، بے ربط جملے اس کے منہ سے نکل رہے تھے۔ اس کی آوازیں سن کر ساتھ والے کمروں سے سفینہ اور عاکف بھی اٹھ کر آگئے۔

”کیا ہوا؟ کیا ہوا بھابھی؟“ سفینہ گھبرا کر آگے بڑھی۔

”ہونا کیا ہے بے وقوف لڑکی اس وقت تینوں بہن بھائی کو لے کر گھر جا رہی تھی۔ وہ تو خدا کا شکر ہے ولید نے دیکھ لیا اور اب یہ چیخ چیخ کر سارا محلہ اکٹھا کر رہی ہے۔“ تائی جی نے پھر اسے اپنے پاس کھینچنا چاہا وہ اور زور سے بدک گئی۔

”ہاں چیخوں گی اور زور سے چیخوں گی شور مچاؤں گی۔ آپ لوگ ظالم ہیں ہم بہن بھائیوں کو جدا کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں مارنا چاہتے ہیں۔ ہمارے پیپا کے گھر پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں یہاں نہیں رہنا اپنے گھر جانا ہے۔ میں مون کو فضلہ کو کہیں نہیں جانے دوں گی، چاہے آپ لوگ مجھے جان سے مار دیں۔“ چیخ چیخ کر اس کا گلا بیٹھ گیا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”دیکھی ہے زبان اس کی، باشت بھر کی لڑکی کی اور عزائم دیکھو، یہ آگے کیا کرے گی۔“ تائی جی بھڑک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ تائی جی نے کندھا پکڑ کر انہیں بٹھانا چاہا۔

”میری ایچی! یس بیٹا جان! کیا ہو گیا ہے تمہیں، کوئی تمہیں جدا نہیں کر رہا بیٹا، اس وقت تو کہیں نہیں جاتے۔ تم خود عقل مند ہو۔ آدھی رات کا وقت ہے خدا نخواستہ کچھ ہو جاتا تو پھر۔“ غزالہ آنٹی لپک کر آگے بڑھیں اور اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

”غزالہ! اچھوڑو اسے میں دیکھ لیتا ہوں، بہت بد تمیز ہو گئی ہے یہ۔“ تائی جی غصے سے بولے۔

”نہیں بھائی جان! غصے سے نہیں پیار سے۔ سمجھ جائے گی بہت اچھی بیٹی ہے ہماری ایچی۔“ غزالہ نے اپنی شال سے اس کا چہرہ صاف کرتے ہوئے اس کا منہ چوما۔

”ہمیں اپنے گھر جانے دیں میں اور کچھ نہیں کہتی۔ ہمیں یہاں نہیں رہنا۔ غزالہ آنٹی ہمیں اپنے گھر جانا ہے اپنے پیپا کے گھر۔“ سسکیوں کے درمیان وہ انک انک کر بولی۔

”ہاں ہاں بیٹا ضرور جانا۔ کیوں نہیں کوئی تمہارے پیپا کا گھر تم سے نہیں چھین رہا وہ تمہارا گھر ہے، تمہارے بہن بھائیوں کا۔ بیٹا مگر اس وقت تو نہیں آدھی رات کو۔ اگر آپ لوگ گم ہو جاتے تو پھر بیٹا میں تمہیں لے جاؤں گی گھر۔ بس اب سو جاؤ۔ صبح چلیں گے ٹھیک ہے۔“ غزالہ نے اسے اپنی گود میں بھرتے ہوئے پیار کیا۔

”غزالہ آنٹی ابھی جانا ہے ابھی۔“ وہ پھر بکھرنے لگی۔

”ہاں بیٹا کہنا، صبح چلیں گے سب۔ بس اب سو جاؤ دیکھو تو کیسے ٹھنڈی برف ہو رہی ہو۔ اس وقت سردی ہے نا صبح چلیں گے۔“ غزالہ نے اسے اپنے ساتھ لپیٹ لیا۔

”چلو بچوں تم بھی اپنے بستروں میں سو جا کر۔ رات بہت ہو گئی ہے اور سفینہ تم مون کو لے کر لیٹ جاؤ۔ یہ ٹھیک

نہیں لگ رہا۔“ غزالہ نے مڑ کر سفینہ سے کہا تو اس نے تائی جی کی گود سے مون کو لے کر دوسرے بیڈ پر لٹا دیا۔ تائی جی سر جھٹکتے ہوئے باہر نکل گئے ان کے پیچھے ہی عاکف چچا نکل گئے۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

UrduPhoto.com



دوسری قسط

”میں نے پہلے ہی کہا تھا بھائی صاحب سے کہ یہ ٹھیک نہیں اس سے بچے اور زیادہ فرسٹ ہو جائیں گے۔“
غزالہ نے ہلکی ہلکی سسکیاں بھرتی ایمن کو دیکھ کر دم آواز میں سفینہ سے کہا۔
”ہاں تو انہوں نے کون سا کیلے فیصلہ کیا ہے سب ہی موجود تھے کوئی ایک پھر لے لے ذمہ داری چاروں کی۔
نہیں پھر یہ ہوں گے ”وہ“ کیا ہے ”تائی جی کو فرسٹ نہیں کہنا آیا تو وہ کہہ کر چپ ہو گئیں۔“
”ہاں غزالہ اور کوئی حل بھی تو نہیں تھا نا۔ پھر بے چارے اور کیا کرتے۔ اب تو جو لکھی گئی ہے قدرت کی طرف
سے“ اسی کو بھگتنا ہے۔ ان معصوموں کو خود ہی صبر آجائے گا۔ دھیرے دھیرے۔“ وہ آہستہ آہستہ مون کو پھپھکتے
ہوئے بولیں۔

”اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس کی کیا مصلحت تھی اس میں آہ۔“ غزالہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔ تائی جی اٹھ کر
باہر چلی گئیں۔ عجبوہ اور فضلہ پہلے ہی مون کے دوسری طرف دیک کر سوچ چکی تھیں مگر ایمن کی سسکیاں ابھی بھی
نہیں ختم رہی تھیں۔ غزالہ اس کے سرخ پھڑزہ گالوں کو دیکھ کر رو رہی تھیں۔ پھول سے ملائم گال جنہیں ابھی
گرم ہوانے بھی نہیں چھوا تھا اب دونوں پر انگلیوں کے نشان جیسے کھد گئے تھے اور ان کے گرد لالی لک آئی تھی۔



پھر وہ دن وہ شدید بخار میں پھنکتی رہی بخار ایک سو چار درجے سے کم ہی نہیں ہو رہا تھا دو بار تو اس کی جان کے
لالے بڑ گئے۔ تین تین بار ڈاکٹر کو گھر بلا یا گیا تھا اتنی سردی میں بھی نچ پانی کی پٹیاں کی جا رہی تھیں مگر بخار کی شدت
کم ہی نہیں ہو رہی تھی اس کے پیلے زرد چہرے سے جیسے خون پھر کر رہ گیا تھا۔ غزالہ آنٹی اور تائی جی نے جی جان
سے اس کی دیکھ بھال کی تھی مگر اسے کچھ ہوش نہیں تھا بے ہوشی میں بھی ماں باپ بہن بھائیوں اور گھر گھر کو
رکارے جا رہی تھی۔ اس کی الٹی سیدھی باتیں سن کر اور سب کے دل کٹ رہے تھے وہ ہی دنوں میں اتنی کمزور ہو گئی
تھی کہ بچانی نہیں جا رہی تھی۔

سفنہ چھو پھونے جانے سے پہلے صدقے کا کالا بکرا منگوا کر دیا ان کے جانے تک اس کے بخار کی شدت کچھ کم ہو
گئی تھی لیکن ہوش ابھی بھی پوری طرح نہیں آیا تھا اور اچھا ہی تھا کہ وہ بے ہوش تھی ورنہ فضلہ اور مون کے
جانے پر پتا نہیں وہ اپنی کیا حالت کر لیتی جب مون سفینہ کے ساتھ گیا وہ سویا ہوا تھا اور فضلہ تو ویسے ہی سہمی ہوئی تھی

اور عاکف چچا نے اس کی انگلی اتنی لائق سے تھام رکھی تھی کہ وہ ڈر کے مارے کوشش کے باوجود ان کے ساتھ جانے سے انکار نہ کر سکتی۔ اس رات آئی کی پٹائی کا منظر اس کے سامنے تھا، پھر عبیدہ بھی توجہ نہ دے سکا۔ اس نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہ کی تھی۔ وہ مزے کر بے سدھ پڑی ایمن اور اس کے پاس سر جھکائے تنہی عبیدہ کو دیکھ رہی تھی اس کی آنکھوں سے آنسو ابل ابل کر بہنے لگے سارے بڑے اپنی باتوں میں مصروف تھے کسی کی نظر ان رائیگاں موتیوں پر نہیں پڑ رہی تھی جو ٹوٹے ہوئے خوابوں کی طرح آنکھوں سے برس رہے تھے۔

”چلو عاکف! ہمیں دیر ہو رہی ہے فلائیٹ کا ٹائم ہو رہا ہے ابراہیم کیسی لے آیا ہے ایمن انشا اللہ اب ٹھیک ہو جائے گی تم فون کرو دینا جا کر۔“ مائی جی نے عاکف چچا سے کہا۔

”ہاں میں جا کر فون کروں گا ویسے ہو جائے گی ٹھیک۔ یہ ایک دو روز میں سنبھل جائے گی فکر کی کوئی بات نہیں اور پھر سفینہ تم کل جاؤ گی۔“ وہ سفینہ کی طرف مڑے۔

”ہاں بھائی! میں کل چلی جاؤں گی مون تو اب کافی میرے ساتھ مل گیا ہے بچے تو ویسے بھی پیار کے بھوکے ہوتے ہیں پیار ملے گا تو دو چار ماہ میں سب بھول بھال جائیں گے۔ آپ بھی فضا کا خیال رکھیے گا اور کوشش کیجئے گا دو چار

ماہ بعد اسے ملوانے لے آئیں اور دونوں بہنوں سے۔“

”اس طرح تو یہ بار بار ڈسٹرب ہوں گی، میرا تو خیال ہے اب انہیں اپنے اپنے ماحول میں سیٹ ہونے دینا چاہیے۔ ویسے بھی میرے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا آنے جانے کا۔ پھر بھی میں کوشش کروں گا۔“ وہ بزنس مین والے مصروف انداز میں بولے۔

”اچھا بھائی جان! اب جازت دیں۔ مجھے واقعی دیر ہو رہی ہے۔“ وہ اس کی انگلی تھام کر ہر کی طرف بڑھے۔

”آئی! عبیدہ! میں نہیں جاؤں گی۔“ فضا مڑ کر گھٹی گھٹی آواز میں بولی، عبیدہ نے تڑپ کر بہن کی طرف دیکھا جبکہ بڑے کسی نے اس کی فریاد سنی ہی نہیں تھی۔

”چاچو! چاچو!“ عبیدہ عاکف کا دوسرا بازو ہلا کر بولی۔

”چاچو فضا کو رات کو ڈر لگتا ہے، یہ بہت جلدی ڈر جاتی ہے آپ اسے اپنے ساتھ سلائیے گا پلینز۔“ وہ کہتے کہتے رو پڑی۔

”اچھا اچھا۔ ٹھیک ہے، یہ وہاں جا کر خوش ہو جائے گی شاباش، روتے نہیں میں اسے دھیر سارے کھلونے لے دوں گا، سارے پاس دھیر ساری ڈالٹریں، یہ نہیں ڈرے گی چلو فضا! اچھا بھئی سب کو خدا حافظ۔“ وہ جلدی جلدی کہہ کر ہر نکل گئے باقی بھی ان کے پیچھے نکل گئے۔

”عبیدہ! عبیدہ!“ فضا ان کے تیز قدموں کا ساتھ دیتے ہوئے ایک بار پھر مڑ کر بے چارگی سے بولی تو عبیدہ وہیں چو کھٹ پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اور جب ایمن کو ہوش آیا تو جیسے سارا میلے شہر اور بھیڑ میں عبیدہ فضا اور مون کہیں گم ہو چکے تھے اور اب چاہے وہ کتنی شور مچاتی مسجدوں میں اعلان کرواتی یا اخبار میں اشتہار دیتی وہ اسے نہیں مل سکتے تھے۔ غرض کہ مائی جی اس روز سفینہ پھوپھو مون کو لے کر گئیں اسی روز وہ پھر کو عبیدہ کو لے کر حیدر آباد چلی گئی تھیں مائی جی کہیں یاہر گئے ہوئے تھے ابراہیم بھائی ٹوشن پڑھنے اور ولید کرکٹ کھیلنے۔ مائی جی کچن میں ابھی ہوتی تھیں اور وہ ٹوشن تھا کر کے میں مائی جی ان تینوں کو یاد کر کر کے روئے جا رہی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو مائی جی اسے ڈانٹ

کر گئی تھیں۔

”تم نے کیا خوش قسمت پھیلائی ہوئی ہے۔ ہر وقت یہ رونا دھونا مچائے رکھتی ہو تمہارے ماں باپ چلے گئے گھر اجڑ گیا اب اس گھر کو بھی اجاڑنا ہے یہ منحوس ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھر کے۔ کچھ خدا کا خوف کرو۔ بچے اور دن ملتا ہے ادھر سارا کچھ بھول بھال جاتے ہیں۔ تم تو اس روگ کو سینے سے چٹا کر بیٹھ گئی ہو نہ ہم نے مارا ہے تمہارے ماں باپ کو۔ ان کی آئی تھی وہ چلے گئے ہماری آئے گی ہم چلے جائیں گے۔ اس پر تو کسی کا زور نہیں۔ پرانی بی تم نے تو حد ہی کر دی ہے آخر کہاں تک تمہاری دلداریاں کریں ہم۔ ہماری اپنی بھی کوئی زندگی ہے کہ نہیں کہ تمہارے ہی ناز اور جو بچے اٹھاتے رہیں۔ اب بس کرو بہت ہو گئی دو ماہ بہت ہوتے ہیں۔ کسی کے سوگ کے لیے اس سے زیادہ سوگ تو خدا کو بھی ناپسند ہے۔ انھوں نے کچھ دنیا کی طرف دھیان کرو اسکول والوں کو۔۔۔ میڈیکل سرٹیفکیٹ بھیج بھیج کر آیا تمہارے ٹھک گئے۔ اب انہوں نے سیدھا سادانا ہم ہی خارج کر دینا ہے۔

پھر کون نئے سرے سے داخلے بھرتا پھرے گا، ایک تو لے کے ماں باپ نے اتنے اونٹ اسکولوں میں بھرتی کروا رکھا تھا، جیسے بیٹی کو کشتہ بنانا ہے، چلو یہ چار چھ ماہ تو کٹ لو اس اسکول میں پھر کسی سرکاری ہائی اسکول میں داخل کروا دیں گے، اب ایک تم ہی تو نہیں ہو اپنی بھی اولاد ہے، گھر داری کے سونے بیٹھے ہیں، دنیا داری بھی بھائی پڑتی ہے اب تمہارے اماں باوا کی طرح تو نہیں کہہ بس بچوں کو عیش کرا دیے، خود کر کے نہ کسی سے ملنا، نہ کسی کو دینا دلانا کہ جی وقت نہیں ملتا، اب ہم تو یہ لنگڑا بھانا ہر کسی سے نہیں کر سکتے اور اب جو بیٹھے بٹھائے ایک ذمہ داری اور سر پر آن پڑی ہے، اس کو بھی تو دیکھنا ہے اور منگائی کیا کم ہے بھلا، جان کو کھانے کے لیے، ان کی برداشت کی حد ختم ہو گئی تھی۔ آج وہ پھٹ ہی پڑیں وہ جب چاپ سنی رہی۔

”اب کیا گوٹے کا گڑ کھا کر جیسی ہو جو کوئی جواب نہیں۔ کچھ کھا لو گا دوں یہاں صبح سے دو توں کھا کر بیٹھی ہو پھر دو آئی لو اور کل پرسوں تک اسکول جاؤ یوں تمہارے سر جڑھ کر نہ مرنے۔“ وہ خود ہی بوڑھو تے ہو کر ہر نکل گئیں تو اس آنسو اور تواتر سے بہنے لگے۔

”یہ دن بھی آنے تھے ماما! میں کیا کروں۔ اس سے تو اچھا تھا اس روز میں آپ کے ساتھ چلی جاتی۔ اس طرح یہ سب کچھ نہ دیکھتی فضا مون، عبیدہ سب چلے گئے ماما میں اکلی رہ گئی۔ مگر نہیں وہ بھی تو اکیلے ہو گئے ہیں۔ ماما! پاپا! یہ سب کیا ہو گیا ہے آپ لوگ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ میں کس کے پاس جاؤں، کس سے لپٹ کر روؤں، کس کو ماما کہوں، اللہ میاں جی، آپ نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہم تو چھوٹے چھوٹے سے ہیں ہم نے تو کوئی گناہ بھی نہیں کیا پھر ہمیں یہ سزا کیوں ملی، اتنی بڑی سزا، اللہ میاں جی! اس سے بڑی سزا دے لو ہمیں بھی ماما! پاپا! کے پاس بلاؤ، مجھے اب زندہ نہیں رہنا بالکل نہیں رہنا میں کیا کروں ماما! میں کیا کروں۔“

وہ سسک سسک کر تنکے میں منہ چھپا کر رونے لگی، عبیدہ کہتی ہے وہ واپس نہیں آسکتے۔ لیکن ہمیں یہاں سے لے جانا تو آپ کے لیے مشکل نہیں، آپ مجھے یہاں سے اپنے پاس بلا لیں، ماما! پاپا! کے پاس ہم سب کو، ہم سب کو۔ اس کی سسکیاں تیز ہو گئیں۔

♥ ♥ ♥ ♥

اس کی جب آنکھ کھلی تو اس کا سر پھوپھو کی گود میں تھا۔ اور دھڑ دھڑاکی دوسری سیٹ پر پہلے تو اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے حیرانی سے آنکھیں جھپک جھپک کر گود میں لیٹے لیٹے ہی ارد گرد کا ماحول سمجھنے کی کوشش کرتا رہا پھر اس نے دھیرے دھیرے سر اٹھا کر گود والی کا چہرہ دیکھا۔

”پھوپھو!“ اس سے کچھ درجہ طمانیت ہوئی کہ وہ پھوپھو کی گود میں ہے۔

”جی میری جان۔!“ وہ تو اسی کی طرف متوجہ تھیں، بھرپور مسکراہٹ سے اس کا ہاتھ چوم کر بولیں۔
 ”پھوپھو! ہم کہاں ہیں؟“ اس نے ارد گرد گردن گھما کر سینوں پر بیٹھے لوگوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔
 ”جان! ہم جہاز میں ہیں، ایروپلین میں، میرے بیٹے کو شوق تھا، ایروپلین میں بیٹھنے کا۔ وہ دیکھو، ادھر سے نیچے ہمارا
 ایروپلین کتنا اونچا اڑا رہا ہے۔ آسمان کے اوپر۔“ انہوں نے اس کے بال سنوارتے ہوئے اسے اپنی گود میں بٹھا کر
 کھڑکی سے نیچے دیکھانا چاہا۔ جہاز واقعی بہت بلندی پر پرواز کر رہا تھا اسے خوف آگیا اس نے فوراً ”گردن پیچھے کر لے۔“
 ”پھوپھو! آپ کہاں ہے بیروہ آپ اور فضہ؟“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے دل میں مچلتا ہوا سوال بالآخر کر ہی

دیا۔
 ”وہ پاکستان میں ہیں، ہم تو اپنے گھر جا رہے ہیں، شارجہ مون بیٹے کے گھر۔“ انہوں نے پھر اس کے پریشان چہرے
 کو چوما۔
 ”اپنے گھر!؟“ اس کا انداز سوالیہ تھا۔

”ہاں اپنے گھر، وہاں مون بیٹا اپنی گڑیا سی بہنوں کے ساتھ رہے گا۔“ انہوں نے اسے چکارا۔
 ”بیروہ آپ اور فضہ کے ساتھ۔“ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”ہاں۔۔۔ وہ بھی ملنے آئیں گی۔ آپ سے میں ندیا اور نیناں کی بات کر رہی ہوں۔ شارجہ میں آپ کی بہنیں ہیں
 نا، وہ بھی۔“ انہوں نے اس کی توجہ پٹانا چاہی۔

”ندیا اور نیناں کون؟“ اس نے حیران سی گول مٹول آنکھیں گھمائیں۔
 ”بیٹا! آپ کی بہنیں، یاد ہے پچھلی عید پر وہ میرے اور انکل کے ساتھ آئی تھیں آپ کے گھر، ان دونوں نے
 ریڈ فرائڈ اور ریڈ شوز پہنے ہوئے تھے، ہے نا۔“ انہوں نے اسے یاد دلانا چاہا۔
 وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔

”ہاں۔ یاد آیا، تھوڑا تھوڑا نیناں چھوٹی سی ہے۔ براؤن بالوں والی، فضہ کی دوست ہے نا پھوپھو؟“ اس نے
 حافظے پر زور دے کر پوچھا۔

”بس میری جان وہی نیناں اور ندیا اچھا بیٹا! مجھے یہ بتاؤ میں آپ کو کیسی لگتی ہوں۔“ انہوں نے موضوع بدل کر
 اس سوال پر مون نے ذرا مڑ کر اسے سنوان کا جائزہ لیا۔

”اچھی۔“ اس نے سرسری سے انداز میں کہہ کر دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔
 ”صرف اچھی۔“ پھوپھو نے چہرہ اس کے قریب کیا۔
 ”نہیں بہت اچھی۔“ وہ موتا مسکرا کر بولا۔

”ماما جیسی نا؟“ انہوں نے چہرہ اور اس چہرے کے قریب کر لیا۔
 ”نہیں ماما جیسی نہیں،“ اس نے سختی سے تردید کی۔

”بیٹا! ماما بھی تو یاد کرتی تھیں نا آپ سے نہیں بھی کرتی ہوں تو پھر ماما جیسی نہ ہوئی۔“ ان کا انداز جس نے والا تھا۔
 ”لیکن ماما تو نہیں نا!“ وہ اسی ضدی لہجہ میں بولا۔

”مون! میری جان دیکھو نا، اب آپ میرے ساتھ جا رہے ہیں اپنے گھر نیناں اور ندیا کے پاس اور اب آپ کو
 وہیں رہنا ہے اپنی سسٹرز کے ساتھ، وہ آپ کی سسٹرز ہیں نا!“ انہوں نے سوال کیا۔

”ہوں“ وہ ناگجھی سے بولا۔
 ”تو جب وہ آپ کی سسٹرز ہیں، میں ان کی ماما ہوں تو پھر آپ کی بھی ماما ہوئی نا۔ ہے نا؟“ وہ ان کی کراس کو ٹھٹک

سے کنفیوز ہو گیا۔

”لیکن میری سسٹرز تو امی آپلی اور عبیرہ آپلی اور فضہ ہیں۔“ وہ پھر اس کی طرف آگیا۔
 ”وہ بھی ہیں لیکن نیناں اور ندیا نہیں۔“ محبت بھی گنتی بڑی بلیک میلنگ ہے چھوٹا سا بچہ بھی اس کے ہاتھوں
 بلیک میل ہو گیا۔

”ہاں وہ بھی ہیں۔“ وہ پھر موتا بولا۔
 ”تو میں ان کی ماما نہیں۔“

”ہاں ہیں۔“
 ”تو پھر میں آپ کی بھی ماما ہوئی نا!“ انہوں نے پھر اسے گھیر لیا۔

وہ چپ رہا۔
 ”ہوں نا۔“ کہو بیٹا! مجھے ماما۔“ انہوں نے پیار سے اس کے دونوں گال چوم کر کہا وہ خاموشی سے انہیں نکلے گیا۔
 ”کہو نا ماما!“ اس کی خاموشی ان کے اصرار کو بڑھا رہی تھی۔

”کہو نا۔۔۔“
 ”ماما۔۔۔!“ اس نے فقط لب لپٹے۔
 ”میں قریب اپنے بیٹے پر۔“ اونچی آواز میں بولونا میں نے تو سنا ہی نہیں۔“ وہ لاڈ سے اس کے گلے میں بانہیں ڈال

کر بولیں وہ چپ رہا۔
 ”مون! کہو نا ماما!“ انہوں نے چہرہ اس کے ہونٹوں کے قریب کیا۔
 ”کہو نا ماما!“

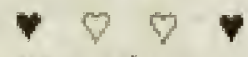
”ماما۔۔۔ ماما۔۔۔ ماں کہاں چلی گئیں پھوپھو! ماما کہاں ہیں میری ماما!“ وہ ایک دم سے رونے لگا۔ اس کی قریب پر ان کی
 آنکھیں بھر بھر آئیں۔

”بیٹا! ماما اللہ تعالیٰ کے پاس چلی گئی ہیں نا، میں ہوں اپنی جان کی ماما! میں پیار کرتی ہوں نا آپ سے۔ ابھی گھر جا کر
 دیکھیں کھلونے لے کر دوں گی، صرف مجھے ماما کہو۔ میں آپ کی ماما! اپنے مون کی ماما!“ وہ فرط محبت سے زور زور سے
 اس کا منہ چومتے ہوئے بولیں۔

”ماما! اب نہیں آئیں گی کبھی بھی۔“ اس نے بوسوں کی بو چھانڈ کے درمیان مدھم آواز میں پوچھا۔ تو انہوں نے
 اسے اپنے ساتھ چٹا لیا۔

”میرا بچہ، میری جان! میرا مون! میں ہوں آپ کی ماما، ہمیشہ آپ کی اب میری جان کیا کھائے گا۔ ہوں، ہوں
 منکواؤں اپنے بیٹے کے لیے اور بسکت بھی۔“

اس نے کوئی جواب دیے بغیر ان کے سینے میں منہ چھپا لیا تو سفینہ نے ایئر ہو شس کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں۔



”عبیرہ جانو! آپ تو پہلے بھی یہاں آتی رہی ہیں ماما کے ساتھ، بیٹا آپ کو تو پتا ہے نا یہ گھر چھوٹا ہے، بس تین
 کمرے ہیں ادھر اب آپ کو اپنی بہنوں کے ساتھ ہی رہنا پڑے گا۔ اسی کمرے میں میں آپ کے لیے بیڈ منکواؤں
 کی جلد ہی بس ابھی کچھ دن آپ کو اپنی بہنوں کے ساتھ نیچے بستر لگا کر سونا پڑے گا، آئی ایم سوری بیٹا! آپ کی خاطر
 میں آپ کو علیحدہ کمرہ اور دوسری سوئیں پروائیڈ نہیں کر سکتی۔“

غزالہ کہتے کہتے شرمندگی سے اس کا ہاتھ تھام کر بولیں۔ وہ دوسرے کو آئی تھی غزالہ آنٹی کے ساتھ اب وہ اسے اپنی

بیٹیوں کے کمرے میں لیے بیٹھی تھیں، جہاں نیچے زمین پر فوم کے گدے بچھا کر بستر لگائے جاتے تھے۔ اور وہاں انہیں اپنے اپنے لفافوں میں دبی اپنی اپنی کتابیں لے کر بیٹھی ہوتی تھیں، ان کی دو بیٹیاں عبیدہ سے بڑی تھیں۔ ایک اس کی ہم عمر اور دو چھوٹی تھیں اسے بھی ان کے نام یاد نہیں ہوئے تھے۔ سوائے اپنی ہم عمر تائیہ کے اور اب اسے مستقل یہاں رہنا تھا ان کے ساتھ پہلے جب وہ ماما کے ساتھ آتی تو اسے پتا نہیں چلتا تھا کہ غزالہ آنٹی کی کتنی بیٹیاں ہیں اور اب یہاں ان کے ساتھ اسے نیچے فرش پر سونا تھا۔ آلو کھا کھا کر حالانکہ آج رات کا کھانا بڑا زبردست تھا، چکن کڑاہی اور شکم گوشت لیکن اسے تھوڑا تھوڑا سا احساس تھا کہ اس طرح کے کھانے روز نہیں ملا کریں گے کیونکہ وہ جب بھی ماما کے ساتھ ادھر آتی تھی غزالہ آنٹی آلوؤں کے ساتھ کوئی نہ کوئی سبزی ڈال کر پکایا کرتی تھیں۔

”کوئی بات نہیں آنٹی میں سو جاؤں گی یہاں۔“ وہ کچھ دیر بعد ان کا ہاتھ ذرا سادیا کر مروت سے بولی۔
 ”بس بیٹا! دو چار دن پھر آپ کا بیڈ آجائے گا تو آپ اس پر سو جایا کرنا۔“ وہ پیار سے بولیں۔
 ”ٹھیک ہے آنٹی! میں اب سو جاؤں، مجھے نیند آرہی ہے۔“ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ وہ بہانا بنا کر بولی۔
 ”بیٹا! بہنوں سے گپ شپ نہیں لڑاؤ گی۔“ وہ بڑی اچھی Story teller ہے۔ اس سے کوئی اسٹوری سن لو۔ ابھی تو دس بھی نہیں بجے۔“ انہوں نے محبت سے اس کے بالوں کو سنوارا۔

”نہیں آنٹی! کل آج مجھے نیند آرہی ہے۔“ وہ اٹھ کر لحاف ٹانگوں پر لے کر لیٹ گئی۔
 ”اچھا چلو ٹھیک ہے سو جاؤ پھر۔“ انہوں نے جھک کر اس کا ہاتھ چوم اور کھڑی ہو گئیں۔
 ”چلو بھی، تم لوگ بھی لائٹ آف کر دو، میں کو نیند آرہی ہے، باقی صبح نماز کے بعد پڑھ لیٹا۔ میں زیر و کابلج جلا رہی ہوں۔“

ان کے اتنا کہنے پر ہی سب نے تابعداری سے کسی رو بوٹ کی طرح کتابیں بند کیں اور سائڈوں پر رکھ کر آرام سے لیٹ گئیں۔ غزالہ آنٹی نے مین لائٹ آف کر کے زیر و کابلج جلا دیا۔ کمرے میں ہلکی سبز رنگ کی روشنی پھیل گئی۔ وہ دروازہ بند کر کے باہر نکل گئیں۔

پاپا تو غزالہ آنٹی کے گھر بہت کم آتے تھے زیادہ تر ماما ہی آتی تھیں، وہ بھی ایمین یا عبیدہ کے ساتھ، فضا اور مون کو بھی وہ بہت کم لاتی تھیں وہ دونوں تو شور مچانا شروع کر دیتے تھے۔ ”ماما یہاں گرمی ہے۔ یہ گھر کتنا چھوٹا ہے، ہم کھیلیں کہاں۔ ان کے گھر میں ٹھنڈا پانی بھی نہیں ہے۔ ماما ان کا فریج ہر وقت خراب کیوں رہتا ہے۔ یہ نیا کیوں نہیں لے لیتے۔ ماما! غزالہ آنٹی نے آپ کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں جو آپ نے پچھلی عید پر پہنے تھے، نا، ہمیں نے دال نہیں کھائی اور کبابوں میں تو مرغیں بہت ہیں۔ ہم نہیں کھائیں گے۔ ریجہ آپ نے ایسی آپلی کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں نا۔“

وہ دونوں بہت منہ پھٹ تھیں۔ پاپا کے بست لاڈ لے تھے۔ ماما انہیں ڈانٹتیں، جھڑکتیں، مگھورتیں مگر ان پر ذرا اثر نہ ہوتا اور غزالہ آنٹی بے چاری شرمندہ ہو ہو جاتیں پھر ماما نے ان دونوں کو لانا ہی چھوڑ دیا۔ ایمین یا عبیدہ کو لے آئیں۔ دونوں سب کچھ دیکھ کر پہچان بھی لیتیں تو ان کی طرح بولتی نہیں تھیں۔

ماما بھی غزالہ آنٹی کے گھر خالی ہاتھ نہ آتیں۔ ڈھیروں فروٹ، مٹھائیاں، موسم کی سوغاتیں، خشک میوے، غزالہ آنٹی کا اور بچوں کا ایک ایک یا سوٹ اور بالائی ایمین اور عبیدہ وغیرہ کے کپڑے جو اچھی حالت میں ہوتے، عبیدہ نے اکثر دیکھا تھا وہ جاتے جاتے ان کے ہاتھوں میں بھی ہزار کا ایک اور کبھی دو نوٹ دے کر جاتی تھیں، ان کے ساتھ پیچھے کر دال سبزی اور کڑھی وغیرہ شوق سے کھاتیں، بچپن کے ساتھ کھل مل جاتی تھیں ان کے ساتھ مذاق کرتیں، انکل جمال کی بھی ماما بہت عزت کرتی تھیں۔ ماما کم کم ادھر آتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اتنے عرصے میں غزالہ

آنٹی کے گھر جانے کی تیاری جوڑتی رہتی تھیں پانی پانی کر کے غزالہ آنٹی سرکاری مل اسکول میں میچر تھیں اور انکل جمال بالائی اسکول میں، اور سرکاری میچرز کا جو حال ہوتا ہے وہی ان کا تھا پھر اوپر تلے پانچ بیٹیاں جنہوں نے ابھی سے ان کی راتوں کی نیند اڑا رکھی تھی۔

غزالہ آنٹی شام کو محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی تھیں اور جمال انکل بھی ٹیوشن پڑھانے جاتے تھے پھر بھی ان کا گزارہ مر مر کر ہوتا تھا کہ سارا کچھ انہوں نے آج کے لیے نہیں کھاتا ہوتا تھا، جوان ہوتی بیٹیوں کے لیے بھی کچھ پس انداز کرنا تھا۔ پہلے تو ماما کی وجہ سے بھی غزالہ آنٹی کی زندگی خاصی سہل تھی اور اب! اب کیا ہوگا۔ ”میں یہاں کیسے رہوں گی۔ اللہ تعالیٰ میں کیا کروں۔ ایک دم سے یہ سب کیا ہو گیا، ماما! پاپا دونوں چلے گئے۔ دونوں میں محبت تو مثالی تھی مگر یہ تو کبھی خیال بھی نہیں گزرا تھا کہ اس درجہ ہے کہ دونوں اکٹھے ہی۔“

اس کے منہ سے سسکی نکل گئی وہ لحاف میں منہ سر چھپائے بیٹھی تھی۔
 ”اب اس طرح رہنا انکل اور آنٹی پر بوجھ بن کر پانچ کی جگہ چھ بوجھ اور پھر ساری عمر کے لیے کاش ہم اپنے گھر جاسکتے، ہم اکٹھے رہ سکتے، مون کیسا ہوگا؟ فضا، فضا کتنا دور رہی تھی کتنا ڈری ہوئی تھی وہ اور ایسی کو تو کتنا بخار تھا پتا نہیں اس کا بخار ٹھیک ہوا کہ نہیں، اس کو تو بخار بھی چڑھتا تھا تو کئی کئی دن نہیں اترتا تھا، پاپا کے دوست ڈاکٹر نصیری اسے ٹریٹ کرتے تھے مگر وہ تو اسپیشلسٹ ہیں۔ تایا جی کہاں دکھاتے۔ ماما ایسی بہت بیمار ہے اور میں یہاں ہوں، مون کہاں ہوگا، ہم کیا کریں۔ ماما ہمیں اپنے پاس بلا لیں۔“

آنسو تو اتر سے بہنے لگے۔
 ”فضا کا کیا حال ہوگا۔ مجھے پتا ہے وہ بہت ڈر بوک ہے۔ کسی سے کچھ نہیں کہے گی۔ اللہ تعالیٰ میری بہن کو اچھا رکھنا، عاکف چچا اسے پیار سے رکھیں۔ ماما کہتی تھیں۔ میری انھی تو پیار کا پھول ہے۔ جو صرف محبت اور توجہ کی ہوا میں کھلتا ہے۔ ذرا سی بے توجہی، بے گانگی پر تو یہ مر جھا جاتا ہے۔ سکندر آپ اس کا خیال رکھا کریں۔ اور اب! اب اس کا خیال کون رکھے گا۔ ماما ہم بھی نہیں۔ میں کیا کروں کاش اسے اپنے پاس رکھ سکتی۔ ماما یہ کیا ہو گیا ہمارے ساتھ۔“

اس کا لحاف اس کی ہچکیوں سے مل رہا تھا۔

عبیدہ اور ایمین جتنا فضا کو ڈر بوک اور بزدل سمجھتی تھیں۔ وہ ان کے اندازوں سے کیسی بڑھ کر سمجھتی ہوئی تھی۔ ایک تو اتنا بڑا حادثہ پھر پے در پے زخم، ایسی آپلی کی تایا جی کے ہاتھوں پٹائی۔ مون کا طویل بخار، سب لوگوں کی ترس، آمیز رنگاں اور بیزار رویے، وہ اور ہی سہم کر رہ گئی تھی۔ عاکف چچا کو تو اس نے اپنے ہوش میں صرف دو بار اپنے گھر آتے دیکھا تھا ان کا رویہ بچوں کے ساتھ بے حد سرسری سا ہوتا تھا اور فضا کو تو یقین تھا کہ عاکف چچا کو کم از کم اس کا نام نہیں معلوم ہوگا، اور اس کا یہ اندازہ درست نکالنا پلیس کے سفر کے دوران انہوں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ صرف اپنا بریف کیس کھول کر انگریزی ٹائپ شدہ کانڈول کا پلندہ آگے رکھے پورے انتہاک سے بڑھتے رہتے تھے صرف ایک بار ایئر ہو سٹس کے آنے پر انہوں نے اس کے لیے جوس لیا تھا، خود انہوں نے وہ بھی نہیں پیا تھا اس کے بعد پھر وہ ان کانڈول میں ڈوب گئے تھے۔ وہ چپ چاپ جوس گھونٹ گھونٹ اندر اتارتی رہی تھی۔ ایر پورٹ پر ان کا ڈرائیور گاڑی لے کر آیا تھا۔ کراچی میں گھر سے ایر پورٹ تک انہوں نے اس کی انگلی تھامے رکھی تھی۔ اور اب جہاز سے اترتے ہی ان کا رویہ مزید اچھی ہو گیا تھا وہ ان کے تیز قدموں کا ساتھ دینے کے لیے تقریباً ”ڈو ڈری“ ڈو ڈری تھی۔ ڈرائیور نے پچھلا دروازہ ان کے لیے کھولا۔ انہوں نے ذرا سا کھسک کر اس کے لیے جگہ بنائی۔

”آجاک۔“ مہ حنفی جملہ یا فقرہ جو انہوں نے ان تین گھنٹوں کی ہمراہی کے دوران بولا تھا اسے خوش کر گیا۔ وہ

سمٹ کر کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی۔

وہ کھڑکی سے باہر کے نظاروں میں مگن تھی۔ بھاگتی دوڑتی دنیا بھی کیا عجیب چیز ہے انسان کتنا ہی خود میں مگن کیوں نہ ہو وہ کچھ دیر کے لیے اس کی توجہ ضرور اپنی طرف مبذول کرتی ہے کوئی ان نظاروں میں کھو جاتا ہے۔ کوئی آکٹا کر منہ موڑ لیتا ہے اور منہ موڑنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔

لاہور وہ صرف ایک بار ماما بابا کے ساتھ آئی تھی۔ پچھلے سال بابا کے کسی دوست کی شادی تھی وہ لوگ دو دن لاہور میں رہتے تھے۔ اس وقت وہ عائف چچا کی طرف نہیں گئے تھے۔ صرف ماما اور بابا جا کر ان سے مل آئے تھے۔ بابا نے انہیں دو دن میں آدھالاہور گھما دیا تھا جو اے لینڈ اسکاٹ لینڈ میکڈونلڈز مینار پاکستان شاہی قلعہ بادشاہی مسجد اور ریس کورس ٹائم کم ہونے کی وجہ سے کئی مقامات رہ گئے تھے جس کا بابا نے نیکسٹ ٹائم دیکھانے کا وعدہ کیا تھا۔ جو اب بھی ایفا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے پھر سے بابا یاد آنے لگے بابا سب سے زیادہ اسی سے پیار کرتے تھے مون سے بھی زیادہ اور سب کہتے تھے فضلہ تو بالکل سکندر کی ڈپٹی کیٹ ہے۔ وہی براؤن آنکھیں باداموں جیسی براؤن بال سنہری رنگ اور چہرے کا بھولہ پن سب کو اس کی طرف متوجہ کر لیتا تھا۔

”ہاں مجھے یاد آیا تمہارا نام عبیرہ ہے نا؟“ عائف چچا کی اچانک آواز پر وہ اچھل ہی پڑی یا دلوں کے بھنور میں الجھا اس کا دل زور زور سے دھڑکا تھا۔ ماما کہتی تھیں یہ ہے ہی ایسی ڈرپوک سی کوئی اوپکی آواز میں بلا لے۔ اس کی چیخ نکل جاتی ہے۔

”جی جی۔۔۔“ اس نے بمشکل تھوک نکلا۔

”ہوں!“ وہ پھر باہر کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ گھر آنے تک کوشش کے باوجود انہیں یہ بتائی نہ سکی کہ وہ عبیرہ نہیں فضلہ ہے۔ اپنی بے بسی پر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس طرح اپنا تعارف کرانے کا بھی موقع ہی نہیں آیا تھا بابا ماما کی آئی اور عبیرہ آئی سب اسے بڑے لاڈ بڑے فخر سے متعارف کراتے تھے۔

”یہ ہماری فضی ہے“ فضلہ سکندر کتنی پیاری ہے“ ہے نا اور ہم میں سب سے زیادہ ڈرپوک اور بے وقوف۔“ عبیرہ آئی کے ان کمشنس پر اس کی آنکھیں ایک پل میں موٹے موٹے آنسو تیار کر لیتی تھیں جس پر انہیں بابا سے ڈانٹ پڑتی تھی۔

”نہ فضی! مجھے بتاؤ تمہارے اندر کون سی فیکٹری فٹ ہے جو اتنے ارجنٹ نوٹس پر دھڑا دھڑیہ موٹے موٹے آنسو تیار کر کے آنکھوں سے باہر روانہ کر دیتی ہے۔“ ایسی آئی اس کے ”فی الہدیہ آنسوؤں“ کا مذاق اڑاتی وہ اور رونے لگ جاتی اور اب۔۔۔؟ اس کی آنکھوں نے فوراً ”دو موٹی پکا دیے۔“

گاڑی وائٹ گیٹ کے آگے ہارن بجار ہی تھی۔

اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ پتا نہیں آئی اس کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہیں؟ اس نے تو صرف انہیں ایک بار دیکھا تھا ماما جی کے گھر۔ ”انتہائی خوبصورت اور انتہائی مغرور۔“ یہ سفینہ پھوپھو اور ماما جی کے مشترکہ ریمارکس تھے جو انہوں نے نرگس آنٹی کے بارے میں دیے تھے اور اب؟ اس کی نگاہیں گیٹ کھلنے کی منتظر تھیں۔

دنیا اور فیمنال واقعی گریوں جیسی تھیں گوری جیسی موٹی آنکھوں والی پھولے پھولے فراکوں میں ان کے گول مٹول جسم اور بھی صحت مند لگ رہے تھے۔ ان دونوں نے مون کا بڑی محبت اور خوشی سے استقبال کیا تھا وہ نہ انکل کے ساتھ مون اور پھوپھو کو لینے اور پورٹ آئی تھیں کوئیر انکل کا انداز لیا دیا تھا بہت فارل قسم کا اس میں وہ بے ساختگی اور گرمجوشی نہیں تھی جو پھوپھو دنیا اور فیمنال کے رویوں میں تھی۔ چھوٹے بچے رویوں کے فرق کو بڑی جلدی اور اچھی طرح پرکھ لیتے ہیں۔ اسے بھی فوراً اس کا احساس ہو گیا تھا اسی لیے وہ زبیر انکل سے کچھ

کاف سا ہو گیا تھا۔

سفینہ پھوپھو کا گھر بہت خوبصورت تھا اسٹائلش اور جدید سولتوں سے مزین۔ فیمنال اور دنیا نے اس کا کمرہ اپنے کمرے کے ساتھ ڈیکوریٹ کیا تھا چھوٹا سا کمرہ کھلونوں اور پوسٹرز سے سجا ہوا تھا اس کے سنگل بید پر بلی پنک کلر ڈرائس والی بید شیٹ پچھی تھی اور اسی کلر کے پردے تھے قالین ریڈ کلر کا تھا۔

”یہ مون تمہارا کمرہ ہے“ ڈو پولا نیک اس؟ ہم نے خود اسے ڈیکوریٹ کیا ہے۔“ دنیا ہاتھ پکڑ کر اسے کمرے کی بابائی تھی۔ اور بڑے فخر سے بتا رہی تھی فیمنال اور پھوپھو ان کے چچھے کھڑی تھیں۔

”لیکن میں تو اکیلا نہیں سوتا میں تو فضی کے ساتھ سوتا تھا اور جب وہ ڈر جاتی تھی تو پھر دونوں ماما اور بابا کے ہاتھ۔“ کمرہ دیکھ کر دل خوش ہوا تھا مگر اکیلے سونے کی پریشانی بھی ہوئی تھی۔

”تو کیا ہوا؟ میں تمہارے کمرے میں سو جایا کروں گی چند دن بعد جب تمہیں عادت ہو جائے گی تو تم اکیلے سو جایا کرنا۔“ دنیا جھٹ سے بولی ”یہاں سب کے علیحدہ رومز ہیں“ میرا فیمنال کا بابا اور ماما کا ایک ہی ہے۔ تمہیں ابھی گھائیں گے۔“

”جی نہیں“ مون کے ساتھ میں سوؤں گی، تم اپنے کمرے میں سو کرنا۔“ فیمنال جلدی سے آگے اگر دنیا سے بات جی نہیں تم تو خود ڈرپوک ہو اسے بھی ڈراؤ گی۔“ دنیا مون کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔

”تم ہو گی ڈرپوک“ میں تو بہادر ہوں جب ماما پاکستان گئی ہوئی تھیں تو رات کو اٹھ اٹھ کر بابا کے پاس کون جاتا تھا بابا مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ فیمنال نے اسے فوراً یاد دلایا۔

”ہاں تو اب ماما یہاں ہیں نا اب تو میں نہیں ڈروں گی۔“ دنیا سنبھل کر بولی۔

”فضول کی بحث کوئی نہیں سوئے گا مون کے ساتھ۔“ پھوپھو آگے بڑھ کر بولیں میں سوؤں گی اپنے بیٹے کے ہاتھ پھر یہ بہت جلد خود سونے کا عادی ہو جائے گا۔ ابھی اس کا اسکول میں ایڈمیشن بھی کروانا ہے۔“ پھوپھو نے گے بڑھ کر اسے پیار کیا۔

”سوری پھوپھو۔ ماما!“

”جی دیری گڈ۔ ماما انوسنٹ چائلڈ۔“ سفینہ نے اسے جھک کر گود میں اٹھالیا۔

”ماما! میرے اسکول میں داخل کرائیے گا مون کو۔“ دنیا فوراً بولی ”میں اپنی سب فرینڈز کو بتاؤں گی کہ مون میرا بے۔ اب یہ یہیں رہے گا ہمارے پاس ہے نا ماما۔“

”بالکل۔۔۔“ سفینہ نے ذرا سا ہنس کر کہا۔

”ماما! مون میرے اسکول میں داخل ہو گا“ دنیا کے اسکول میں تو بڑے بڑے بچے ہوتے ہیں یہ تو مونٹیسوری جائے گا۔ میرے اسکول ہے نا۔“ فیمنال سفینہ کا بازو ہلا کر بولی۔

”ہاں بھی“ مون ابھی مونٹیسوری میں جائے گا بعد میں تم تینوں ایک ہی اسکول میں ہو گے یعنی دنیا کے ساتھ ٹھیک ہے نا۔“ وہ دنیا سے بولیں۔

”جی ٹھیک ہے۔“ وہ منہ بسور کو بولی۔

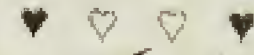
گیا اب سارا دن ان ہی جو بچکوں میں گزار دینا ہے۔ اتنا ٹائم ہو گیا ہے بھوک کی وجہ سے برا حال ہو رہا ہے۔ کوئی خیال ہے۔ پورے ڈیڑھ ماہ بعد تو محترمہ تشریف لائی ہیں۔ ”چانک عتب سے انکل زبیر کی روکھی آواز دہکی تو سفینہ نے فوراً ”مون کو نیچے اتار دیا۔“

”یہ بچیاں مون کو اس کا کمرہ دکھانے لے آئی تھیں۔“ وہ کچھ معذرت خواہانہ انداز میں بولیں اور باہر کی طرف بڑھ گئیں۔

”مومن کہیں بھاگا جا رہا ہے نہ اس کا کمرہ اب یہ ہیں ہے تو پھر یہ بے مبری کیسی۔“ وہ اسی بیزار اور سرد لہجے میں بولے ”مومن جلدی سے کھسک کر فیماں کے قریب ہو گیا۔“

”چلو تم دونوں بھی ابھی ہوم ورک بھی کرنا ہے۔ یونٹ آنے والی ہیں آپ کی۔ کھانا کھا کر پڑھنے بیٹھو۔“

وہ فیماں اور دنیا سے ذرا فٹ کر بولے تو وہ دونوں گھبرا کر اس کے پیچھے باہر نکل گئیں۔ مومن کچھ دیر کھڑا رہا جب انکل زیریا ہر نکل گئے۔ تو وہ بھی ڈھیلے قدموں سے ان کے پیچھے چل پڑا کارڈور میں انہوں نے سردی اجنبی نگاہ مڑ کر اس پر ڈالی اور پھر کندھے جھٹک کر آگے بڑھ گئے۔ اس کے تھمے سے دل پہ اوس گر گئی۔



”اب روز روز چکن گوشت، قیمہ میں تو نہیں افورڈ کر سکتا۔ سارے حالات تمہارے سامنے ہیں یا تو میں تم سے کچھ چھپاتا ہوں یا الگ رکھتا ہوں تو تم الزام بھی دو۔ کس کا دل نہیں چاہتا یہ سب پکانے کو اپنے بچوں کو کھلانے کو کتنا دل دکھتا ہے۔ جب میں کوشش کے باوجود انہیں صرف وال اور سبزیاں ہی مہیا کرتا ہوں۔ لیکن میں کیا کر سکتا ہوں رزق حلال میں تو یہی کچھ ممکن ہے اور پھر آج کی وحشت انگیز منگانی کے زمانے میں اگر ایک سرکاری اسکول ٹیچر عزت و آبرو سے وال روٹی بھی اپنے بچوں کو کھلا سکتا ہے تو یہ بھی کارنامہ ہے میں شمار ہوتا ہے تم خود سوچو۔“ انکل جمال ایک گہری سانس لے کر چپ ہو گئے۔

”جمال! میں کیا کروں مجھے بھی تو بتائیں“ ابھی اس کا زخم تازہ ہے، سنبھلنے میں کچھ وقت لگے گا پھر خود ہی آہستہ آہستہ ایڈ ہو جائے گی۔ سمجھ دار ہے خود ہی سمجھ جائے گی۔ لیکن ابھی میں اسے اس بات کا احساس دلانا نہیں چاہتی کہ وہ ہم پر بوجھ ہے اور۔“

”یہ احساس تو تم اسے خود بخود دلانی ہو اپنی گنجائش سے بڑھ کر اس کی خاطر تواضع کر کے غزالہ اب اس نے ہمیں رہنا ہے۔ دو چار دن کے لیے نہیں رہنا ہے۔ دو چار دن کے لیے نہیں آئی وہ جو تم ان تکلفات میں پڑو۔ سمجھ دار ہے تمہارا ذرا سا اشارہ بھی سمجھ جائے گی۔ میرا خود دل نہیں چاہتا کہ شہلا کے بچے اس طرح زندگی گزاریں اب کیا کر سکتے ہیں۔“

انہوں نے تو بچوں کو پھولوں کی بیج پر رکھا تھا اب زندگی انہیں خالق کے کانٹوں میں دھکیلنا چاہ رہی ہے تو میں یا تم اسے فرو نہیں کر سکتے۔ کوشش کر سکتے ہیں کہ ان کانٹوں کی موجودگی کے باوجود ان کی زندگی کو کچھ سہل بنا سکیں۔ خالق کی تلخی ان چکن کبابوں یا گوشت سے کم نہیں ہو جائے گی انہیں زندگی اتنا بڑا ہاتھ دکھا چکی ہے کہ ساری دنیا کے خزانے اور عیش مل کر بھی اس کی تلافی نہیں کر سکتے یہ حکم رہتی ہے اور اسے کوئی نہیں ٹال سکتا۔ سوائے اسی رب کے عبیدہ کو تم گھر کے ماحول میں کس کرنے کی کوشش کرو۔ اسے محبت اور اچھی تربیت دو اچھے اخلاق اور اچھے کردار کا شفاف آئینہ بناؤ۔ ان ابدی نعمتوں کے مقابلے میں لمحاتی نعمتیں کچھ معنی نہیں رکھتیں یہ باتیں تم مجھ سے زیادہ سمجھتی ہو پھر یہ سب۔“ وہ جیسے تھک کر چپ کر گئے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

ابھی نیا نیا صدمہ ہے کوشش تو کر رہی ہوں بچیاں مجھی اسے بھرپور محبت اور توجہ دینے کی کوشش کر رہی ہیں مگر وہی آپ کی بات صحیح ہے کہ جتنا بڑا نقصان ان کا ہو چکا ان چیزوں سے اس کی تلافی ممکن نہیں لیکن ابھی ان کے تھکے ذہن اس خسارے کی نوعیت کو سمجھنے سے قاصر ہیں اب اگر میں اس پر ناپسندیدہ کھانے بھی ٹھونس دوں تو سوچیں اس کے معصوم دل پر یا گزرے گی۔ پہلا تکلیف وہ احساس اسے ان لذتوں سے محرومی کا ہو گا۔ کیا کوں جمال مجھ سے یہ نہیں ہوتا۔ مجھے لگتا ہے وہ ماں باپ کے شہلا کی سوچ کے میں اس کی پھولوں کی نازک گہرائی کی چند دن بھی تواضع نہ کر سکی۔ کچھ میسے ہیں میرے پاس آپ لے جائیں۔ یہ مہینہ تو نکالیں پھر بعد کی بعد میں سمجھیں گے ابھی اس کا اپنے اسکول میں ایڈمیشن کرانا ہے کہ اسی سے خاصی چپ چپ ہے افسوس میں کچھ بھی نہیں

کر سکتی چاہتے ہوئے بھی ”غزالہ آنٹی کا لہجہ افسوس بھرا تھا۔“

”ساری بچت تو لگ چکی اب کیا پڑا ہے تمہارے پاس؟“ جمال انکل تلخی سے بولے۔ ”اور ہاں جس طرح کا بیڈ تم اس کے لیے پسند کر کے آئی تھیں وہ تو دس ہزار سے کم پر مان نہیں رہا بہت اصرار کے بعد ڈیڑھ ہزار کم کیے ہیں اس نے اس کا تو یہ مطلب ہے کہ میں کم از کم اپنی تین بچیوں کے گلے ٹھونٹ دوں یا ان کو سمندر کے حوالے کر آؤں یا پھر پورے دو مہینے آٹھ افراد پر مشتمل یہ کنبہ مکمل فاقہ کشی کرے پھر وہ بیڈ آسکتا ہے مجھے بتاؤ، تمہیں ان دونوں رشتوں میں سے کون سا پسند ہے۔ وہ اختیار کر لیتا ہوں۔“ انکل جمال کی لہجے میں تلخی غصہ اور بیزاری تھی۔

اس سے زیادہ اس سے کچھ نہ سنا گیا۔ وہ چپکے سے کھڑکی سے ہٹ کر اندر کمرے میں جا بیٹھی۔ وہ تو اتنے دنوں سے اپنے ہی غم میں الجھی ہوئی تھی۔ اسے تو احساس ہی نہیں تھا کہ اس کے دو چار اچھے نوالوں کی قیمت یہ خاندان کس صورت میں چکا رہا ہے اتنی سی عمر میں کب اندازہ ہوتا ہے۔ مٹن اور چکن کتنے کلو مٹا ہے یا آج کل انار کیلوں کی نسبت کتنے کتنے ہیں یا آٹس کریم اور کولڈرنگ کھانے پینے کی بنیادی ضروریات سے ہٹ کر کیا عیاشیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اس عمر میں تو بس جو چیز نگاہ کو بھلی لگتی ہے جس کو دل طلب کرتا ہے بس وہی کھانے کو جی چاہتا ہے اور پھر جب روپے پیسے کی بھی فراوانی ہو اور خدا کے فضل کی بھی تو پھر اتنی سطحی اور عامیانہ سی باتیں کون کون سوچ سکتا ہے اسے آلو پسند نہیں تھے ماما اس کے لیے کباب فرانی کر لائیں یا ڈرم اسٹیکس آجائے اور کچھ نہیں تو پاپا اس کے لیے پرائے آتے ساتھ میں پیسی تو لازماً ہوتی تو اسے لگتا کہ آلو اور وال کا متبادل پڑایا چکن بیٹن ہیں اگرچہ کبھی کبھی ماما اسے ڈانٹ دیتیں کہ اگر کل کو تمہیں آلو کھانا پڑے تو کیا کرو گی، وہ فوراً ”جواب دیتی“ ماما میں بھوک رہی ہوں گی مگر آلو نہیں کھاؤں گی۔“ اور اس وقت تو اس کے سامن گمان میں بھی نہیں تھا کہ بھوک ہوتی کیا ہے اور یہ دنیا کے ملک ترین ہتھیاروں سے زیادہ خطرناک زیادہ تباہ کن ہوتی ہے جب اس کا غلبہ ہوتا ہے تو اشرف المخلوقات اپنی جلد منھس سے بہت نیچے حیوانیت کے درجے کو چھو لیتا ہے پیت کا دونخ آگ کے دونخ سے زیادہ شدید اور ناقابل برداشت ہوتا ہے اس کا احساس صرف اسے ہوتا ہے جو اس کو سستا ہے ورنہ تو پوری دنیا اناج سے بھری ہوئی ہے لیکن اس سب کے لیے تو نہیں کچھ لوگوں کو تو اس میں سے محض زندہ رہنے کے لیے ٹھوڑے سے ایندھن کے لیے بھی جان لڑا دینا پڑتی ہے۔

اور غزالہ آنٹی اور انکل جمال پانچ بچوں کے اس کنبے کے اس دونخ کو جس طرح دن رات ایندھن فراہم کر رہے تھے اسے اب اس کا اندازہ ہو رہا تھا اور اس کے لیے اپنی ساری بچت اور پس انداز کی ہوئی رقم کو جس طرح خرچ کر رہے تھے محض اس کی زبان کے چپکے کو پر قرار رکھنے کے لیے وہ کن تکلیف دہ مراحل سے گزر رہے تھے۔ اس سے پہلے اس کا اندازہ ہو جاتا۔ یہ لوگ کیا سوچیں گے کہ شہلا اور سکندر نے اپنے بچوں کی اس طرح سے پرورش کی تھی کہ کل کو اگر انہیں آسائشوں کے بغیر جینا پڑے تو وہ دوسروں کی زندگیاں اجیرن کر دیں گے اور ماما جب ان کی باتیں۔ اپنے ساتھ غزالہ آنٹی کی سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لیے سو طرح کے اسباب لائیں انہیں ہاتھ سائیڈ کر کے ہزار کے نوٹ تھمائیں، آج ان کی بیٹی اس طرح ان پر زور آزمائش بن کر آئی ہے۔ تلخی بری بات ہے مہربانہ تمہاری خاطر اپنے بھرم کی خاطر یہ کتنی تکلیفوں سے گزر رہے ہیں۔ تانیہ اور توبہ بھی تو میری ہم عمر ہیں وہ انکو اور وال دیکھ کر منہ نہیں بناتیں۔ کہ ہم نے نہیں کھانا ہمیں نہیں پسند وہ اتنی رغبت سے یہ سب کھاتی ہیں بے آسمان سے من و سلوی اتر رہے اور اتنی شدید سردی میں نیچے زمین پر گدے۔ بچھا کر ایسے سولی ہیں جیسے سخت ٹوک پر فروکش ہوں اور میں۔؟

انہی نعمتوں میں پلی اندر سے اتنی بھوکی اتنی ندیدی ہوں کہ دسترخوان پر وال کے ہوتے ہوئے ان بے چاریوں کا احساسات کی پروا کیے بغیر مظلوم صورت بنا کر غزالہ آنٹی کی پیش کردہ پلیٹ سے صرف چکن اور کباب ہی کھاتی

ہوں، کیا میرے ماں باپ کو انہوں نے مارا ہے جو یہ سزا بھگتیں جو دن ہم پر آئے ہیں، کیا ان کی وجہ سے آئے ہیں جو میں کسی کا خیال نہ کروں اور ماما کہتی تھیں کہ بیٹا زندگی اتنے برے دنوں کا مجموعہ ہے، اتنے دن تو سب ہی ہنس کھیل کر خدا کا شکر ادا کر کے گزار دیتے ہیں۔ مزہ تو تب ہے جب برے دنوں میں بھی چہرے سے کسی کو علم نہ ہو کہ ہم کیسے حالات سے گزر رہے ہیں۔ اس حال میں بھی آنکھیں اور چہرہ خدا کا شکر خدا سے راضی ہونے کی گواہی دے اور یہ گواہی ہنسی خوشی اور طمانیت ہی میں تو ہے۔“

اس وقت گرم بستر میں لیٹ کر ماما کی باتیں سننا کتنا اچھا لگتا تھا اور ہم ہنسنا سوچے سمجھے جھٹ سے ان کی اچھی باتوں کو اپنانے اور عمل کرنے کا وعدہ کر لیتے تھے یک زبان میں ”آئی پر اس ماما“ یہ جانے بغیر کہ اس پر اس کو Frelo (ثابت) کرنے کے لیے جان کو کن جو کھوں سے گزرتا رہے گا۔

لیکن کیا ہوا ”آلوہی تو کھانے ہیں“ دال نہیں پسند تو کیا ہوا ”نیچے زمین پر سونا اتنا مشکل تو نہیں اور پھر توبہ کتنی اچھی کہانیاں سنائی ہے“ سنتے سنتے نیند آجاتی ہے۔ اور نیند میں کیا پتا چلتا ہے کہ نرم گرم بیڈ ہے یا زمین اور سرکاری اسکول میں پڑھنا اتنا برا تو نہیں غزالہ آنٹی کی سب بیٹیاں وہیں پڑھتی ہیں اور پھر نہ پڑھنے سے تو بہتر ہے کہ بندہ کم از کم پڑھ تو لے۔ عام ہونا، غریب ہونا تو بری بات نہیں۔ ہاں چور ڈاکو ہونا بری بات ہے اور گناہ گار ہونا بری بات ہے اور عزت گناہ تو نہیں اور ماما کہتی تھیں کہ غربت تو نبیوں کا شیوہ ہے سب پیغمبر پوریا نشین اور عام انسان تھے اور جب ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زمین کے سب خزانوں کی کنجیاں پیش کی گئیں تو انہوں نے غربت کو ترجیح دی بھی غریب ہونے کا مطلب ان کی سنت کی پیروی کرنا ہے اور یہ تو بڑے فخر کی بات ہے رونے کی بات تو نہیں۔“

اس نے آنکھ سے ہنسنے والے آنسو کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے بوجھا۔

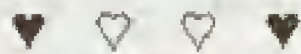
”ہاں اب میں بالکل ان لوگوں کو شک نہیں کروں گی، ماما اور پاپا کی اچھی تربیت کو سامنے لاؤں گی اب میں چیزوں کے لیے کبھی نہیں روؤں گی۔ ماما آئی پر اس یو۔“

اس نے خلا میں مسکراتی ماما کو دیکھ کر وعدہ کیا تو اسے لگا ”ماما نے آگے بڑھ کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا ہے۔ خوشی اور بے بسی سے پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔“

”رونا نہیں عبیرہ! بزدل روتے ہیں۔“ ماما نے مسکرا کر ڈانٹا تو وہ فوراً ”آنسو پونچھ کر کھڑی ہو گئی۔“

”ہیس ماما! بزدل روتے ہیں اور آپ کی بیٹی بزدل نہیں۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ رگڑ کر باہر کی طرف بڑھی۔

ہاں ایک گلہ اسے ماما پاپا سے تھا کہ انہیں اپنے بچوں کو اس طرح لاڈ سے نہیں رکھنا چاہیے تھا ان کی ہر خواہش کی تکمیل کو اپنا ایمان نہیں بنانا چاہیے تھا کہ جب اس طرح ماں باپ کے لاڈ لے دینا کے ہتھے چڑھتے ہیں تو دنیا ان سے بہت برا سلوک کرتی ہے اور انہیں بزدل نہ ہوتے ہوئے بھی رونا پڑتا ہے۔



اسے لاؤنج میں صوفے پر بیٹھے آدھ گھنٹہ ہو چلا تھا۔ عاکف چچا اسے ادھر بٹھا کر خود نامعلوم کدھر چلے گئے تھے۔ اسے تو اب بھوک بھی لگ رہی تھی اور پیاس بھی مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اٹھ کر کدھر جائے کس سے اپنی ضرورت کا اظہار کرے، آخر بیٹھے بیٹھے وہ تھک گئی۔ اتنی بڑی کوٹھی میں ہو کا عالم تھا صرف گیٹ کے پاس چوکیدار اور مالی نظر آئے تھے یا پھر ڈرائیور جو انہیں لے کر آیا تھا وہ بھی عاکف چچا کا بریف کیس اٹھا کر غراب سے اندر نہیں غائب ہو گیا تھا اسے لاؤنج میں بٹھا کر عاکف چچا غائب ہو گئے تھے۔ پہلے تو اس نے ان کے جانے کے بعد صم صم آواز میں رونا شروع کر دیا اس پندرہ منٹ میں خوب جی بھر کر آنسو بہائے پھر تھک کر خود ہی چہرہ صاف کر لیا کوئی بھی تو اس کے آنسو پونچھے نہیں آیا تھا۔ کسی نے رونے پر اسے آکر گلے سے نہیں لگایا تھا گھر میں تو اس کی آنکھ سے ٹکا ایک آنسو بھونچال لے آتا تھا ایسی آبی اور عبیرہ آبی کی شامت آجاتی تھی کہ کس نے اسے کچھ کہا ہے پاپا

باقاعدہ ان کی کلاس لیتے تھے اس کی تو کلاس ٹیچر کی ہمت نہیں تھی کہ اسے مارنا تو دور کنارا اسے ڈانٹ بھی دیتا پلایا دوسرے چوتھے روز اس کی پرہیزگار سے ملنے جاتے تھے اس کی پروگریس چیک کرتے اور ساتھ یہ ہدایت ضرور دے کر آتے تھے کہ۔

”میری فضلہ بہت حساس ہے اپنی ٹیچرز سے کہیں گاکہ اسے ذرا سا گھور کر بھی نہ دیکھیں ورنہ وہ ڈر کر ساری رات روتی رہتی ہے ہاں اگر اسٹڈیز میں کچھ پرابلم ہو آپ پلیز ان سے کہیں اس کی ڈائری پر لکھ بھیجیں لیکن اسے ڈانٹیں نہیں۔“

پرنسپل صاحب سکندر صاحب کی اس درجہ محبت پر فیس پڑتے۔
”سکندر صاحب! فضلہ سکندر کو ڈانٹ کر بے چاری ٹیچر نے اپنی روزی پر لات نہیں مارنی ڈونٹ وری فضلہ کا نہیں تو اپنی جاب کا بہر حال وہ ضرور خیال کریں گی۔“

اور شاید اس نے اپنی آٹھ نو سالہ زندگی میں کوئی چارپانچ باری آنسو بہائے ہوں گے اور اب پاپا ماما کے بعد وہ کتنا روچکی تھی۔ ان کے سامنے اتنا روتی تو شاید وہ اسے خوش کرنے کے لیے زمین آسمان ایک کر دیتے۔
”ماما! پاپا! میں کیا کروں کوئی بھی نہیں ہے جو مجھے چپ کرانے نہ ایسی آلی نہ عبیدہ آلی اور مون تو میرا دوست تھا نا اسے بھی پھپھو لے گئیں ہم اب کبھی نہیں ملیں گے۔“ آخری خوف بھرے خیال سے اس نے پھر رونا شروع کر دیا۔

”میں کہتی ہوں ایک تو تم اپنی بھانج اور بھائی کا سوگ منانے کو پورا مہینہ گھر اور پرنس کی پردا کیے بغیر ادھر بھاگتے رہتے تھے جب دیکھو محسوس کراچی کا بخار چڑھا ہوا تھا۔ اب اس کے اترنے کی کچھ امید پیدا ہوئی تھی تو تم اس مصیبت کو اٹھا لائے ہو کیا ادھر کراچی میں یمیم خانہ کوئی نہیں تھا یا سارے ایدھی سینٹرز بند ہو گئے جو تم اسے ادھر لے آئے سینے سے لگا کر۔ برا مزاج تھا سکندر اور شہلا بی بی کا زندگی میں تو کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا تھا انہوں نے لاہور آتے ہی فون کھڑکا دیتے، ہم فلاں ہوٹل میں ہیں ملنے آجاؤ اور تم کیسیوں کی طرح بھاگے جاتے تھے۔ اب کیوں ان کی اولاد کو اٹھائے ادھر لے آئے ان کی روحیں نہ تڑپی ہوں گی اب کیا اتنا نہ چھوڑ کر گئے کہ اولاد مل بیٹھ کر چار دن کھا ہی لیتی، تم لوگوں نے جھٹ بچوں کی بندر بانٹ کر دی۔ اب ان کا غور اور منتھا کیا ہوا کیا ایک ٹینٹ میں ہی سارا مال پیسہ قما ہو گیا جو اس طرح ادھر ادھر بھڑکریوں کی طرح ان کی اولاد کو بھانک دیا۔“

پتا نہیں کوئی عورت تھی لاؤنج کے باہر کیا تھا کوئی کمرہ کارڈور جو کچھ بھی تھا آواز اتنی قریب تھی کہ ایک ایک لفظ فضلہ کی سماعتوں کو چیرتا ہوا اس کے اندر ترانہ ہو گیا تھا۔ لفظوں کی کاٹ نے اسے جیسے پل بھر میں زخمی کر دیا تھا وہ صوفے پر اور بھی سہم کر بیٹھ گئی تھی۔ یہ یقیناً ”نرگس“ آئی ہوں گی عاکف بچا کی کروڑ پتی بیوی وہ ایسی ہی ہو سکتی ہیں اس کے دل نے قیاس کیا۔

”کیا ہو گیا ہے نرگس تمہیں؟ آہستہ بولو بچی سن لے گی کیا سوچے گی۔ اب اس سارے میں اس بے چاری کا کیا قصور؟“ عاکف بچا کا نرم نرم گھگھایا ہوا التجہ اس کے قیاس کو کنفرم کر گیا۔

”آہستہ بولو بولو آہستہ بولو۔“ میرا گھر ہے تمہارے باب کا گھر نہیں جو تمہارے احکام مانوں میں اور اگر کچھ سوچتی ہے تو موبی رہے بھاڑ میں جا کے میری طرف سے بھی تمہیں صاف صاف بتا رہی ہوں اسے جہاں سے اٹھا کر لائے ہو وہیں پھینک آؤ جا کر۔ میں اس قسم کے فلاحی کام اس حد تک پریکٹیکل نہیں کرتی۔ وہاں نہیں لے جا سکتے تو یہاں بھی اچھے خاصے یمیم خانے اور چائلڈ ویلفیئر سینٹرز ہیں۔ جا کر وہاں اسے چھوڑ دو میں اسے اس گھر میں نہیں رکھ سکتی۔ فضول کا ہیڈک۔ اس کے ماں باپ کو ہم نے نہیں مارا ہے جو ہم سزا جھیلیں۔ اگر اس کا کوئی قصور نہیں تو ہمارا بھی کوئی قصور نہیں سمجھے پرتی مجھے ایک بات بتاؤ۔“

عاکف بچا کی ہر گھگھکیا ہٹ کاوٹوک جواب دیتے ہوئے وہ پل بھر کو رکیں۔

”تم اسے لائے کیسے ہو؟ میری اجازت میرے مشورے کے بغیر۔ تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں اسے ایسی خوشی یہاں رہنے کی اجازت دے دوں گی عاکف! تم نے ایسا سوچا بھی کیسے؟“ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے شوہر سے نہیں کسی اپنی درجے کے ملازم سے بات کر رہی ہوں۔

”نرگس پلیز! اپنے رویے میں ٹھیک پیدا کر۔ بے چاری اس وقت بے سہارا ہے۔ ہم نے کون سا بہت کچھ کرنا ہے اس کے لیے اتنا بڑا گھر ہے کسی کو نے میں تھوڑی سی جگہ دے دو ٹھیک نہیں کرے گی۔“ وہ منت آمیز لہجے میں بولے۔

”اتنا بڑا گھر ہے تو کیا یمیم خانہ کھول لوں، ہر غریب مسکین کے لیے لنگر کھول دوں اتنا ہی شوق ہے نانکیاں کمانے کا تو اس شہر میں بہتر سے ضرورت مند اور یمیم بھرے پڑے ہیں۔ جاؤ جا کر ان کو بھی اٹھا لاؤ اور یہ اتنا بڑا گھر مسٹر عاکف یوں ہی نہیں بن گیا۔ میرے باپ کی شب و روز محنت کی کمائی سے بنا ہے۔ تمہاری طرح انہوں نے دوسروں کی دولت پر عیش نہیں کیسے۔ جس طرح تم ان کی محنت کا پھل مزے لے لے کر کھا رہے ہو۔ کیا تمہاری اوقات بھی اتنی کہ ایسی لکڑی لاکھ کا تصور کر سکو، شکر کرو میرے پاپا کا! انہوں نے تمہیں معمولی اکاؤنٹنٹ سے اٹھا کر اس سلطنت کا بادشاہ بنا دیا۔ اس لیے نہیں بنایا تھا کہ تم ان کے خون پسینے کی کمائی کو اس بے دردی سے اپنوں میں لٹاؤ! ابھی میں زندہ ہوں مسٹر عاکف! اور اپنی زندگی میں تمہیں اس دریا دلی کی اجازت ہرگز نہیں دوں گی۔“ ان کا وایوم بلند ہوتا جا رہا تھا فضلہ کا جسم بولے ہوئے کانپ رہا تھا۔

”اس طرح بات کا بتکل نہیں بناتے، چھوٹی سی بات ہے، تم نے اتنا بڑا ایٹو بنالیا ہے۔ تم اس سے کام لے سکتی ہو۔ وہ سارے کام کر سکتی ہے، تم دیکھو تو سہی! اتنی پیاری بچی ہے، خود بخود یاد آتا ہے۔“ عاکف بچا صلح جو انداز میں بولے پتا نہیں انہوں نے اسے اس پیار کی نظروں سے کب دیکھا تھا۔

”کیا میری سارہ کے لیے نوکر مر گئے ہیں جو میں بے کاری بھرتی۔ کرتی پھوں اس کے لیے اور میں اسے کیوں دیکھوں میری سارہ خود لاکھوں میں ایک ہے اور بات کا بتکل میں نے نہیں بنالیا۔ میں تم سے صاف صاف کہہ رہی ہوں اس عذاب کو جہاں سے اٹھا لائے ہو وہیں ڈال آؤ جا کر۔ میرے گھر اور میرے دل میں تمہارے پچھلوں کے لیے رہتی برابر بھی جگہ نہیں ہے اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو باہر کا گیٹ کھلا ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑو اور جدھر چاہے نکل جاؤ۔ کوئی تمہاری تلاش میں نہیں آئے گا۔ اس کی تم فکر نہ کرنا اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ اندر اسٹینڈ۔“ وہ بے مروتی اور جلال کی آخری حد پر کھڑی تھیں۔

”نرگس! حد کرتی ہو تم بھی۔ اچھا۔ میں ابھی سفر سے تھکا لوٹا ہوں، کچھ دیر مجھے آرام تو کر لینے دو پھر اس مسئلے پر بیٹھ کر کچھ سوچتے ہیں۔“ عاکف بچا خوشامدانہ لہجے میں بولے۔

”تم سوچو مسٹر عاکف! میں نے تو جو سوچنا تھا کہہ دیا اب مجھ سے کوئی توقع نہ رکھنا۔ بس اسے کہیں چھوڑ آئے کے بارے میں سوچو اور اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔“ وہ تنگ دلی سے بولیں۔

”نرگس! امی سے تو مشورہ کر لینے دو دیکھو میں اسے کہاں چھوڑ کر آسکتا ہوں پلیز میری خاطر۔ سارہ کی خاطر تم صرف ایک بار امی سے پوچھ لو۔ پھر خود کہیں گی! آئی برامس میں وہی کروں گا۔“ عاکف بچا پھر گھگھکیا۔

”مئی بھی میری مئی ہیں وہ بھی وہی کہیں گی جو میں کہہ رہی ہوں ان سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں۔“ ان کا لہجہ بے لچک تھا۔

”ایک بار پوچھ لینے میں کیا حرج ہے، میں انہیں ساری بات بتا کر ایک بار فضلہ کو ان کے پاس لے جاتا ہوں پھر جو کہیں گی پلیز۔“

اس سے تو اچھا تھا وہ اسے پلین سے نیچے گرا دیتے چکے۔ کسی کو پتا بھی نہ چلا اور ان سے پوچھنا بھی کس نے تھا۔ اس نے سسکیاں دبا کر سوچا۔ دونوں کی آوازیں آتا بند ہو گئی تھیں شاید ان کی ”سی لارڈ“ کچھ سوچ رہی تھیں۔ پھر چند لمحوں بعد کمرے کے باہر باریک ہیل کی ٹنگ ٹنگ دور جاتی سنائی دی اور ان کے پیچھے بھاری بوٹوں کی چاپ اس کی ٹانگیں اکڑ چکی تھیں ”آخری فیصلہ ہونے میں شاید اب زیادہ دیر نہیں پھر پتا نہیں کہاں جانا پڑے گا۔“ اس نے سوچتے ہوئے جوتے اتار کر ٹانگیں سمیٹ کر صوفے پر رکھ لیں۔ اس کا پورا وجود تھک چکا تھا اور آنکھیں رو رو کر آنسوؤں اور سوچوں کی لالچنی کشش کے دوران پتا نہیں کب نیند اس کی آنکھوں پر مہمان ہو گئی اور وہ کسی گھڑی کی طرح گردن بانہوں میں چھپائے سو گئی۔



ایمن نے اب اسکول جانا شروع کر دیا تھا۔ تایا جی ہی اسے اور ولید کو اسکول چھوڑتے تھے۔ اس لیے تینوں کا آٹھ بجے تک تیار ہو کر گھر سے نکلنا ضروری تھا۔ ابراہم ذرا لیٹ کانچا تھا وہ یوں بھی اپنی بائیک پر جاتا تھا۔ اور ان تینوں کے لیے بیک وقت ناشتہ تیار کرنا تایا جی کے لیے کسی افتاد سے کم نہیں تھا پتا نہیں پہلے ولید اور تایا جی کے لیے ناشتہ تیار کر کے دیتی تھیں یا نہیں۔ لیکن آج کل ان کا یہ رویہ بد رک بھی کسی کارنامے سے کم نہیں تھا اور یہ کارنامہ وہ ایمن کی شمولیت کے بغیر انجام دیتا نہیں چاہتی تھیں۔ سچا سچ بچے ہی ان کی بابا کا راسے بستر چھوڑنے پر مجبور کر دیتی۔ ان کے شور و غل کو شاید نظر انداز کر کے وہ بستر پر ہی بڑی رہا کرتی لیکن تایا جی کی ایک کڑک اسے سیکندوں میں کمرے سے باہر آنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ تایا جی کو اچھے ہی نہ تو کچھ دکھائی دیتا تھا نہ بھائی دیتا تھا جب تک چائے کا لبا بھر اکپ ان کے ہاتھ میں نہ تھمایا جاتا۔ تایا جی پہلے کیا کرتی تھیں یہ تو اس کو خبر نہیں تھی لیکن اب تایا جی کی اس انتہائی طلب کی تکمیل اس کے ذمے ٹھہری تھی چاہے وہ اسے جیسے بھی سرائیام دے۔

اور پہلے دن منہ اندھیرے جب گھنٹوں کی تکلیف سے ہائے کرتی تائی جی نے اسے کیتلی میں چائے کا پانی دیتے ہوئے چائے بنانے کو کہا تو وہ جیسے گرتے گرتے پچی۔ اس عمر تک چائے بنانا تو درکنار ان چاروں بہن بھائیوں نے کبھی چائے کبھی بھی نہیں تھی۔ ماما بچوں کو چائے دینے کے بہت خلاف تھیں انہوں نے تو انہیں دودھ اور جوسز پر پالا تھا چائے سے اس کی شناسائی صفر تھی۔ تو جب تائی جی نے کہا کہ اپنے تایا کے لیے چائے بناؤ تو چونکہ اس نے جلا لیا لیکن ان کی بات سن کر چلی ہوئی تیلی بھجانا بھول گئی ابھی گرمی نیند کا شمار بھی نہیں اترا تھا کہ اتنے عجیب حکم سے اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ سوچنے سے بھلا اس معے نے کہاں حل ہونا تھا ہاں تیلی ساری جل کر اس کی انگلیوں کی پوروں تک آن پچی پش نے نرم ہاتھ کو جو جلایا تو اس نے ”سی“ ہکر کے تیلی کو نیچے گرا دیا۔

”سننا نہیں تم نے“ میں نے کہا ہے ”چائے بناؤ“ ورنہ تمہارے تایا جی یونہی بگل بجاتے رہیں گے چائے چائے کا۔“ تایا جی کی پکار پر تائی جی نے ناگواری سے اسے بے حس کھڑے دیکھ کر کہا ”یہ لو پکڑو“ انہوں نے کیتلی اسے تھمائی۔

”وہ تائی جی!“ اس نے سوکھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کیتلی پکڑی۔

”ہاں کیا ہے نیند نہیں آ رہی آنکھوں سے پانی اُٹھ رہا ہے۔ پونے چھ ہو رہے ہیں۔ ابھی ناشتا بھی بنانا ہے۔ کبھت آتا بھی رات کو حتم ہو گیا“ تمہارے تایا جی پر اٹھا کھاتے ہیں۔ چائے کا پانی رکھ کر مجھے آنا چھان کر دو نہیں گوندھ لوں۔“ وہ اونچی پیٹھی پر بیٹھیں از حد حیرت انگیز تھیں۔

اس نے ایک نظر تائی جی کے وسیع و عریض وجود پر ڈالی اور دوسری کیتلی پر۔

”ہاں اب کیا میرا ایکسے اتارنا ہے پٹ پٹ آنکھیں کھولے کھورے جاری ہو۔ بنا لو اب چائے“ میں نے مجھیں کے نوٹس کر کے کو تو نہیں کہہ دیا۔ ”ان کی بیزاری بڑھتی جا رہی تھی۔“

”تائی جی! مجھے تو چائے بنانا نہیں آتی۔“ اس نے تھوک نگل کر صاف آواز میں کہا۔

”کیا؟“ اب چودہ طبق روشن ہونے کی باری تائی جی کی تھی۔

”اوی میرے اللہ اتنی بڑی لوٹھا کی لوٹھا۔ آنکھیں جماعت میں پڑھتی ہو اور چائے بنانا نہیں آتی۔“ وہ حیرت کے سمندر سے نکل کر بولیں۔

”آنکھیں جماعت میں پڑھنے کے لیے ضروری نہیں کہ چائے بنانا بھی آتی ہو۔“ اس نے دونوں کاموں کے لازم و ملزوم ہونے کی نفی کی۔

”ہاں تو جب زبان چلانا آتی ہو، نخرے دکھانے آتے ہوں تو پھر چائے سیکھنے کی کیا ضرورت ہے، بلکہ میرا تو خیال ہے اگر زبان چلانے کا ہنر آجائے تو پھر کچھ بھی سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور تمہیں تو میرے خیال میں شہلا نے ہی فن سکھایا ہے۔ اب تمہیں کچھ اور سیکھنے کی ضرورت بھی نہیں۔“ ان کا طعنہ اسے آگ لگا گیا۔

”تائی جی! میری ماما کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، تایا جی کے لیے چائے بنانے کی ذمہ داری آپ کی ہے میری نہیں۔ چائے بنائیں، چائے نہ بنائیں۔“ وہ فوراً ”گورا کرار“ جواب دے کر پیر پختی باہر نکل گئی مگر اس کی بھول تھی کہ وہ اکڑ دکھا کر باہر نکل سکتی ہے۔ اور تائی جی کے جسم کا حجم جس قدر پھیلا ہوا تھا اور کھٹنے ان کو اچھے بیٹھے تنگ کرتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ لپک کر اس کی درگت نہیں بنا سکتیں۔ ابھی اس نے کچن کی دہلیز پر دوڑ کر قدم اپنے کمرے کی طرف برہائے ہی تھے کہ پیچھے سے تائی جی نے اس کی قمیص پکڑ کر اس کا سراپا طرف گھمایا۔ اور کھینچ کر دو تھینر تراخ تراخ اس کے گالوں پر جڑ دیے۔

”نہ ماں کو کچھ نہ کہوں، جو مجھے اس دنیا میں چھوڑ کر چلی گئی کہ دنیا تیرے آگے نرے سجا سجا کر پیش کرے گی“ واپ زادی کے ناز اٹھائے گی“ اسے کچھ نہ کہوں اور مجھے بھی۔ ویسے ہی چھوڑ دوں کہ توجہ دیر چاہے شتر بے مہار کی طرح سر نہ ہواڑ کر بیٹھ جائے میں نے تیرا چار نہیں ڈالنا ہے جو مجھ سے کوئی کام نہ لوں، مجھے تخت پر بٹھا کر تیرے نرے اٹھاؤں۔ چل دفع ہو اندر اور چائے بنا۔“ انہوں نے ایک دھمو کا اس کی کمر پر جڑا اور اسے کچن کی طرف نڈر سے دھکا دیا۔ تکلیف اور ذلت کا احساس اتنا شدید تھا کہ وہ اندر جانے کے بجائے وہیں دیوار کے ساتھ لگ کر چیخ کر رونے لگی۔

”میں ڈرا ہے باز تیری میں نے کھال کھینچ لی ہے جو یوں چیخ چیخ کر حملہ اکٹھا کرنے لگی ہے۔ میں کہتی ہوں اندر نہ ہوتی ہے کہ نہیں۔“ تائی جی نے آگے بڑھ کر جو زور سے اس کی کٹائی پکڑ کر موڑی اس کی چیخ نکل گئی۔

”کیا ہو گیا، صبح ہی صبح کیا چیخ دیکار شروع کر دی ہے تم دونوں نے“ ایک چائے مانگی تھی غلطی سے اپنے سیاپے ال کر بیٹھ گئی ہیں۔“ تایا جی بلند آواز میں دھانڑتے ہوئے باہر نکلے۔

”اب اندر دھع ہوتی ہے یا پڑاؤں تایا کے ہاتھوں ساری چو کڑی بھول جائے گی نامراد کو۔“ نفرت بھری شدید صمکی کام کر گئی۔ تایا جی کی اس رات کی مار اسے ابھی بھی دن میں ڈرا رہتی تھی۔ وہ سسکیاں لیتی اندر کچن میں چلی گئی۔

”نہ کیا ہوا تھا اسے صبح صبح کون سا دورہ پڑا تھا جو چیخ چیخ کر نحوست پھیلا رہی تھی یہ۔“ تایا جی ان دونوں کے بیچ درمیان کھڑے حقارت سے بولے۔

”ہونا کیا تھا“ میں نے لینڈ لارڈ زاوی کو غلطی سے کہہ دیا کہ چائے بناؤ آگے سے۔ وہی اوائس مجھے دلہا کر لے مجھے تو چائے بنانا نہیں آتی۔“ مجھ کرموں جلی کے منہ سے نکل گیا کیا ماں نے نہیں سکھائی پائیس پھر کیا تھا چیخ

چنگ کر رہے ڈرامہ کرنے لگی۔ "تائی جی کا جھوٹا سے مزید آگ لگا گیا مگر اب اس آگ میں اسے اپنا آپ ہی جلانا تھا کسی اور کو اس کی آغ بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔

"مگر کر رہی تھی۔ اس رات کی طرح۔ دیکھا کیا ہنگامہ کیا تھا اس نے اس رات پھوپھی اور باسی کے سامنے ہمیں ذلیل کروایا تھا۔ میں تو اسے بڑی بھولی سمجھتا تھا۔ یہ تو بڑی مکار ہے انیس۔ اس پر اب کڑی نظر رکھنا یہ تو ہمیں بھی چھوڑ دے جائے گی۔ کل کو سب کو جواب تو ہم نے دینا ہے تم ہی اب خیال رکھنا۔" تائی جی وہیں اسٹول سنبھال کر بیٹھتے ہوئے نفرت سے بولے۔

"چل مر رہے چائے کی پتی ڈال اس میں۔" تائی جی نے چائے کا ڈبہ اس کی کمر میں دے مارا اس نے دو آنسو اندر اتارے دو باہر گرائے اور چائے تھام لی۔

"ایک چمچ ڈال۔ دیکھو آنسو اس کے جیسے ہم نے اسے ذبح کر دیا ہو۔ منحوس ڈرامہ گرا اتنی سی لڑکی اور چلن دیکھو۔ اللہ میری توبہ! نڈر دیدہ اس رات اندھیرے میں بسن بھائیوں کو لے کر نکلے لگی تھی۔ توبہ کیا زمانہ آگیا ہے خوف تو رہا نہیں زمانے میں۔"

تائی جی اس کے سر پر کھڑی کانوں کو ہاتھ لگا رہی تھیں۔ وہ کیتلی سے اٹھتے دھند کے غبار کو دیکھتے ہوئے روئے جا رہی تھی۔

"چینی ڈال اس میں۔ اب کھڑی دریا بہا رہی ہے۔ میں کہتی ہوں ابرار کے لبا لبا یہ تو مجھے بہت تنگ کرے گی۔" وہ مڑ کر تائی جی سے بولیں۔

"تنگ کرے گی تو خود ہی تنگ ہوگی۔ میں تم سے کہہ رہا ہوں کوئی لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا تو داغ اچھا خاصا خراب ہے۔ پتا نہیں ماں باپ نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں ایسی گستاخ اولاد سے۔" تائی جی بیوی کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔

"دو ڈال اب اس میں اور صبح صبح یہ ماتم بند کر۔ جب سے آئی ہے گھر میں جیسے نحوست پھیل گئی ہے۔" انہوں نے بڑبڑاتے ہوئے کپ اس کے آگے سلیب پر رکھا۔

"اس سے پکڑ کر چائے ڈال۔" رومال اسے تھماتے ہوئے وہ حکم دے رہی تھیں۔

اس نے رومال سے کیتلی احتیاط سے پکڑی جیسے ہی چائے کپ میں اندھیلنے لگی۔ رومال پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ آدھی چائے کپ کے اندر اور کیتلی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کے پاؤں کے پاس زور سے جاگری تھی۔

ہوئی چائے بائیں پاؤں کو جلا گئی۔ اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ ہاتھ سے رومال چھوڑ کر نیچے پڑ کر بیٹھ گئی۔

"بائے میرے اللہ کیسی تنگی لڑکی ہے ہمارے سرچڑھ کر پاؤں جلا بیٹھی۔ یہ تو مجھے ذلیل کر کے رکھ دے گی ساری چائے تباہ کر دی۔ مجھے اس سے کیا فیض ملے گا۔ النابیہ تو اذیت کا سامان پیدا کرے گی میرے لیے۔" چلن اور تکلیف سے وہ از سر نو رونے لگی۔

چلو جتنی چائے پی چکی تھی وہی دے دو صبح صبح سر میں درد کر رہا ہے نہ تم خود نہیں بنا سکتی تھیں چائے مصیبت۔" تائی جی بیزاری سے اٹھ کر مائی جی سے کپ لیتے ہوئے بولے اور باہر نکل گئے۔

"اب بیٹھی رہاں کیا ایک ہزار ہی ہے جا جا کر کوئی ٹوبہ لگا لے پاؤں پر۔" بکو اس کی تھی مجھے آنا چھان دے اپنا ہی ڈرامہ کر کے بیٹھ گئی۔ ہمیں کسی سے کوئی فیض کہاں۔ ایسے اچھے اپنے نصیب کہاں۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے پرات میں آنا چھاننے لگیں تو وہ روئے ہوئے انھی پاؤں سے چلن کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ بمشکل قدم اٹھاتے ہوئے

باہر نکل گئی۔ "ہو نہ! تائی جی نے ایک نظرا سے جانے دیکھا اور پھر زور زور سے آنا چھاننے لگیں۔ لاڈلے جب دنیا کے سہنے چڑھتے ہیں تو دنیا ان کے ساتھ بہت برا سلوک کرتی ہے۔"



"غزالہ آنٹی! پنے کی دال تو مجھے بہت پسند ہے اور آپ تو بالکل حلیم کی طرح پکاتی ہیں۔ آپ کبابوں کے لیے قیر نہ منگوائیں۔ میں دال ہی کھاؤں گی۔" غزالہ فیصے کے لیے پرس میں سے پیسے نکال رہی تھیں جب عبید نے پیچھے سے آکر کہا۔

"نہیں بیٹا! مجھے پتا ہے تمہیں دال پسند نہیں اور قیر تو ویسے بھی منگوانا ہی ہے۔ اس میں کیا بات ہے بھلا۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولیں۔

"نہیں کباب کوئی بھی شوق سے نہیں کھاتا مجھے پتا ہے اور آپ نے ابھی کپڑے بھی پر لیں کرنے ہیں۔ کھانا بھی پکانا ہے پہلے ہی شام ہو چکی ہے۔ کباب بنانے میں بہت وقت لگے گا۔ پرسوں چھٹی کا دن ہے نا پرسوں کباب بنائے گا۔ ٹھیک ہے نا؟" وہ ان کے بازو کے ساتھ ٹنگ کر بولی۔

"تو پرسوں بنالیں گے۔ قیر تو آج منگوا لوں نا۔" وہ پھر بولیں۔

"پرسوں فریش منگوائے گا۔ آج منگوا کر باسی کرنا ہے بس آج دال پکائیے مزید اری۔"

"چلو جیسی تمہاری مرضی۔" انہوں نے پیسے واپس پرس میں رکھ دیے وہ ان کے ساتھ کچن میں آگئی۔

"گلا میں بسن چھیلتی ہوں۔" اس نے پلیٹ ان کے ہاتھ سے لے لی۔

"چھیل لو گی؟" غزالہ بسن کر بولیں۔

"ہاں تو اس میں کیا مشکل ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا اور چھلکے اتارنے لگی۔

"گلاس میں کوئی دوست بنی عبیدہ کی؟" وہ بازو کاٹتے ہوئے بولیں۔

"اس بھی تو ساری گلاس دوست ہے۔ کلوز فرینڈ تو کوئی نہیں بنی۔" وہ لا پرواہی سے بولی۔

"غزالہ آنٹی! ایک بات کہوں آپ سے۔" وہ کچھ دیر بعد بولی۔

"ہاں کہو۔ کیا بات ہے۔" انہوں نے چوہے پر پیچھی رکھتے ہوئے کہا۔

"غزالہ آنٹی! میں جب پہلے آپ کے گھر آئی تھی ہم رات کو نہیں رہتے تھے بس دن میں ہی واپس چلے جاتے تھے ٹوبہ اور تانیہ مجھے بتاتی تھیں کہ ہم رات کو مل کر سوتے ہیں خوب باتیں کرتے ہیں کہانیاں سناتے ہیں۔ پسلیاں بچھاتے ہیں۔ برا مزہ آتا ہے۔ اوھر میں اور ایی الگ الگ سوتے تھے اور مانا کہتی تھیں۔ باتیں نہ کرو جلدی سو جاؤ۔ صبح اسکول جانا ہے تو میرا اس وقت بڑا دل کرنا تھا کہ میں اوھر رہوں رات کو۔ ٹوبہ وغیرہ کے ساتھ سوؤں۔ ان کے ساتھ باتیں کروں پسلیاں بوجھوں اور رات کو دیر تک جاگوں مگر مار رہے ہی نہیں دیتی تھیں۔" وہ چپ کر گئی پرانے درد جاگنے لگے تھے۔

"ہاں تو بیٹا! وہ بھی صحیح کہتی تھیں نا وہاں تم لوگوں کے اسکول صبح جلدی اشارت ہو جاتے تھے۔ جلدی اٹھنا پڑتا ہے اس لیے۔ ان کے تو اسکول بھی کچھ لیٹ اشارت ہوتے ہیں اس لیے یہ رات کو سوچ میلہ کر لیتی ہیں۔" غزالہ نے کہا۔

"لیکن پھر بھی یہ صبح جلدی اٹھ کر نماز بھی پڑھتی ہیں۔ اٹھتی تو جلدی ہیں نا۔"

"ہوں! غزالہ سمجھ نہیں پائیں کہ وہ کیا کتنا چاہ رہی ہے۔"

"غزالہ آنٹی! مجھے نیچے ٹوبہ اور تانیہ کے ساتھ بہت مزہ آتا ہے آپ پلیز وہ جو ہڈ کا آرڈر دیا ہوا ہے وہ کینسل کرادیں۔ مجھے نیچے سونے میں مزہ آتا ہے اور پھر گرمیوں میں تو سب چھت پر اوپر سوئیں گے نا میں نیچے اکیلی کیسے

سوئوں کی اور پھر اس پر تو گری لگے گی نا اور اب تو سردیاں ختم ہونے والی ہیں۔ آپ انکل سے کہیں کہ بیڈ کا آرڈر کینسل کرا دیں۔“

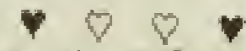
اب بات غزالہ کی سمجھ میں آئی تھی انہوں نے ایک شرمندہ سی نگاہ اس پر ڈالی۔
”رینا! اب تو وہ بیڈ آج کل میں آنے والا ہے۔ اس طرح تو آرڈر کینسل نہیں ہوتا۔“ غزالہ نے سمجھایا۔
”غزالہ! آئی! میں نے بتایا نا کہ بیڈ تو ایک دو ماہ بعد بے کار ہو جائے گا گری کی وجہ سے۔“ وہ اصرار سے ہوئی۔
”آپ انکل کو منع کر دیں۔“

”دینا! ایسے تو وہ آرڈر کینسل نہیں کرے گا۔ اس نے کچھ پیسے لیے ہوئے ہیں اس طرح وہ پیسے نہیں دے گا۔ اس لیے بیڈ آجائے دو۔“ نمک مرچ ہنڈیا میں ڈال کر انہوں نے ڈسکن رکھ دیا۔
”تو ان پیسوں کی ہمیں کتابوں کی الماری بنوا دیں ہمارے بیڈ روم میں۔ ہم سب کو ضرورت بھی ہے اور وہ اچھی بھی لگے گی۔“

اس نے فوراً ”تجویز پیش کی۔
”ہاں یہ بھی اچھا آئیڈیا ہے اچھا۔ میں تمہارے انکل سے بات کروں گی آج۔ اگر وہ مان گئے تو الماری منگوا لیں گے۔“ انہوں نے ہائی بھری توجہ سے عبیرہ کو سکون آگیا۔

”چلو۔ اب تم اٹھو۔ کافی ٹائم ہو گیا ہے۔ بیگ کھولو اور جا کر اپنا ہوم ورک شروع کرو۔ میں ابھی آرہی ہوں اور دیکھو وہ سب بھی پڑھ رہی ہیں یا نہ اکیل نماشا ہو رہا ہے۔“ انہوں نے اسے اٹھایا تو وہ جی اچھا کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور باہر نکل گئی۔

”وقت کتنا بڑا استوا ہے وہ باتیں جو ہم دن رات لگا کر ان بچوں کو ذہن نشین نہ کرا سکتے۔ وقت نے ایک ہی جھٹکے میں سب کچھ سکھا دیا ہے۔ عبیرہ کتنا بدل گئی ہے۔ ساری صدیں سارا اکھڑن بھول گئی ہے۔ ہاں باپ ہوتے تو دیکھ کر حیران رہ جاتے۔ اللہ اس کی آئندہ کی زندگی بہتر کرے۔“ غزالہ اسے جاتے دیکھ کر سوچ رہی تھیں۔



”اے کیا نام ہے تمہارا فضہ۔ لڑکی ادھر آؤ۔“ گاؤ تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے می نے اسے پکارا۔ وہ ان کے بیڈ کے سامنے بڑے صوفے پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔

”جی! وہ آہستگی سے جلتے ہوئے ان کے پاس آکھڑی ہوئی۔
”یہاں بیٹھ کر میرے ہاتھ دباؤ۔“ انہوں نے جھڑپوں سے بھرے ہاتھوں والی تکی تکی سفید کلاسیاں اس کے آگے کر دیں وہ بیڈ کے کنارے ٹک کر اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے ان کے ہاتھ دبانے لگی۔

”تمہارا نام فضہ ہے نا، حالانکہ تمہارا نام تو چڑیا ہونا چاہیے تھا۔ معصوم سی ہنسی ہوئی ہے ضروری۔“ وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولیں وہ بدستور سر جھکائے ہاتھ دباتی رہی۔

”لیکن نہیں۔ چڑیا نہیں۔ چڑیا تو چوں چوں کرتی ہے۔ اس کی ننھی سی چکار سے سارے آنگن میں شور ہو جاتا ہے اور تم تو بالکل کلم صم ہو چکے ہو۔ اس لیے تمہارا نام کوئی اور ہونا چاہیے۔ میری نواسی کو دیکھا ہے نا تم نے سارہ کو۔ اس کا نام سارہ نہیں شیطان کی خالہ ہونا چاہیے اس کے لیے آئی ہے مہمنوں میں سارے کمرے کو کس نے گھسیٹا ہے اور بچے تو ایسے ہی اچھے لگتے ہیں۔“ بھیتے بھیتے شرارتیں کرتے ”تم کیوں اتنی چپ ہو؟ کسی سے ڈرتی ہو۔“ وہ ننھی آواز میں بولتے ہوئے مسلسل اسے دیکھ جاری تھیں۔

اس نے نفی میں سر ہلادیا۔
”بس بھائی یاد آئے ہیں؟“ انہوں نے اس کی دھتکتی رنگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ چپ رہی ہاں جھکی ہوئی آنکھوں میں

نمی اتر آئی۔

”وقت بڑا ظالم ہے۔ اتنی ننھی سی کونج کو ڈار سے جدا کر دیا۔ بچے! جدائی کے زخم بھرنے میں کچھ تو وقت لگے گا نا۔“ وہ آہستہ آواز میں بولیں۔ ”ابو! ای یاد آتے ہیں“

ان کا سوال پہلے سے بھی زیادہ ظالمانہ تھا اور آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپک کر ان کے جھڑپوں والے ہاتھوں پر آگرے انہوں نے ایک نظر ان موتیوں کو دیکھا جو آنکھوں سے نکل کر محض پانی بن گئے تھے۔

”چلو اداس نہیں ہو۔ مجھے اپنے امی ابو کی باتیں بتاؤ۔“ انہوں نے اس کی آنکھیں صاف کرتے ہوئے اسے بہلایا اس نے نفی میں سر ہلادیا۔

”کیوں؟“ وہ چپ رہی۔

”ہاں درود بڑھتا ہے۔ یوں زخم کو بار بار کریدو تو۔“ انہوں نے آہ بھر کر کہا۔

”چلو پھر سو جاؤ جا کر۔“ مجھے وہ سائیڈ پر پڑا ہے۔ دودھ کا گلاس اور دونوں ٹیبلٹس جو پاس پڑی ہیں دے جاؤ۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ انہیں دودھ اور میڈیسن دے کر اسی کمرے کے دوسری طرف رکھے سنگل بیڈ پر آکر لیٹ گئی کبل گردن تک اونٹھ کر اس نے دوسری طرف کروٹ لے لی۔

کل جب وہ صوفے پر پڑے پڑے سو گئی تھی تو نوکر اسے جگانے آیا کہ آپ کو اندر بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں۔“ وہ اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑی۔ وہ اسے اس کمرے تک لے آیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے عجیب سا احساس ہوا جیسے وہ کسی ہسپتال کے کمرے میں آگئی ہے۔ یہی ہی خوشبو تھی یا شاید بو بھی فیما نکل جیسی۔ کمرے کا سارا فرنیچر فرانسیسی تھا اسے تو نہیں بتا تھا کہ یہ فرانس سے منگوا یا گیا ہے ہاں اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ فرنیچر بہت قیمتی ہے یہ بات اسے آج می نے بتائی تھی۔ دیواروں پر سفید بے داغ پینٹ ہوا تھا۔ فرنیچر کی جلد بیش قیمت سفید فارمیکا کی تھی۔ کھڑکیوں پر سفید بے داغ پردے ہوئے ہوئے لہرا رہے تھے کیونکہ کھڑکیاں پچھلے لان کی طرف تھیں۔ فرش پر قالین بھی سفید اور ہلکے آسمانی کلا کا تھا۔

”ممی! یہ ہے فضہ اب بتائیں بھلا میں اسے واپس کیسے چھوڑ آؤں۔“ عاکف چچا کی آواز میں لجاجت اور بے بسی دونوں تھی۔

”ہوں!“

”نرگس! تم کیا کہتی ہو؟“ انہوں نے غور سے عاکف چچا کے پاس بیٹھی فضہ کو دیکھ کر کہا۔
”ممی! میں تو اسے قطعاً ”برداشت“ نہیں کر سکتی میرا گھر کوئی Orphanhouse (یتیم خانہ) نہیں ہے جو میں یہ فی سبیل اللہ کام شروع کروں۔ میں اس طرح کی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتی۔ اس لیے عاکف سے کہیں کہ اسے فوراً سے پنشن اس کے تاپا چچا جو بھی ہیں ان کے حوالے کر آئیں۔ پہلے ہی انہوں نے وہاں اتنے دن وہاں برباد کیے ہیں۔“ نرگس ہزار کن لہجے میں بولیں۔

”ہر بات پر یوں ہزار نہ ہو جایا کرو نرگس!“ ممی نے نرگس کو ڈانٹا۔

”عاکف! تم کیا کہتے ہو؟“

”ممی! بتاؤ چکا ہوں، میری عزت کا معاملہ ہے۔ میں اب کیسے اسے چھوڑ آؤں۔“ عاکف چچا کا لہجہ بدستور عاجزانہ تھا ”سب کے سامنے بات ہوئی تھی اب اس طرح پھر جاؤں۔“

”عزت ہونہ! تمہاری بھی کوئی عزت ہے۔“ نرگس آئی کا ہنکارا اور جملہ خاصا بلند تھا۔ عاکف چچا پہلو بدل کر رہ گئے۔

”نرگس! بری بات۔“ ممی نے سرسری لہجے میں کہا۔

”ایسا ہے نرگس! تم اس بچی کو میرے پاس چھوڑ دو جب سے میرا آسٹریلیا میں طوطا فوت ہوا ہے میں اب اس کمرے میں پڑے پڑے ہو رہی ہوں۔ اس سے میرا دل لگا رہا ہے گا اور عاکف کی بات بھی رہ جائے گی۔ کیا خیال ہے تمہارا۔“ انہوں نے دونوں کو دیکھا۔

”مئی! آپ کے لیے میں نے طوطا منگوایا تو ہے آسٹریلیا سے ایک دو روز میں پہنچ جائے گا پھر آپ کو کیا مسئلہ ہے۔“ نرگس کا لہجہ ہنوز کٹھنور تھا۔

”طوطا آجائے گا تو خیر ہے۔ یہ بچی پیس رہے گی میرے پاس۔ مجھے یہ اچھی لگی ہے۔ تم اب مزید اعتراض نہ اٹھاؤ اور اس کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔ اسے میں رکھوں گی۔ تم دونوں بزنس کی طرف دھیان دو۔ فیجر آیا تھا کل میرے پاس سائن کروانے کچھ پیپر ز پر۔ وہ بتا رہا تھا افضل وغیرہ نے مل میں اور قمر کوپ نے فیکٹری میں بڑے کھیلے کر رکھے ہیں۔ وہ یونین کو آج کل میں اسٹرائیک کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ اندر ہی اندر کچھڑی پک رہی ہے۔ تم اب ہوشیاری سے ادھر توجہ دو۔ اس معاملے کو مجھ پر چھوڑ دو۔“ انہوں نے دونوں سے کہا۔

”مئی! آپ بھی تو حد کرتی ہیں۔ اب بچھلے مینے آپ امریکہ چلی گئیں تو اتنے لازمی پیپر ز تھے۔ ارجنٹ جن پر آپ کے سائن ہونا تھے ایک ہفتہ پورا اس پراجیکٹ کو ڈیلے کرنا پڑا۔ پتا نہیں آپ کو مجھ سے اب کیا خطرہ ہے پاور آف اٹارنی آپ مجھے کیوں نہیں دے دیتیں۔ یہ روز روز کی جج جج سے توجان چھوٹے اٹنے مسائل ہو جاتے ہیں اس سے۔“ نرگس آنٹی کچھ غصے سے بولیں۔

”ہاں۔ کہا تو ہے میں نے ایڈوکیٹ اعجاز سے سو اگلے ماہ تک سارے پیپر ز تیار کر کے لے آئے گا پھر یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ مجھے بھلا تم پر اعتبار کیوں نہیں ہو گا۔ کوئی اپنی اولاد پر بھی بے اعتباری کرتا ہے۔ یہ کام بھی اب جلد ہی ہو جائے گا بلکہ میرے کندھوں سے ذمہ داری کا بوجھ اترے گا۔ تم فکر نہ کرو اور اپنا دھیان صرف بزنس کی طرف کرو مجھے بڑی فکر ہے اور عاکف بیٹا! تم بھی نرگس کے ساتھ مل کر ان معاملوں کو سلجھاؤ۔“

”ہو نہ! کیا سلجھائیں گے کسی معاملے کو۔ اپنے بیک ورڈ خاندان کی تو فکریں کر لیں پھر باقی کا بھی کچھ کریں گے۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

”اوکے مئی! مجھے ذرا چاہنا ہے، حامد صاحب کے ہاں بزنس پارٹی ہے۔ ادھر اور عاکف! تم جا کر عثمانی صاحب سے مل لو انہوں نے میپورنگ کہاں تک مکمل کر لی ہے اوکے مئی!“ وہ کہتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

ان کے ساتھ ہی عاکف چچا مئی کو اوسکے کمرے پر نکل گئے اور وہ کل سے مئی کا دل بھلانے کے لیے ان کے آسٹریلیا میں طوطے کی جگہ اس کمرے میں تھی۔ کمرہ بہت بڑا تھا۔ درمیان میں ر۔ مئی سفید پردوں سے کمرے کی پارٹیشن کر کے اسے دو بنایا گیا تھا۔ سری طرف اس کا سنگل بیڈ لگا دیا گیا تھا۔ مئی ایک ٹانگ سے معذور تھیں ان کے پیچ پیروں میں پرابلم تھی۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار چھوٹی موٹی بیماریاں تھیں جن سے بچنے کے لیے وہ دن رات نیلی سفید سٹرخ اور پکی چھوٹی بڑی گولیاں اور کیپسولز لیتے رہتی تھیں اور فضلہ ان کی خدمت پر مامور ہو گئی تھی۔

تائی جی ابراہیمائی کی اس ناگہانی ہمدردی کا بدلہ کئی روز اس سے لیتی رہیں۔ اٹھتے بیٹھتے اسے ایکسٹریس ادا کارہ اور ڈرامہ باز کا خطاب دیتی رہیں۔ پہلے وہ پلٹ کر جواب دے دیتی تھی لیکن اس زبان درازی پر دو چار جھانپڑا اور پڑ جاتے تھے اور اس کے بعد میں تائی جی کی زبان چلتی رہتی۔ اس کی طبیعت ہزار ہو جاتی پھر اس نے جواب دینا ہی چھوڑ دیا۔ کیا فائدہ دوبارہ مار بھی کھاؤ اور ان کی زبان پھر بھی گولے اگلتی رہے۔ کچھ دن تائی جی کو اس کی ایک چپ اور سو سکھ والی پالیسی کی خبر نہ ہو سکی پھر کچھ دن بعد ہی انہوں نے ٹوٹ کر لیا جب گھر کی دیواریں ان کی تڑتڑ چلتی زبان کے پھول واپس گونج کی شکل میں لا کر ان کی سماعتوں میں ابلنے لگیں تو وہ چونک پڑیں۔ اب ان کے طعنوں نے نئے خطاب کا رخ کیا۔ اسے گھنی میسینی، منکار لومڑی جیسے القابات سے پکارنے لگیں۔ غصہ تو اسے بہت آیا مگر پھر برداشت کر گئی اور تائی جی کی ڈیمانڈ صرف وقت پر کھانا اور چائے کی دستیابی تھی اس کے بعد تائی جی لاکھ اس کی برائیاں تائی جی کے کانوں میں اتارتی رہتیں۔ وہ ذرا توجہ نہ دیتے ایک کان سے سنتے دوسرے سے اڑا دیتے۔

کچھ وقت اور سر کا تو اسے پتا چلا کہ تائی جی کو خاموش کروانے کے بھی بہت سے طریقے ہیں جن میں سے خوشامد تو ظاہر ہے نمبرون ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی بیٹن کی مکمل ذمہ داری اٹھالے تو وہ تائی جی کے نزدیک سب سے زیادہ فرمانبردار اور سمجھ دار ہوتا ہے۔ اس نے آہستہ آہستہ کھانا پکانے میں حصہ لینا شروع کر دیا تائی جی کے طعنے تو نہ ختم ہوئے البتہ کم ضرور ہو گئے اور تینوں وقت کی چائے جب وہ ان کے کمرے بغیر لا کر ان کے آگے رکھ دیتی تو ان کی زبان مکمل خاموش ہو جاتی۔

ابراہیمائی ویسے ہی بے ضرر سے تھے۔ اپنے کام سے کام رکھنے والے کالج اور ہائی کلب وہ ہی ان کی زندگی کی مصروفیات تھیں۔ وہ بہت کم کسی کے معاملے میں دخل دیتے تھے۔ گھر میں ہوتے تو زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی رہتے تھے ویسے بھی وہ ایسٹن کا خیال رکھتے تھے۔ کبھی کبھی خیال آنے پر اس کے لیے چاکلیٹ اور بسکٹ وغیرہ لے آتے تھے۔ اس کے انکار کے باوجود اس کے کمرے میں رکھ جاتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی وقتاً فوقتاً اسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں پوچھتے رہتے تھے وہ نفی میں سر ہلا دیتی۔ ایسے ہی ایک روز انہوں نے پانی کا گلاس اپنے کمرے میں لے جاتے ہوئے اس سے پوچھا تو وہ ایک لمحے کو چپ رہ گئی۔

”ہاں۔ گڑیا! کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ کالی پنن وغیرہ جوتے کپڑے۔“ وہ اس کی چپ پر مڑ کر دوبارہ بولے۔

”وہ ابراہیمائی! آپ سے ایک بات کہوں۔“ وہ مڑ چھیل رہی تھی۔

”ہاں کوئی تو میں کہہ رہا ہوں۔“ وہ محبت سے بولے۔

”ابراہیمائی! امیرا بڑا دل کرتا ہے ایک بار میں اپنے گھر جاؤں ویسے ہی دیکھنے کے لیے۔“ وہ اٹک اٹک کر بولی۔

”گھر۔“ وہ کچھ حیران رہ گئے۔ ”یہ بھی تو تمہارا گھر ہے۔“ انہوں نے اسے ہلایا۔

”ہاں وہ تو ہے۔“ وہ تامل سے بولی۔ ”لیکن صرف ایک بار۔ ایک بار میں ادھر جانا چاہتی ہوں۔ دیکھیے پلیز ابراہیمائی۔“ وہ آواز کو حتی الامکان لمبی بناتے ہوئے بولی۔

”گڑیا! میں تمہیں ادھر لے جاؤں وہاں تو کرائے دار رہتے ہیں ایسے تو اچھا نہیں لگتا اور کرایہ وغیرہ بھی ابوان سے لینے جاتے ہیں اب ہم جا کر دروازہ کھٹکھٹائیں کہ ہم نے گھر دیکھا ہے تو اچھا تو نہیں لگے گا۔“ انہوں نے اسے گھمایا۔

وہ چپ کر گئی اور دوبارہ مڑ کر مڑ چھیلنے لگی۔ وہ اسے کھڑے دیکھتے رہے۔

”اچھا۔ میں کوشش کروں گا۔ کسی روز تمہیں لے جاؤں۔“ وہ کہہ کر باہر نکل گئے تو وہ مڑ چھوڑ کر ہاتھوں میں منہ

چھپا کر رونے لگی۔

پھر کتنے دن گزر گئے نہ اس نے ابرار بھائی سے ان کے وعدے کے بارے میں پوچھا نہ انہوں نے دوبارہ کہا۔
تائی جی کی لعن طعن سنتے سنتے وہ نویں میں آگئی۔ کچھ دنوں بعد عید آگئی۔ ماما پاپا کے بعد ان کی پہلی عید آئی تھی۔
اور ان کی زندگی میں ان کی عید کیسے گزرتی تھی۔ وہ اس کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ عید پر ماما ان کا
ایک لباس تیار نہیں کرتی تھیں۔ ہمیشہ وہی تین ہوتے تھے اور اپنی تیاری بھی وہ پورے اہتمام سے کرتی تھیں۔ ایک
ہفتہ پہلے گھر کی تفصیلی صفائی کرتی تھیں۔ کئی قسم کے کھانے وہ دو دن پہلے ہی پکا کر فریز کر لیتی تھیں۔ پاپا چٹ پٹے
کھانوں کے بے حد رسیا تھے اور ماما ہر چیز ہر کام میں پاپا کی پسند کو اولیت دیتی تھیں۔ عید والے دن ان کا گھر خوشیوں
کی چکار سے منک رہا ہوتا تھا۔ آدھا دن وہ گھر پر مہمانوں کو خوش آمدید کہتے تھے اور باقی کا آدھا دن باہر گزارتے تھے۔
رات کا کھانا بھی باہر ہوتا تھا کسی اچھے ہوٹل میں۔

اور آج صبح ہی گفتی لو اس بھی وہ کئی بار صبح سے ماما پاپا عیبوہ فضا اور مون کو یاد کر کے رو چکی تھی۔ تائی جی نے
اس کے کپڑے بنائے تھے لیکن اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ پہننے کو۔ تائی جی ابرار بھائی اور ولید عید کی نماز پڑھ کر آگے
تو تائی جی نے اسے ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہونے کو کہا وہ کپڑے پہننے چل دی۔ آج خلاف معمول تائی جی کا رویہ اس کے
ساتھ اچھا تھا لیکن صبح صبح کھانا بھی انہوں نے خود ہی پکا لیا تھا۔

تائی جی اور ابرار بھائی نے اسے عید دی تھی اور ولید تو اس کی مٹھی میں بند روپے بھی کھینچنے کے چکر میں تھا۔
پہلے دن سے اس سے جو ٹھنی تھی وہ آج تک چل رہی تھی۔ تائی جی اور تائی کی اور بات تھی ان کی ڈانٹ ڈپٹ اگرچہ
اسے بہت بری لگتی تھی لیکن ولید سے اسے جڑ بھی۔ کئی بار اسے صرف ولید کی شکایت لگانے پر تائی جی اور تائی جی
سے ڈانٹ اور مار پڑی تھی وہ دل سے اس سے بدظن تھی۔

عبیوہ اور غزالہ آئی نے شام کو ملنے آنا تھا۔ صبح ان کا عید مبارک کا فون بھی آگیا تھا۔ عبیوہ بہت خوش تھی کہ
وہ شام کو آئے گی تو اسے اپنے کپڑے دکھائے گی۔ غزالہ آئی نے اس کے بہت اچھے کپڑے چوڑیاں جیولری لی
تھی۔ تھوڑی دیر بعد سفینہ پھوپھو کا فون آگیا۔ اس نے مون سے بات کی تھی مون نے ریسیور پکڑتے ہی کہا تھا "میں
آئی عید مبارک۔" تو اس سے بات کرنا محال ہو گیا تھا۔ ماما کے بعد گھر میں سب سے زیادہ وہی تو مون کا خیال پرکھتی
تھی۔ چھوٹے ہونے سے لے کر اب تک۔ اور اب وہ اس سے اتنی دور تھا کہ وہ اسے دیکھ بھی نہیں سکتی تھی۔
پھوپھو نے کہا تھا کہ وہ کچھ دنوں تک مون کو لے کر پاکستان کا چکر لگائیں گی لیکن ابھی زیر انکل مصروف ہیں۔ فون بند
ہوا تو وہ پچھلے صحن میں جا کر رونے لگی۔ اسے تینوں بہن بھائی کتنا یاد آ رہے تھے۔ اس کی زندگی کی یہ کتنی عجیب عید
تھی۔ ماں باپ سے دوری خدا نے لکھی تھی اور بہنوں بھائی سے دوری دینا نے۔ کتنی دیر گزرتی جب ولید اسے دہلی
کے کھانے کے لیے بلانے آیا۔ اس کے دل کا غبار رو رو کر ہلکا ہوا تھا وہ کھانا کھا کر برتن اٹھا رہی تھی۔

"تم عاکف کو دیکھو۔ دو بجنے کو آئے" اسے بڑے بھائی کو عید مبارک کہنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی۔ چلو خود نہ سی
اس بچی کی تو ایمن سے بات کروا دیتا۔ اسے تو دولت اور بیوی نے بالکل ہی اندھا بہرہ کر دیا ہے۔" تائی جی اور بچا اونچا
بول رہے تھے۔

"ہاں آج تو عید کا دن تھا چھ سات ماہ ہو گئے اسے فضا کو لے کر گئے ہوئے۔ لاہور ایسا کون سا سمندر پار ہے
کئی بار یہ کراچی آتا جاتا ہے لا نہیں سکتا تھا اسے تھوڑی دیر کے لیے۔" تائی جی نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔
"نیرا چکر لگا لاہور کا چلو میں ہی ایمن کو لے جاتا ہوں ہم ملازمت پیشہ لوگ تو بندھے ہوتے ہیں۔" آج دونوں

کے ہی روئے ایمن کے حق میں بہت نرم ہو رہے تھے۔

"چلیں۔ آپ ہی اٹھ کر فون پر بات کرو ایمن کی فضا سے۔" تائی جی نے کہا۔

"ہاں میں ہی کرنا ہوں فون۔ بس ایمن ہی بات کرے گی۔ اتنا تو کجنت مل آ جاتا ہے فون کا اسے تو توفیق نہیں
ہوتی۔ جتنی اللہ نے دولت دی ہے۔ اتنا ہی دل کا کمینہ ہے یہ عاکف! اب اس غزالہ کو بھی دیکھو اتنے گئے گزرے
حالات میں بھی سب سے پہلے اس نے دونوں بہنوں کی بات کر والی ہے اچھی ہے غزالہ! اب شام کو کچھ اہتمام کر
لیتا وہ جمال کے ساتھ آئے گی۔" تائی جی اٹھتے ہوئے بولے۔

"ہاں کر لیا ہے میں نے۔ اب اور کچھ نہیں ہوتا مجھ سے۔" تائی جی بڑبڑائیں۔ پھر تائی جی نے نمبر ملا کر اسے آواز
دی۔ عاکف بچا تو کھڑے نہیں ملے۔ فضا کافی دیر بعد فون پر آئی۔ اس کی آواز اسی طرح تھی، سہمی سہمی مریل سی۔
"فضی! تم ٹھیک ہونا۔" ایمن اس کی آواز سن کر بے قراری سے بولی۔

"ہوں! اس کی ہوں اور بے چین کر گئی۔

"تم بولتی کیوں نہیں ہو فضی جان؟ مجھ سے بات کرو۔ آج کون سے کپڑے پہنے ہیں۔ عید ہے نا آج۔" وہ جلدی
جلدی بول رہی تھی تائی جی کی نظریں گھڑی کی سوئیوں پر تھیں۔

"ہاں عید ہے۔ نئے کپڑے پہنے ہیں۔ آئی آ جاؤ نا۔" وہ کہتے کہتے رو پڑی۔

"فضی! میں آؤں گی گریا جان! تم ٹھیک ہو نا۔ خوش ہونا۔ اسکول جاتی ہونا۔"

"ہوں۔" وہ روتے روتے پھر ہو گئی۔

"ہوں ہوں۔ کیوں کر رہی ہو ٹھیک سے بات کرو نا۔" دوسری طرف خاموشی تھی۔

"رو کیوں رہی ہو؟ تم کو کسی نے کچھ کہا ہے۔" وہ پریشان ہو گئی تھی۔

"نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔" آنسوؤں میں بھگی اس کی کھٹی کھٹی سی آواز نکلی۔

"تم عاکف بچا سے کہہ کر کسی روز آ جاؤ نا کراچی۔" تائی جی کریڈل پر ہاتھ رکھنے والے تھے۔ اس نے جلدی سے
کہا۔

"چھا! اس کا اچھا بھی خاصا تکلیف دہ تھا۔

"فضی بی بیسی۔ ہے نا گریا خوش رہنا ہے۔ اچھا تمہاری اپنی تمہارے لیے ڈھیر ساری دعا کرتی ہے۔ دل لگا کر
پڑھنا ہے۔ میں آؤں گی کسی دن۔ پر اس کا اچھا خدا حافظ۔" دوسری طرف سے اس کا جواب سنے بغیر ہی اس نے
ریسیور تائی جی کو پکڑا دیا کیونکہ وہ پہلے ہی کریڈل دبا چکے تھے وہ اپنے آنسو چھپا کر ہر نکل گئی۔

"فضی ٹھیک نہیں ہے۔" کتنے دن اس کا دل کی کتا رہا اور گوئی بھی اس خدشے کی نفی نہیں کر سکا تھا اور وہ اب
دل ہی دل میں لاہور جانے کے منصوبے بنا رہی تھی کہ کسی طرح تائی جی کو راضی کرے۔

پھر اس نے کئی بار تائی جی کی منت کی مگر وہ نہ مانے پھر دوبارہ اس کا فضا سے رابطہ ہی نہ ہو سکا۔ بس دل میں ایک
غلش سی رہ گئی اور وقت گزرنا رہا۔

اور طویل سات سال گزر گئے۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)



۳
تیسری قسط

کسی نے صحیح کہا ہے کہ اس دنیا میں کوئی بھی غم کوئی بھی منظر آخری نہیں ہوتا اور جب تک انسان زندہ رہتا ہے اس کی بینائی اسے وہ کچھ دکھاتی ہے جو شاید وہ دیکھنے کے بعد زندہ نہ رہنا چاہتا ہو مگر رہتا ہے۔ فضلہ کے لیے ان دنوں اس سے بڑا غم کوئی نہیں تھا کہ اس کے عزیز از جان سب سے پیارے ماما پاپا ایک بیک لکھنے اس کی نظروں کے سامنے اس دنیا سے اٹھ گئے اور اس سے بھی بڑا غم کہ انہیں ان ہی کے گھر سے بے گھر کر دیا گیا۔ ماما پاپا مر کر بے گھر ہو گئے اور یہ جیتے جی بے گھر کر دیے گئے۔ یہ دو صدے اس کی عمر بھر کی پرسکون نیند اڑانے کے لیے کافی تھے مگر یہ کافی نہیں تھے کہ اس سے بڑا صدہ اس کا منتظر تھا جو اس کے ننھے دل نے سہا وہ تھا جدائی کا صدہ۔ اپنے پیارے ماں باپ کے جگر گوشوں سے جدائی کا صدہ جیسے ایک جسم کے مختلف حصے کاٹ کر جدا کر دیے گئے ہوں اور اس آخری زخم نے ثابت کیا کہ پہلے دو صدے اس کے مقابلے میں کم تھے پھر باقی کے دن اسی امید پر گزر گئے کہ شاید یہ جدائی پالی جاسکے شاید اس دوری کو سمیٹا جاسکے شاید کوئی معجزہ رونما ہو جائے وہ پھر سے تینوں بہن بھائیوں سے مل سکے مگر اب معجزوں کا زمانہ تو نہیں تھا ہاں البتہ اس کے ارد گرد کے ماحول نے اسے مزید اپنے خول میں سمٹنے پر مجبور کر دیا۔

عاکف چچا جو آخری بار اسے مئی کے کمرے میں چھوڑ کر گئے پھر کئی ماہ تک وہ ان کی شکل بھی نہ دیکھ سکی۔ اسے ہمہ وقت مئی کے کمرے میں رہنا پڑتا اور اس دوران اگر نرگس آنٹی مئی کے کمرے میں آتیں بھی تو وہ یا تو سوتی بن جاتی، بیٹھی ہوتی تو نگاہوں سمیت جیسے خود کو زمین میں پیوست کر لیتی کھڑی ہوتی تو رخ بدل کر خواجوا کوئی چھوٹا موٹا کام کرنے لگتی۔ نرگس آنٹی کو دیکھتے ہی اسے خیال آتا کہ کہیں وہ اسے ہاتھ پکڑ کر کسی ٹیم خانے میں نہ چھوڑ آئیں۔ یہاں کم از کم کبھی نہ کبھی آپنی وغیرہ سے ملنے کی امید تو تھی۔

سارہ اکثر مئی کے کمرے میں آتی۔ سارا کمرہ الٹ پلٹ دیتی مئی کے بستر پر اچھلتی سارے کھلونے اٹھا کر بیڈ پر لے آتی پھر خواہ مئی سو رہی ہو تیس وہ کوئی پروانہ کرتی اماں کی طرح فضلہ اسے بھی پسند نہیں آتی تھی جس کا اظہار اس نے برملا مئی کے سامنے فضلہ سے پہلی ملاقات ہی میں کر دیا تھا۔ مئی نے ٹوکا تھا تو وہ کندھے اچکا کر بولی۔

”جو مجھے نہیں پسند وہ نہیں پسند۔“ کوہ فضلہ سے ایک آدھ سال بڑی تھی۔

”نرگس! یہ فضلہ کو کسی اسکول میں داخل کروادو۔ اسے اب رہنا تو یہیں ہے نا۔“

”اٹھویں دن مئی نے نرگس آنٹی سے کہا تھا وہ کافی سارے پیپرزمی سے سائن کروانے لائی تھیں۔ ان کا مزاج

پہلے ہی براہور ہاتھا۔ فضلہ نے ان کے اندر داخل ہوتے ہی اندازہ لگالیا تھا۔

”مہی! اسے میں نے صرف آپ کی وجہ سے آپ کے کہنے پر ہاں رکھا ہے اور اب اسے ہمیں رہنا ہے آپ کے پاس۔ اسکول مدرسوں کے چونچلے میں نہیں اٹھا سکتی۔ اگر آپ کو منظور ہے تو اسے رکھیں ورنہ عاکف اسے واپس پھینک آتا ہے۔ میں اس قسم کی کوئی ہڈک نہیں پال سکتی، آپ بھی آئندہ یہ اسکول و عیرو کا خیال نہ کیجئے گا۔ یہ شکر کریں کہ میں نے اسے یہاں رہنے کی اجازت دے دی ہے۔“

ان کا لہجہ حد درجے کٹھن اور نفرت انگیز تھا۔ اس کے سمجھے ذہن نے ان کی بات پر دوسری بار سوچا کہ کاش وہ نہ ہوتی۔ پہلی بار ماما پاپا کے بعد اسے یہ خیال آیا تھا۔

”نرگس! ڈونٹ لی سوروڈ (اتنی سخت نہ بنو) کچھ تو خیال کرو۔ معصوم بچی ہے، اس کا بھی دل کرتا ہو گا پڑھنے کو، اسکول جانے کو۔“ مہی نے نرگس آنٹی کو ٹوکا۔

”مہی پلزز! Mind your own business“ (اپنے کام سے کام رکھیں) وہ انتہائی بدتمیزی سے گویا ہوئیں، ”ان کی نظر میں کوئی لحاظ نہیں تھا۔“ آپ ان پیپر زپر سائن کریں اور اس کے دلی جذبات کا خیال چھوڑیں۔ میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہے کہ اس فالتو بحث میں پڑوں اور آپ بھی یہ فضول ہمدردیاں کرنا چھوڑیں ان نیکیوں کا کچھ صلہ نہیں ہوتا۔“

وہ فائل ان کے آگے کھول کر ایک کے بعد ایک ورق لٹتے ہوئے بولیں، ”اور آپ کا وکیل اتھارٹی پیپر کب تیار کرے گا وہاں ہو گئے مجھے سنتے سنتے۔“

”میں نے کل فون تو کیا تھا کہ رہا تھا کہ آج ضرور آئے گا بہر حال ایک دو روز میں تم یہ سائن وغیرہ کی زحمت سے بھی بچ جاؤ گی۔ یہ لو کہیں اور تو سائن نہیں کرنے۔“ انہوں نے پین بند کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں بس یہی کرنے تھے۔“ وہ سیدھی ہوتے ہوئے بولیں۔

”نرگس! تم نے ڈاکٹر افتخار کو فون کر کے نہیں بلایا۔ میں نے کل کہا تھا اور آج فون بھی کیا تھا وہ اپنے کلینک میں نہیں تھے۔ تم یہ کرو مجھے تو رات بھر نیند نہیں آئی اوپر سے یہ کھانسی نہیں سونے دیتی۔ پتا نہیں کیا مسئلہ ہو گیا ہے۔“ انہیں پھر سے کھانسی آنے لگی۔

”مہی! ڈاکٹر افتخار تو آج کل یو کے گئے ہوئے ہیں، دو چار روز میں آجائیں گے تو ان سے کہہ دوں گی، آپ سیلنگ پلزلے لیا کریں، اب علاج وہ کر رہے ہیں تو کسی اور ڈاکٹر سے کنسلٹ کرنے کا کیا فائدہ؟ بس اب چلی ہوں بڑے کام میں آج کل آفس میں، اوکے مہی! وہ مہی کا جواب سنے بغیر ٹک ٹک کرتی باہر نکل گئیں، مہی گرا سانس لے کر رہ گئیں۔

پھر نہ تو ڈاکٹر افتخار ہی آئے ان کا یو کے کا ورث چھ ماہ پر پھیل گیا تھا اور نہ ہی مہی کی کوشش کے باوجود فضلہ کو اسکول میں داخل کرایا گیا۔ ہاں نرگس آنٹی کے نام اتھارٹی پیپر ضرور تیار ہو گیا۔ جس کے بعد وہ بیڑھ ماہ تک مہی کے کمرے میں ہی نہ آئیں کیونکہ وہ ان دونوں بہت بڑی تھیں فیکٹری مل اور ایک ماٹی اسٹوری پلانز کی خرید میں۔

مہی کی کھانسی بڑھتی گئی ان کی فیکٹری بالکل ختم ہو گئی، وہ بیماری رات جاگتی رہتی تھیں اور کھانسی راتیں فضلہ نیند سے بو جھل سرخ آنکھیں لے آئیں، مہی کوئی سیرپ دیتی تو کبھی کوئی مگر کھانسی کی شدت میں کمی نہ آئی ملازمہ سے اسے پتا چلا کہ عاکف چچا امریکہ گئے ہوئے ہیں ایک ہفتہ پہلے وہ مہی سے ملنے آئے تھے جب وہ سو رہی تھی۔

مہی نے اس کے لیے کٹاپیں منگوائی تھیں وہ اسے خود ہی پڑھانے لگی تھیں لیکن ان کی اپنی صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی۔

”مہی! آپ کسی اور ڈاکٹر کو بلا لیں آپ کی طبیعت بہت خراب ہے۔“ ایک دن دُرتے دُرتے اس نے مشورہ دیا۔

”ہاں بیٹا یہی سوچ رہی ہوں میں بھی، لیکن آج کل نہ تو عاکف گھر پر ہے نہ نرگس، ڈاکٹر خالد میرے پہلے معالج تھے ان کے کلینک آج فون کروں گی۔“ وہ سوچتے ہوئے بولیں۔

پھر اگلے روز انہوں نے فون کر کے ڈاکٹر خالد کو بلا لیا۔ انہوں نے مہی کو دھیان سے چیک کیا اور کچھ ٹیسٹ بھی لکھ کر دیے۔ میڈیسن تو مہی نے ملازم سے منگوا لیں مگر ٹیسٹوں کے لیے لیبارٹری جانا ضروری تھا اور جب چند دن بعد نرگس آنٹی اور عاکف چچا امریکہ سے آئے تو نرگس آنٹی مہی سے لڑیں کہ ”آپ نے ڈاکٹر خالد کو چیک کیوں کروایا اس نے پچھلی بار بھی آپ کے کیس کو خراب کیا تھا۔ کتنا عرصہ لگا تھا ڈاکٹر افتخار کو سب Recover کرنے میں اور آپ ہمیشہ اپنی من مانی کرتی ہیں، پھر اس بڑھے کی اوٹ پٹانگ میڈیسن لے لی ہوں گی پھر مسئلہ ہو جائے گا۔ ڈاکٹر افتخار نے اگلے ماہ آہی جانا تھا مگر آپ کو کون سمجھائے۔“

”پتا نہیں نرگس آنٹی ہر وقت اتنے غصے میں کیسے رہ لیتی ہیں۔“ ان کے شکوہ ں بھرے ماتھے کو دیکھ کر اس نے سوچا۔

”نرگس! مجھے بہت تکلیف تھی رات رات بھر نہیں سو سکتی تھی اس کھانسی کے ہاتھوں اور خالد کی دوا کھاتے ہوئے تو مجھے ابھی صرف ایک ہفتہ ہوا ہے، لیبارٹری ٹیسٹ جو اس نے لکھ کر دیے تھے وہ تو میں نے کروائے ہی نہیں پھر بھی خاصا افادہ ہوا ہے رات کو کچھ سکون رہتا ہے۔“ مہی کی آواز خوا خواہ بھر آئی۔

”بہر حال جب تک ڈاکٹر افتخار نہیں آجاتے آپ یہ میڈیسن نہ کھائیں، میں تو یہی کہوں گی آگے آپ کی مرضی۔“ وہ بے رخی سے کہتے ہوئے کھڑی ہو گئیں، ”میں سوئے جا رہی ہوں سفر نے آج بہت تھکا دیا ہے، آرام کروں گی۔ اب آپ بھی آرام کریں اوکے مہی!“

وہ کبھی بھی مہی کا جواب نہیں سنتی تھیں، ذرا سا جھک کر انہوں نے مہی کے ماتھے کو ہونٹوں سے ہلکا سا ٹچ کیا اور باہر نکل گئیں۔

اگلے ماہ جب ڈاکٹر افتخار آئے تو مہی کی تکلیف حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ کتنے دن لگ گئے ان کے ٹریٹمنٹ میں، کتنے ہی لیبارٹری ٹیسٹ کروائے گئے، جن کے رزلٹ سب کے لیے شاکنگ تھے، مہی کو کوئی بی تھی ان کے پیچھے پڑے بری طرح سے تباہ ہو چکے تھے۔

”میں نے بکواس کی تھی اس بڑھے کھوسٹ مینٹل ڈاکٹر کی دوائیں مت کھائیں۔ وہ تو اب کسی جانور کا علاج کرنے کے قابل نہیں رہا، مگر آپ کو تو پرانی کلاس فیلوشپ کی یاد ستاتی تھی، کبھی آپ نے کسی کی سنی ہے اب مزہ لکھیں بیٹھے بٹھائے نیاروگ لگ گیا۔“

نرگس آنٹی کی بلند آواز کے سامنے مہی کی پست منمنناہٹ سنائی ہی نہ دی۔ ”اور بیماری دیکھیں کیا غریبوں اور مفلوک الحال لوگوں والی لگی ہے۔“ وہ حقارت سے بولیں۔

پھر نرگس آنٹی نے ان کے کمرے میں آنا بالکل موقوف کر دیا۔ ایک روز عاکف چچا نرگس آنٹی کا پیغام مہی کے لیے لائے۔

”ڈاکٹر نے آپ کو کھلی ہوا میں رہنے کو کہا ہے۔ اس لیے آپ کو انیکسی میں شفٹ کیا جا رہا ہے، انیکسی بہت ہوا ہے۔“ مہی روز نو کروں نے مہی کا سامان انیکسی میں شفٹ کر دیا اور ساتھ ہی ان کو بھی وہیل چیئر سمیت۔

نرگس آنٹی کے اس بے درد رویے نے مہی کو جیسے توڑ کر رکھ دیا۔

”کاش میں نے اپنے ہاتھ کاٹ کر اس کو نہ تھمائے ہوتے۔ میں نے کتنی بڑی غلطی کی۔“ وہ خود ہی ہرزاتی رہ گئیں۔

81

ڈاکٹر افتخار کی تجویز کردہ میڈیسن سے بھی انہیں کوئی خاص افادہ نہیں ہو رہا تھا اور کچھ ویسے بھی دوا لینے کے معاملے وہ خاصی لا پرواہ ہو گئی تھیں۔ ان کا مرض بڑھتا جا رہا تھا نرس آنٹی کھڑے کھڑے آئیں کھڑے کھڑے حال چال پوچھ کر چل دیتیں۔ سارہ تو اب آتی ہی نہیں تھی۔ فضا ان کی دیکھ بھال اور دل بہلانے پر مستقل مامور کر دی گئی تھی۔ اس کا بچپن ان کی بیماری اور ان کے پریشان برہائے میں کہیں گم گیا تھا۔ چھوٹی سی عمر میں اس نے بڑے بڑے غموں کو جسم دیکھ لیا تھا۔ اسے تو یاد ہی نہیں رہا تھا کہ وہ کبھی کھلونوں سے بھی کھیلے۔ ایک ایک کر کے دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں ڈھلتے گئے اور وقت کو روکنے والا کون ہے۔ سات سال گزر گئے مئی کو اب کھانسی کے ساتھ ساتھ خون بھی آنے لگا تھا، شروع شروع میں تو وہ بہت گھبرائی تھی مگر پھر عادی ہوتی چلی گئی۔ مئی نے اس کے لیے اب یو رر رکھ دیا تھا۔ اپنے ذاتی پیسوں پر جس کا نرس آنٹی کو بہت قلق تھا۔ انہوں نے مئی کی پاکٹ منی کم کر دی تھی۔ مگر مئی نے پروا نہیں کی تھی۔ آج کل ان کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے وہ میٹرک کے پرائیویٹ امتحان کی تیاری کر رہی تھی اور مئی کا مرض جیسے آخری اسٹیج سے آن لگا تھا۔ اب نہ بوڑھی پسیلیوں میں کھانسنے کا دم رہا تھا اور نہ جسم میں اتنی طاقت کہ خون اگل سکے۔

”میڈم! آپ انہیں مری سینی ٹوریم میں بھیج دیں یہاں اب ان کو رکھنا بے کار ہے۔“ ڈاکٹر افتخار نے اس دفعہ نرس آنٹی سے صاف کہہ دیا۔

وہ خود بھی اکتا چکی تھی مئی کی اتنی لمبی بیماری سے، فوراً ”اماں ہو گئیں۔ مئی نے البتہ انکار کر دیا کہ وہ نہیں جائیں گی مگر ان کی سنتا کون تھا اگلے ہی ہفتے ان کا سامان پیک کر کے گاڑی میں رکھوا دیا۔ ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر ان کا نیجر کمال تھا اور پچھلی سیٹ پر مئی کا بوڑھا ادیب مواء جو اور جھریوں بھرا سفید کورے لٹھے جیسا چہرہ فضا کی گودی میں گاڑی لاہور سے مری کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔

سات طویل سال جیسے پیک جھکتے میں گزر گئے تھے۔ دیکھنے کو ایسا ہی لگتا تھا مگر سوچنے بیٹھو تو جیسے سات صدیاں تھیں جو قطرہ قطرہ اس کی روح کے اندر اترتی تھیں اور جب وقت کو لمحوں میں ناپا جائے تو ایسے ہی لگتا ہے جیسے وقت گزر نہیں رہا بلکہ ہم پر ہماری بے بسی پر ہنس رہا ہے۔

عبیہ تو اکثر ہی آجایا کرتی تھی غزالہ آنٹی کے ساتھ اس سے ملنے وہ خود بھی فون کر لیا کرتی تھی عبیہ میں جیسے کوئی پتہ نہیں آیا تھا۔ ان سات سالوں میں بھی وہ کسی ہی تھی ہر طرح کے حالات میں پرسکون رہنے والی جذبات پر لاجب کو ترجیح دینے والی اور ایمن کے نزدیک کول بائر ٹوڈ ہر چیز کو ہوا فٹے کو بے حد سرسری انداز میں لیا کرتی تھی۔ بڑی سے بڑی بات بھی اس کے نزدیک عام سی ہوتی تھی۔ جب ایمن اس اہم بات پر کڑھ کڑھ جایا کرتی تھی کہ مہن کے فون کو آئے مہینے سے اوپر ہو چلا ہے تو عبیہ لا پرواہی سے کہہ دیتی ”اسٹڈیز میں بڑی ہو گا کر لے گا دو چار دنوں میں اس میں اتنا کاتھیس ہونے کی کیا ضرورت ہے ایمی! تو ایمی جی جان سے جل کر رہ جاتی۔

”عبیہ! اتنے دن تو اس نے کبھی بھی نہیں لگا گئے ہفتے پندرہ دن بعد تو لازمی فون کر لیتا تھا اور اب تو مہینہ ہونے کو آیا ہے۔ معلوم نہیں کیا بات ہے۔ میرا تو دل تھرا رہا ہے۔“ وہ واقعی ان دونوں اس بات پر بے حد پریشان تھی۔ ”ایمی! تمہارے دل کو تو وہی عادت ہے گھبرا جانے کی۔ کیا بات ہوگی بھلا۔ وہ اسٹڈیز میں بڑی ہو گیا کہیں میرا کوہ لوک کے ہوں گے فون کی کچھ پرالیم ہوگی یا کوئی اور گھریلو مسئلہ“ اس سے زیادہ اور کیا ہو گا مجھے بتاؤ بھلا۔“ عبیہ زچ آجاتی اس کی اس درجہ حساسیت سے۔

”انکل زبیر نے فون کرنے سے منع کر دیا ہو گا کہ بل زیادہ آتا ہے وہ اسی طرح کے ہیں Materialistic (مادہ پرست)۔ پیالی پائی جوڑنے والے۔“ وہ اپنے خدشے کا اظہار کرتی۔

”بھئی اگر ایسا کیا بھی ہو گا تو صحیح ہے۔ ظاہر ہے ایک بندہ جب محنت کرتا ہے تو روپے کو بے مقصد اڑاتے ہوئے اسے تو دکھ ہو گا اور یہ فون تو ہے ہی آج کل کے زمانے کی عیاشی، فضول میں محض خیر خیریت دریافت کرنے میں دو ڈھائی ہزار برباد کر دے، یہی کام دس روپے کا خط لکھ کر بھی آرام سے ہو سکتا ہے۔ تمہارے اصرار کی وجہ سے پچھو ہر ہفتے دس بارہ منٹ کا فون کروا دیتی ہیں مہن سے۔ تمہیں خود سوچنا چاہیے۔“ وہ الناء سے تڑپتی۔

عبیہ کی حقیقت پسندی اسے آگ لگا جاتی۔ ”کیا سوچنا چاہیے ہمیں ایک تو ہمارے بھائی کو ہم سے اتنی دور لے گئیں۔ پتا نہیں کیسے رکھا ہوا ہے مہینے مہینے بعد فون کروا دیتی ہیں جس سے اور تڑپ بڑھتی ہے۔ سات سال ہو گئے ہیں اس کی شکل دیکھئے ہوئے۔ ایک ہی بھائی تھا ہمارا، کون سے پانچ سات تھے جو انہوں نے یوں ہمیں تقسیم کر دیا اس وقت ان ظالموں نے کچھ نہیں سوچا۔ اب اگر وہ سوچ پاس کا فون کروا دیتی ہیں تو کون سا احسان کرتی ہیں۔ جدائی سے بڑھ کر کوئی ظلم ہو گا وہ بھی جیتے جی ایسے ہمیں ایک دوسرے سے دور کر دیا۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”ایمی! جہاں اتنا صبر کیا ہے وہاں کچھ اور سہی اور پھر ویسے بھی وقت تو گزر رہا ہے اچھا برا گزر ہی گیا ہے نا۔ اب تو تمہیں حالات کو سمجھ لینا چاہیے جتنے ہمارے سکھ کے قہر توں کے دن تھے سو گزر گئے کہ اللہ نے یہی کچھ لکھ رکھا تھا اب بھلا کوئی اللہ سے بھی لڑ سکتا ہے۔“ عبیہ نے اس کا ہاتھ تھام کر محبت سے اسے سمجھایا۔

”نہ کوئی بندوں سے لڑ سکتا ہے نہ اللہ سے تو بتاؤ ہم جیسے پھر کس سے شکایت کریں جا کر۔“ وہ رونے لگی تھی کس کا قصور ہے پھر اس سارے قصے میں کون ظالم ہے؟

”کوئی بھی نہیں نہ ہم نہ یہ سارے لوگ۔ انہوں نے بھی وہی کیا جو حالات کا تقاضا تھا اور تھوڑا بہت نرم گرم تو ہر کوئی اپنے حساب کے مطابق ہو سکتا ہے۔ اس میں اس کا بھی کوئی قصور نہیں بلکہ الناء کا ہم پر احسان ہے کہ انہوں نے ہمیں سنبھالا اور ایمی! اگر انسان شکایت اور شکوے کا خیال دل سے نکال دے تو یقین کرؤ زندگی بہت نہ سہی پھر بھی سہل گزر سکتی ہے۔ اس شکوے اور شکایت سے کسی پر کوئی اثر نہیں ہوتا، الناء اپنا ہی خون جلتا ہے دماغ خراب ہو جاتا ہے اور منفی خیالات جنم لیتے ہیں کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔“ عبیہ نے پتا نہیں کن تجربات اور تجزیات کی بجائی سے گزر کر یہ سب کچھ سیکھا تھا لیکن ہر انسان اپنی ہی فطرت کے مطابق ہی سیکھ سکتا ہے اور جو وہ سیکھتا ہے وہ دوسروں کو اس درجے تک نہیں سکھا سکتا۔ ہر ایک کی بصیرت اتنی ہی روشن ہوتی ہے جتنی کہ وہ تمنا کرتا ہے۔

”منفی خیالات جنم لیتے ہیں تو اس میں بھی میرا قصور ہے، بتاؤ فضا کے بارے میں تمہیں کیا معلوم ہے، کبھی ٹاکف پچا کو خیال آیا کہ وہ اسے ملوانے لے آئیں۔ کوئی سات سمندر پار تو نہیں بس رہے وہ۔ اسی ملک کی سرحدوں کے اندر ہیں اور انہوں نے ہمیں صدیوں کے فاصلے پر کھڑا کر دیا ہے۔ اور میں تم اتنے بے بس ہیں کہ چاہتے ہوئے بھی اس معمولی فاصلے کو دوری کو نہیں مناسکتے۔ اس کی خبر نہیں لے سکتے۔ عبیہ ہم اتنے مجبور کیوں ہیں میں کیا کروں مجھے فضا کا خیال بہت سنا تا ہے۔ میرا دل کتا ہے وہ اچھے حالوں میں نہیں ہے۔ اب ان خدشات میں تو میرا کوئی قصور نہیں۔“ وہ اس کے کندھے سے لگ کر رونے لگی۔

”ہاں ایمی! تم درست کہتی ہو فضا کو دیکھئے اتنے برس ہو گئے اکٹھے سات سال کم نہیں ہوتے۔ پتا نہیں اب وہ کیسی ہو گئی ہوگی۔ اسی طرح بھولی بھالی معصوم سی پیا۔“

وہ دور ایس کھو گئی جیسے تصویر میں سات سال کے اتار چڑھاؤ کے غبار میں سے فضلہ کو تراش رہی ہو۔ ”ایک باب فضلہ میٹرک میں ہوگی تاہنی اس سال میٹرک کر لے گی ہے نا؟“ وہ کچھ چونک کر بولی جیسے حساب لگا رہی تھی۔

”جتنا نہیں شاید وہ کچھ بتاتی بھی تو نہیں۔“ ایمین نے اس کے کندھے سے سر اٹھا کر اپنے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں یہ بھی ہے، غزالہ آنٹی سے میں نے ایک دوبار کہا بھی وہ لے بھی جاتی تھی لیکن لاہور میں ان کا کوئی رشتہ دار نہیں اس لیے وہ ہر بار چپ کر جاتی ہیں۔ وہ عائف چچا کی طرف کبھی نہیں ٹھہریں گی ورنہ میں ہی جا کر فضلہ سے مل آتی۔“ عبیدہ بولی۔

”پھر تم کہتی ہو جلتے کڑھنے سے کیا فائدہ؟ پھر میں اور کیا کروں اگر مومن اور فضلہ بھی تمہاری طرح نزدیک ہوتے؟ ہم اس طرح مل لیا کرتے تو شاید میرا دل اس قدر بے چین نہ ہوتا۔ حالات پر قرار آجائے مگر ان دونوں کی دوری۔؟“ اس نے گہرا سانس لیا ”جتنا نہیں کب تک یہ دوریاں رہیں گی۔“

”ہوں۔۔۔“ عبیدہ بھی چپ تھی۔

”عبیدہ! تمہاری اسٹڈیز کیسی جا رہی ہے؟ ایف ایس سی میں تمہارا میرٹ بن جائے گا نا۔“ اس نے موضوع بدلا۔

”انشاء اللہ اسٹڈیز تو میری اسے دن جا رہی ہیں۔ تمہیں معلوم ہے ناسیلف اسٹڈیز کی وجہ سے میں اپنی پڑھائی میں ہمیشہ ٹھیک رہی ہوں باقی رہا میرٹ تو دیکھو وہ بھی بن ہی جائے گا۔ امتیذ تو ہے سب پیچرز کا بھی یہی خیال ہے۔ بس ایک بار ڈاکٹر بن جاؤں ”ایک پھر میں فضلہ کو ادھر ہی لے آؤں گی کراچی میں“ بلکہ ڈاکٹر بھی کیا بس میڈیکل میں ایڈمیشن ہو گیا تو سمجھو پہلی سیڑھی پر قدم آجائے گا تم دعا کرنا۔“

”وہ تو میں ہر وقت کرتی رہتی ہوں تم تینوں کے لیے تم ڈاکٹر بن جاؤ میں بھی بس اس سال بی ایس سی کے بعد کہیں جاب کر لوں گی تو دیکھنا اگلے سال ہی فضلہ کو یہاں لے آؤں گی۔ جاب کے بعد تو مجھے کوئی نہیں روک سکے گا نا بس اب یہ فور تھ ایر اور پھر رزلٹ کے بعد جاب اس بات سے مجھے تایا جی اور تائی جی بھی نہیں روک سکیں گی بہت ڈر لیے اب نہیں ڈروں گی۔“ وہ عزم سے بولی۔

”اگر تایا جی نے کہا کہ وہ ایگزیم کے بعد تمہارے ہاتھ پیلے کر دیں گے تو پھر؟“ عبیدہ نے اسے چھیڑا۔

”عبیدہ!۔۔۔ اس قسم کا بے ہودہ خیال بھی ذہن میں نہ لانا بس اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ جب تک ہم سب اکٹھے نہیں ہو جاتے اور اپنے گھر نہیں چلے جاتے۔“ اس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں اس خیال سے۔

”اے گھر۔؟“ عبیدہ کھو سی گئی۔

”ہاں تمہیں کوئی شک ہے؟“ ایمین نے اسے گھورا۔

”ایمین تم نے دیکھا ہے جب چڑیا کے ننھے بچے اڑنا سیکھتے ہیں اور گھونسلے سے باہر پہلی اڑان لیتے ہیں اور پھر کچھ ہی دنوں میں کھلے بسیط آسمانوں میں لمبی لمبی اڑانیں پر پھیلا کر لیتے ہیں تو پھر گھونسلے میں واپس نہیں آتے۔ ان کے نکلنے سے بنے گھر وندے ان کو دیکھنے کو ترس جاتے ہیں۔ پھر وہ نہیں اور جا کر تنکے جوڑ کر نیا آشیانہ بناتے ہیں

And It's natural (اور یہ قدرتی ہے) کائنات کا جنم اکالی سے ہوا تھا اور اس کا اختتام بھی Unit ہے م جاتی ہوتا۔“ وہ تائی جی کے غرغروں غرغروں کرتے کپڑوں پر نظر جمائے مدھم آواز میں بول رہی تھی۔

”عبیدہ! پرندوں اور انسانوں میں فرق ہوتا ہے گھراٹا بھی نہیں۔ پرندوں کا آشیانہ نکلنے کا گھر وندا نہیں یہ کلا آسمان ہوتا ہے اور آسمان تو نہیں نہیں بدلتا انسان بھی جب ایک بار گھر بنا لیتا ہے تو چاہے کتنی ہی اڑانیں کیوں نہ

لے لے واپس وہیں آتا ہے۔“ اسے عبیدہ کی بات اچھی نہیں لگی تھی۔

”ہاں۔۔۔ کون جانے، اگلی اڑان کس کو کہاں لے جائے۔ میں اور تم سوچنے پر تو قادر ہیں کرنے پر تو نہیں نا؟“ وہ کپڑے جھاڑتے ہوئے بیڑھیوں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”انسان کی تقدیر اس کے خیالات بناتے ہیں انسان جو سوچتا ہے خدا اسے ویسا ہی دکھاتا ہے۔ اس لیے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی کہ ہم کبھی اکٹھے نہیں ہو سکیں گے۔ انشاء اللہ ہم اپنے پاپا ماما کے گھر ایک روز ضرور اکٹھے ہوں گے۔“ وہ اسی عزم سے بولی۔

”آمین اللہ کرے ایسا ہی ہو، چلو اندر چلتے ہیں۔“ وہ کہہ کر اندر کی طرف مڑ گئی تو ایمین بھی اٹھ کر اس کے پیچھے چل پڑی۔

♥ ♥ ♥ ♥

مری دیکھنے کا اسے بہت شوق تھا، بلکہ وہ عمر کے جس حصے سے گزر رہی تھی اس میں بھی کو گھومنے پھرنے اور نئی جگہیں دیکھنے کا شوق ہوتا ہے۔ مری پاکستان کا سوئٹزر لینڈ، ملکہ کو ہسار، کتابوں نے میڈیا نے اس علاقے کو اس طرح سے دکھایا گیا ہے کہ خواہ مخواہ دل میں اشتیاق پیدا ہوتا ہے کہ سوات کاخانہ نہ سہی مری تو دیکھ لیا جائے اور اس کا یہ شوق پورا بھی کس طرح ہو رہا تھا کہ ممی کی موت اور زندگی کی وحشت اس کے سر پر سوار تھی اگر ممی نہ رہیں تو۔۔۔

”یہ“ تو“ ایک خوفناک سوالیہ نشان بن کر دن رات اسے ڈر رہا تھا۔ ممی کے اس ہڈی بولے وجود کی وجہ سے ہی تو وہ اس گھر میں تھی اگر یہ نہ رہیں تو میرا کیا ہو گا۔ خوف سے اسے جھرجھری آجانی باقی رشتہ داروں نے تو بھی خبر بھی نہ لی تھی۔ تایا جی، غزالہ آنٹی اور سفینہ چھو پھو کوئی بھی تو کبھی ملنے نہیں آیا تھا۔“ اگر ادھر سے نکال دی گئی تو کیا وہ لوگ مجھے قبول کر لیں گے جن کی صورتیں بھی اب مجھے یاد نہیں۔“ وہ ان دوسو سوں سے گھبرا اٹھتیں۔

مری سنی ٹوریم جہاں ہم معاشرے کے بگاڑ کو لا کر تانا بانا چاہتے ہیں۔ معاشرہ انسانوں کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک نہ کرے تو کسی معاشرے میں کسی سنی ٹوریم کا کسی اولاد ہائل کھو جود نہ ہو مری سنی ٹوریم کیوں تھا کیونکہ لوگ ابھی بھی بھوک سے، سیلن زدہ تنگ و تاریک کونھڑیوں سے، جسموں کو اندر ہی اندر کھاجانے والے غم و الم کا شکار ہو کر خون اگلنے لگتے تھے وہ خون جو زندگی کی علامت ہے، ڈرا کم پڑ جائے تو جان کے لالے پڑ جاتے ہیں، ایک ایک قطرے کے لیے لوگ بھیک مانگنے سے دریغ نہیں کرتے ہاتھ پھیلا پھیلا کر جسموں کے اندر خون کے اس خزانے کو بناتے ہیں اور جب یہی سرخ لاوا بغاوت کرتا ہے تو انسان اسے اپنے جسم سے باہر اگلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ مرض کتنا تکلیف دہ کتنا اذیت ناک ہے کہ انسان خود چاہتا ہے کہ کاش زندگی کی ڈور کو کاٹ کر مختصر سے مختصر کر سکے۔ اس کا اندازہ اسے ممی کی حالت دیکھ کر ہو رہا تھا وہ موت مانگ رہی تھیں زندگی کے زندہ لمحوں سے موت مانگ رہی تھیں اور موت ان سے آنکھ پھولی کھیل رہی تھی۔ بل میں ایک جان کے پاس اور بل میں دور کھڑی ہو کر ان کی بے بسی پر مسکرائے لگتی۔ اس وقت انہیں موت سے بڑھ کر اور کسی چیز میں عافیت نظر نہیں آرہی تھی اور دولت کی فراوانی ان کے لیے اس سہولت کے مہیا کرنے کے رستے میں دیوار بنی کھڑی تھی۔

سنی ٹوریم میں آتے ہی کچھ دنوں بعد ان کی طبیعت سمجھل گئی تھی، کچھ وہاں کی فضا آب و ہوا، کچھ مرض کے مطابق علاج، دوسرے گھریلو ماحول کی ٹینشن سے دوری۔ یہاں ان کیسی میں دور دور سے آتی نرگس آنٹی کی بشاش مالکانہ حقوق کا بھرپور اظہار کرتی آواز ان کی تکلیف کو بڑھا دیتی تھی پھر سارہ کا آتے جاتے ان کیسی کے دروازے پر کھڑے ہو کر ”ہائے گریٹی! ہاؤ آریو“ کہنا ان کے اندر کی رت پ کو اور بھڑکا دیتا تھا۔ اندر کو بھی میں باہر کے لان میں جب بزنس

بارشیز ہوتیں کھٹ کھٹ گاڑیوں کے دروازے کھلتے بند ہوتے خوشی بھرے نارمل قہقہے کاروباری آوازیں تجارتی دھیمی دھیمی سرگوشیاں، سرسراہٹیں قدموں کی آہٹیں اور دروازے کے پاس آکر دوپہلی جاتیں تو ان کی کھانسی شدید ہو جاتی یہاں کم از کم ان تکلیف دہ چیزوں سے انہیں نجات مل گئی تھی۔
ان کے مری آنے کے چوتھے روز نرس آنٹی کا فون آیا تھا۔ مئی کی خیریت پوچھ رہی تھیں فضا نے کہا کہ اب ان کی حالت بہتر ہو رہی ہے ڈاکٹر زکچہ پر امید ہو گئے ہیں کہ بہت جلد نہ سہی پھر بھی اب موت کو جیت اتنی آسانی سے نہیں ملے گی۔ اسے یقین تھا کہ آنٹی خوش ہوں گی اس خوش خبری کو سن کر لیکن انہوں نے ”اچھا ٹھیک ہے خدا حافظ“ کہہ کر ٹھک سے فون بند کر دیا پھر تین چار ہفتے ان کا نہ کوئی فون آیا نہ وہ خود۔

وہ صبح و شام ہرے بھرے لان میں مئی کی وہیل چیئر لے کر انہیں سیر کراتی، ان کے کمزور بوڑھے وجود کو گرم کپڑوں اور کبل میں چھپا کر وہ کتنی کتنی دیر باہر گھومتی رہتی۔ مئی کی بیماری کی ٹینشن اور اپنے مستقبل کی فکر کے باوجود بادلوں سے ڈھکا آسمان، ارد گرد کے ہرے بھرے نظارے اور اونچے اونچے سرخسوں پہاڑ اسے کتنی کتنی دیر تک مسحور کیے رکھتے۔ اس کا دل چاہتا وقت گھٹم جائے اور وہ ساری زندگی ان ہی نظاروں کو دیکھتی رہے یا ان کا حصہ بن جائے۔ اکتوبر کے مہینے میں جب میدانی علاقوں میں لوگ سردی گرمی کے مسموم موسم کو انجوائے کر رہے ہوتے یہاں بھرپور سردیاں ہو چکی تھیں۔ شام ہوتے ہی برقی دھند ہر طرف چھا جاتی اور وہ دھند جلائے کرہ گرم کیے مئی کے پاس بیٹھی کھڑکی سے ان کمزور شاموں کو اپنے اندر اتارتی رہتی۔

دن ایک ایک کر کے گزرتے جا رہے تھے وہ سنی ٹوریم کے ماحول کی عادی ہو گئی تھی۔ تین چار ماہ تو ہو چلے تھے انہیں یہاں آئے ہوئے لمبے لمبے ٹھنڈے کاریڈور میں سے بے آواز قدموں سے آتی جاتی نرسیں ان کے سفید برقی یونیفارم، ایک ہی لمبے، ایک ہی ٹون میں ہر مریض کو محبت سے ٹیٹ کرتی ہوئی تقریباً ”سب کی سب اس کی واقف بن گئی تھیں۔ ان میں زیادہ تر کرسچین تھیں۔ گھلے میں صلیب لٹکائے ان نرسیں کو اپنے پیشے سے عشق تھا اور وہ ان کے اس بچے جذبہ خدمت سے بے حد متاثر ہوئی تھی۔

وہ سہرے کا اینڈ تھا جب شام کے وقت کتنے دنوں سے چھائے بادلوں سے یکایک برف روئی کے گالوں کی طرح جہرے لگی یہ اس کی زندگی کا حیران کن منظر تھا۔ وہاں ہر آمدے کے ستون سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ سفید اور دھوا ہوا برف کو ہاتھ بڑھا کر۔ چھوٹے لگی۔

”فضہ اندر چلی جاؤ سردی ہے۔ تم نے بہت گرم کپڑے بھی نہیں پہن رکھے اور تمہاری مئی بھی تمہیں بلاری ہیں۔“ سسٹرمار تھامیڈیس کاٹھے اٹھائے اس کے قریب آکر بولی تو وہ سر ہلا کر اندر چلی آئی۔
”فضہ مجھے چیئر بٹھاؤ۔“ مئی اسے دیکھتے ہی بولیں تو اس نے چیئر ان کے بیڈ کے قریب کی اور انہیں سارا دے کر اٹھایا۔

”چیئر کو کھڑکی کے پاس لے چلو۔“ چیئر پر بیٹھ کر وہ بولیں تو وہ چیئر کو دھکیل کر کھڑکی کے پاس لے آئی۔ ان کی طبیعت آج کافی بہتر تھی۔

”میں اچھی ہوتی تو تمہیں سارا مری گھماتی، ہم مال روڈ پر جاتے مال روڈ مری کی جان ہے۔ پھر تم دیکھتیں کہ وہاں زندگی کتنے مزے سے لو لیاؤں ہوتی ہے۔ اس موسم میں ہی تو مال روڈ انجوائے کرتے ہیں۔ بھانت بھانت کے لوگ جن کو تکتے ہوئے انسان خود کو بھول جاتا ہے، میں جب نرس کے پایا کے ساتھ مری آتی تو ہم دونوں بہت انجوائے کیا کرتے تھے۔ سارا دن بات چیتوں میں ہاتھ ڈال کر مال روڈ پر گھومتے یہاں ہمارا اپنا کام تھا جو نرس نے دو سال پہلے فروخت کر دیا۔ اسے مری پسند تھیں اس نے میرا بھی خیال نہ کیا۔“ وہ کھانسنے لگیں اب ان کے سینے سے

کھانسی کی جگہ ”ہوں ہوں ہوں ہوں“ کی آوازیں نکلتی تھیں۔ ”مال روڈ پر شاپنگ بہت مہنگی ہوتی ہے میلن میں تمہیں ضرور کرواتی تھیں میری بہت خدمت کی ہے۔ خدا تمہیں اس کا صلہ دے گا میں اگر کچھ دنوں میں اچھی ہو گئی تو تمہیں مال روڈ پنڈی پوائنٹ گھوڑا گلی سب جگہوں پر لے کر جاؤں گی۔ تم بہت انجوائے کرو گی۔“ ان کی آنکھوں میں زندگی کی چمک دوڑنے لگی تھی۔

”مئی! میری تو رات دن دعا ہے اللہ آپ کو میری بھی عمر لگا دے۔ آپ جلدی۔ اچھی ہو جائیں، میرا آپ کے سوا اور ہے ہی کون۔“ وہ افسردگی سے بولی۔

”نہ میری کتنی بیٹی! تم اپنی عمر چوبہ بلکہ میری بھی باقی کی عمر تمہیں لگ جائے۔ میں تو اپنا حصہ پنا چکی۔ سب زندگی کے مزے لوٹ چکی، اب تو خدا سے دعا ہے وہ جلد سے جلد مجھے اپنے پاس بلا لے۔ پتا نہیں کیوں اتنی دیر ہو رہی ہے۔“ وہ جیسے کھو سی گئیں۔

”پلیز مئی! ایسا نہ کہیں۔“ وہ خوفزدہ ہو گئی۔

”بے وقوف! ہر کسی کا سہارا اللہ ہوتا ہے۔ تمہارے والدین اٹھ گئے تم زندہ رہیں نا، میں چلی جاؤں گی تو بھی وہ تو ہے نا۔ فضا وہ ہماری ضرورتوں سے ہم سے زیادہ آگاہ ہوتا ہے ہم تو سب کچھ انجانے میں ہی کرتے رہتے ہیں ہوتا تو وہی ہے جو اسے پسند ہوتا ہے پھر غم کرنے کا فائدہ؟“

”مئی! آپ کی طبیعت اب ٹھیک ہے نا؟“ وہ ان کے پاس آ بیٹھی۔

”ہاں بہت بہتر ہوں، اسی لیے تو کہتی ہوں یہاں تو اتنی نرسیں ہیں میری دیکھ بھال کرنے والی، تم اب پڑھ لیا کرو۔ چند ماہ بعد تمہارے امتحان ہونے والے ہیں بیٹا! یہ امتحان بہت ضروری ہیں۔ اللہ تمہیں اس میں کامیاب کرے فضا میرے بچے! مجھ سے وعدہ کرو۔“ وہ سفید ہڈیوں والا بوڑھا ہاتھ اس کی طرف بڑھا کر بولیں۔

”جی مئی! اس نے ان کا پیٹھ پیٹ کر ہاتھ تھام لیا۔

”میں رہوں یا نہ رہوں، تم یہ امتحان ضرور دو گی۔ پوری ہمت کر کے پوری بہادری سے۔“ مئی کو ایک دم سے کھانسی شروع ہو گئی۔

”آئی پراسس مئی! آپ ٹھیک ہیں نا۔“ وہ ان کی کھانسی سے گھبرا گئی۔

”ہاں ٹھیک ہوں، مجھے لانا۔“ ان کی کھانسی تیز ہو گئی تھی وہ چیئر گھسیٹ کر بیڈ کے پاس لائی اور بڑی مشکل سے انہیں سہارا دے کر بیڈ پر لٹایا۔ ان کے کمزور وجود کا وزن نہ ہونے کے برابر ہو چکا تھا۔

لیٹنے سے ان کی کھانسی اور شدید ہو گئی وہ نرس کو بلائے دوڑی۔

رات تک ان کی طبیعت خاصی بگڑ گئی فضا کے ساتھ سسٹرمار تھا اور ڈاکٹر یوسف ساری رات لگے رہے یا ہر برف برتی رہی اندر مئی کی جنگ زندگی اور موت سے شدید ہوئی گئی۔

سسٹرمار تھا کو مئی سے زیادہ اس سے ہمدردی تھی۔

”تم اتنی چھوٹی بچی ہو اور یہ اتنی بوڑھی پھر یہ تمہاری مئی کیسے ہوئیں؟“ ان کے یہاں آنے کے تیسرے دن وہ عقب سے پوچھ رہی تھیں۔

”یہ مئی اس لیے ہیں کہ یہ میری مئی ہیں اور میں ان کی بیٹی۔ خون کے رشتوں سے کیا ہوتا ہے۔ سسٹرا اصل رشتہ و محبت اور احساس کا ہوتا ہے نا۔“

اتنی ہی عمر میں ہی اسے اس فرق کا پتا چل گیا تھا جس کا علم لوگوں کو عمریں گزارنے کے بعد بھی نہیں ہوتا۔

”لیس یو آر رائٹ لٹل گرل، آئی ایڈ ماجر پور بھیشن (مجھے تمہارا جذبہ پسند آیا)“ وہ اس کے جذبے کو سراہتیں۔

اور اس رات کی صبح تو لگتا تھا جیسے ہونی ہی نہیں۔ اتنی طویل رات دو تین بار تو کھانسی کی شدت میں می کا سانس ہی کہیں گم ہو گیا تین بجے تو وہ بلک بلک کر رونے لگی۔
”ممی! ممی! خدا کے لیے نہ جائیں“ ممی! میرا آپ کے سوا اور کون ہے۔ اے خدا رحم کر دو سری بار موت کا یہ بھیا تک روپ مجھے مت دکھا۔ میں مرجاؤں گی۔ میں گدھر جاؤں گی۔ ممی! نہ جائیں۔ ممی! پلیز ممی! آپ کی چیز کہاں جائے گی۔“ وہ روتے روتے چیختے لگی۔

مارتھانے اسے پکڑ کر دوسرے کمرے میں لا بٹھایا۔
”یہ لوپانی پو اور گاؤ سے دعا کرو وہ بچوں کی دعا ضرور سنتا ہے۔ وہ تمہاری ممی نئی صبح کے ساتھ تمہیں گفٹ کر دے گا اگر تم سچے دل سے دعا مانگو گی۔ اب رونا نہیں ورنہ تمہاری ممی کا تکلیف بڑھ جائے گا۔“ وہ پانی کا گلاس اس کے ہاتھ میں دے کر باہر نکل گئی۔

”مجھے وضو کر کے نماز پڑھنی چاہیے پھر دعا مانگنی چاہیے۔“ اس کے دل نے راہ بھائی۔ اس نے اٹھ کر وضو کیا اور دو نفل نماز پڑھ کر سجدے میں گر کر گڑا کر خدا سے دعا مانگنے لگی مسجد میں گرے شاید اسے آدھا گھنٹہ ہو چلا تھا۔

جب کسی نے اسے کندھے سے پکڑ کر اٹھایا۔ آنسوؤں کی دہیز چادر آنکھوں کے آگے تھی اس نے بمشکل دیکھا وہ مارتھا بھی ستا ہوا چہرہ لیے۔

”چھوٹی معصوم لڑکی نہ روؤ خدا مہربان اور رحم کرنے والا ہے اس نے تمہاری دعا سن لی ہے“ اس کی بات پر اس کے سسے ہوئے دل نے سکھ کا سانس لیا۔

”کہاں ہیں ممی؟ وہ ٹھیک ہیں نا؟“ وہ بے قراری سے دروازے کی طرف بڑھی۔
”Feza! she is expire“ (فضہ وہ مر چکی ہیں) سسٹر مارتھا کی عقب سے آتی آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے وہ مڑ کر بے یقینی سے دیکھنے لگی۔

”ہاں مثل گرل! خدا نے تمہاری سن لی۔ دیکھا تھا تم نے وہ کتنی تکلیف میں تھیں۔ اب ان کو تکلیف سے رہائی مل گئی ہے۔ اتنے لمبے نارچر کے بعد تم نے ان کی بہتری کی“ ان کے اچھے ہونے کی دعا مانگی تھی نا تو وہ دعا قبول ہو گئی میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔“

وہ اسے سینے سے لگائے ہوئے ہوئے تھک رہی تھیں اور وہ چیخیں سننے میں دبائے گم صم ان سے چٹنی کھڑی تھی۔ جس بات کا ذکر تھا وہ ہو گئی۔ ساری شام خمی کی گفتگو کتنی فریش، کتنی اچھی تھی۔ اس کا دل خواہ مخواہ خوش امید ہو چلا تھا کہ اب ممی بالکل ٹھیک ہو گئی ہیں۔

”فضہ! جب چراغ بجھنے لگتا ہے نا تو وہ ایک بار ضرور بھڑک کر جلتا ہے With its full strength (اپنی پوری طاقت کے ساتھ) ہونا اسی لیے شام کو ان کی طبیعت اس قدر فریش تھی اسی لیے وہ تم سے اتنی باتیں کر رہی تھیں مجھے شام کو ہی شک ہو چلا تھا۔ ان کی آواز میں کھنک تھی جیسے کالج کے نکلے آپس میں نکراتے ہیں میں

چھین پٹانا چاہ رہی تھی لیکن پھر سوچا چند گھنٹوں کی خوشی ہے سمیٹ لو۔“ وہ کہہ رہی تھی اور فضہ کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

”آپ کیا ہو گا۔“ ممی نے وجود سے منسلک یہ سوال اس کے آنکھوں کے آگے ناچنے لگا تھا۔ زرخس آنٹی اسے برداشت کر لیں گی۔؟ دو سڑا کانٹوں بھر سوال۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ وہ سسٹر مارتھا کی بانسوں میں جھول گئی۔

وہ شام کی چائے بنانے جا رہی تھی جب ابراہان بھائی شاپرڈ کے ساتھ لدے پھندے کچن میں داخل ہوئے۔
”ممی! یہ سامان ذرا چائے کے ساتھ ٹرائی میں رکھ دینا۔“ آنسوؤں نے لفافے کاؤنٹر پر رکھے۔

”کوئی دوست آیا ہے آپ کا؟“ اس نے قبوے کی آنچ بلی کر تے ہوئے پوچھا۔

”ہاں دوست ہی سمجھو بہت قریبی۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولے۔

”چائے ڈرائنگ روم میں؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں وہیں بلکہ تم ہی لے آنا۔“ وہ جاتے جاتے بولے۔

”میں۔۔۔!“ وہ سوالیہ انداز میں بولی ”تائی جی کا پیاسے نا آپ کو۔“

”اوہو بھی کچھ نہیں ہوتا۔ میری کو لیگ ہے آفس کی تم ذرا جلدی کرو۔ اور یہ امی کہاں ہیں؟“ وہ جاتے جاتے

بولے۔
”وہ اپنے کمرے میں ہی ہوں گی۔“ وہ لفافے بھولنے لگی۔

”اچھا جلدی کرنا ذرا۔“ وہ اسے تاکید کر کے باہر نکل گئے۔

جب چائے کی ٹرائی سجا کر وہ ڈرائنگ روم میں پہنچی تو وہاں مکمل خاموشی تھی۔ ابراہان بھائی تائی جی کے سامنے والے صوفے پر سر جھکائے بیٹھے تھے اور سفید کاشن کا کڑھائی والا سوٹ پہنے ایمین کی ہم عمر لڑکی ہو گئی یا اس سے کچھ

بڑی سلیقے سے دوپٹہ سر پہنے۔ سر جھکائے ہوئے اپنے ہاتھوں سے الجھ رہی تھی۔ اس کا میک اپ بالکل نیچل تھا یا شاید کیا ہی نہیں ہوا تھا۔ ٹرائی کی کھڑ پٹری اس نے ذرا سا سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں باواہی تھیں۔ تائی جی کڑی نظروں سے اسے جانچ رہی تھیں۔ سلسلہ کچھ ایمین کی سمجھ میں آ رہا تھا اس نے خاموشی سے پلیٹیں ٹیبل پر سجا دیں۔

”چائے بناؤں ابراہان بھائی؟“ اس نے سنجیدہ سے بیٹھے ابراہان بھائی سے پوچھا۔
”ہاں بناؤ۔“

”لڑکی کیا نام بتایا تم نے اپنا؟“ تائی جی اکھڑ لیے میں بولیں۔

”حننا۔ حنا اقبال!“ اس کی آواز بچوں جیسی تھی اسے بے ساختہ فضہ یاد آنے لگی۔

”ابا کیا کرتے ہیں تمہارے؟“ تائی جی کا سوال اور لہجہ دونوں ہی اٹھ مارتھے۔

”جی وہ فوت ہو چکے ہیں میرے بچپن میں۔“ وہ بولیں جیسے چیزیا چوں چوں کرتی ہے۔ ایمین کے ہاتھ چینی گھول رہے تھے اور آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں۔

”کتنے سمن بھائی ہو؟“ لہجہ مزید ہزار ہو چکا تھا۔

”جی دو بہنیں ہیں۔“ چڑیا بولی۔

”ماں ہے؟“ بڑا اٹھ مار لہجہ تھا۔

”جی۔۔۔ وہ اسکول ٹیچر ہیں۔“ چڑیا کا لہجہ اقبالی تھا۔

”ایمین! پالیاں پکڑا کر چائے کی تم ہنڈیا چڑھاؤ چولے پر جا کر تمہارے آیا آتے ہوں گے۔ مجھے بھی ذرا کام

ہے۔ میری چائے کمرے میں لے جاؤ۔“

تائی جی نے ہاتھ اٹھا کر بیچ ختم ہونے کا اعلان کر دیا اور صوفے سے اٹھ کر بیڑاری سے باہر چل دیں۔ چڑیا کی آنکھوں میں شبنم اتر گئی۔ ابراہان بھائی نے بے چارگی سے تائی جی کو اور پھر حنا کو دیکھا اور سر جھکا لیا۔ ایمین دونوں کے آگے

چائے رکھ کر باہر نکل آئی۔

رات کو جب وہ تاپا جی اور تائی جی کا دودھ لے کر ان کے کمرے کی طرف گئی وہاں بٹھا بجشی ہو رہی تھی۔ کچھ

انسانی تجسس، کچھ شام کے واقعہ کا اثر وہ دروازے کے باہری رک گئی۔
 ”جب وہ راضی ہے تو تمہیں کیا اعتراض ہے۔“ تایا جی متحمل لہجے میں بولے۔
 ”تاہم کہے میں کنوئیں میں چھلانگ لگاؤں گا تو لگانے دوں اسے ہم مرگے ہیں اسے برا بھلا بتانے والے۔“ تائی جی گرجیں۔

”آخر جوان ہے، خود مختار ہے پھر اس عمر میں یونہی ہوتا ہے۔“
 ”اُنوکھا جوان ہوا ہے اور کون کرتا ہے اس عمر میں ایسا ہم نے بھی عمریں گزاری ہیں۔ ماں باپ کی مرضی پہلے بعد میں کچھ اور۔“ وہ کڑک کر بولیں۔
 ”خند میں آیا ہوا ہے، نہیں مانے گا۔ تم کچھ لچک پیدا کرو۔“ تایا جی صلح جو انداز میں بولے۔
 ”ارے دفتر میں کام کرتی ہے، ماں اسکول میں کیا ایسی پرکٹی رہ گئی ہیں میرے بچے کے لیے۔ وہ تو نا سمجھ ہے ضد کرے گا ہی ہم تو نا سمجھ نہیں۔ بچہ انگارہ پکڑنا چاہے تو کیا اس کی ضد سے ڈر کر اسے انگارہ پکڑا دیتے ہیں ماں باپ آپ بھی حد کرتے ہیں۔“

”تو پھر کیا کر دگی تڑوگی اس سے۔“ تایا جی زچ ہو کر بولے۔
 ”لڑنے کی کیا ضرورت ہے، مجھے کیا پتا تھا وہ یہ نمونہ گھر اٹھالائے گا۔ میں تو خود آج کل میں کچھ کرنے والی تھی۔ اچھا ہوا اس نے خود پہل کر دی اس کی توجہ دو سری طرف لگاؤں گی تو خود ہی بھول جائے گا سب کچھ۔“ اب کے لہجہ بدھم تھا۔

”کیا مطلب؟“ تایا جی الجھ کر بولے۔
 ”مٹکئی وغیرہ نہیں، بس دو چار ماہ میں شادی کر دیتے ہیں۔ سب کچھ بھول بھال جائے گا۔ یہ عشق محبت کا بھوت سر سے اتر جائے گا۔“
 ”دیکھو او معاملہ بگڑ نہ جائے۔“ تایا جی تشویش سے بولے۔

”نہیں بگڑنا مجھے پتا ہے ایسے معاملوں کو ایسے ہی سنبھالا دیتے ہیں۔“
 ”اتنی جلدی لڑکی کہاں سے ڈھونڈو گی۔“ تایا جی پریشان ہو گئے تھے۔
 ”لڑکی تو گھر میں موجود ہے۔“ تائی جی کی بات پر اس کے ہاتھ میں پکڑی ٹرے لرزی۔
 ”گھر میں۔“ تایا جی سوالیہ انداز میں بولے۔ ”تمہارا مطلب ہے ایمن، ٹھیک ہے۔“ وہ خوش ہو کر بولے۔
 ”وہاں تو نہیں خراب ہو گیا آپ کا۔ میرے بچے کے لیے زمانے بھر کی سیمو، سیر ہی رہ گئی ہیں، پہلے وہ اسکول ٹیچر کی کنگلی بیٹی اور اب یہ ایمن، ساری زندگی ہماری روٹیاں کھانے والی۔ اب اسے اٹھا کر اپنے سر پر بٹھالوں۔ اتنی مت ماری گئی ہے میری۔“ ایمن کا جی چاہا کہ ٹرے اٹھا کر دروازے پر دے مارے۔
 ”تو پھر؟“

”میں درنا باپ کی بات کر رہی ہوں۔ کفیل بھائی کی بیٹی، لاکھوں کی جائیداد کی اکلوتی وارث۔ میرے بیٹے کے تو نصیب جاگ انھیں گئے۔“
 ”اس کا خرقہ اٹھا لو گی شرم وہ ناک پر لکھی نہیں بیٹھے دی۔ ہم جیسوں کو تو دیے ہی کیڑے مکوڑے سمجھتی ہے وہ۔“
 ”دل خراب ہو گیا ہے تمہارا بیٹھے بٹھائے ناشو شام۔“ تایا جی بلند آواز میں بولے۔
 ”لاکھوں کی جائیداد کی اکلوتی وارث اتنا خرقہ تو ہو گا نا۔“ تین تین نوکر اس کی خدمت میں حاضر رہتے ہیں یہ تو ایک الگ بات ہے ویسے مزاج کی اچھی ہے، مجھے معلوم ہے نا۔ جاؤں تو بڑی عزت کرتی ہے۔ منہ سوکھتا ہے اس کا کچھو۔“

پہچھو کرتے۔“
 ”منہ تو پہلے ہی سوکھا ہوا ہے اس کا لگتا ہی نہیں لاکھوں کی وارث ہے۔ جسامت سے لگتا ہے کسی یتیم خانے سے آئی ہے۔“ تایا جی بڑبڑائے۔

”خبردار یتیم خانے جا نہیں اس کے دشمن، کتنے یتیم خانے تو اس کے باپ کی خیرات سے چلتے ہیں۔“
 ”مان جا میں گے وہ تمہارے سات آنھ ہزار تنخواہ دار بیٹے کے لیے۔“ تایا جی طعنے بولے۔
 ”خود مجھ سے کفیل نے اشاروں کنایوں میں کئی بار کہا ہے میں ہی نظر انداز کر رہی تھی کہ ابرار کو نوکری مل جائے۔ حالانکہ اسے نوکری کی کیا ضرورت ہے خیر اب میں دو چار دنوں میں جا کر بات کر لوں گی۔ مجھے پتا ہے فوراً ہاں کر دیں گے پھر دیکھیے گا ہمارے کیسے دن پھرتے ہیں۔“ تائی جی کے لہجے میں امیدیں انگڑائیاں لینے لگیں۔
 ”ہاں لگتا ہے واقعی اب تو دن پھر جائیں گے۔ اپنی من مانی کر رہی ہو، کل کو کسی کو الزام نہ دینا۔“ تایا جی نے وارننگ دی۔

”میں کچھ غلط نہیں کر رہی اپنے بچے کی بھلائی کر رہی ہوں اور میں کیوں کسی کو الزام دوں گی۔ مجھے پتا ہے سب اچھا ہی ہو گا۔“ وہ شاید اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ ”یہ ایمن کہاں مر گئی؟ دودھ لینے گئی تھی میں دیکھتی ہوں۔“
 دودھ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ ایمن پٹن کی طرف مڑ گئی۔

♥ ♥ ♥ ♥
 ٹرے آنی اگلے روز ایک بجے کے قریب پہنچی تھیں۔ ڈیڈ باڈی کو دیکھنے سے لے کر اس کی وصولی تک ان کا رویہ بے حد نارمل سا تھا جیسے یہ سارا واقعہ ان کے بزنس کنسرنس کا کوئی حصہ تھا اور وہ اسے بڑے فارمل طریقے سے ڈیل کر رہی تھیں۔ سارے واجبات و حجابات کلنر کر کے وہ اپنی گاڑی میں جا بیٹھیں۔ وہ اپنے ساتھ ایمر لینس ہار کر کے لائی تھیں۔ ایمر لینس آگے تھی اور ان کی گاڑی پیچھے پیچھے۔
 دونوں گاڑیوں کے ماحول میں کچھ زیادہ فرق نہیں لگ رہا تھا۔ ایک میں مردہ وجود موجود تھا، دوسری گاڑی میں بیٹھے افراد کا رویہ مردوں جیسا تھا بے حس اور ڈل سا، ٹرے آنی مسلسل سامنے ونداسکرین سے باہر دیکھ رہی تھیں پہلے انہوں نے فٹھ کو می کے ساتھ ایمر لینس میں بٹھایا تھا، وہاں ہاسپٹل کا ایک بندہ بھی بیٹھا تھا سفید چادر میں اپنا می کا بے حس بے جان جسم ڈھب بھی تھوری دیر بعد چور نگاہ سے اس سفید ابھرے ہوئے وجود کو دیکھتی اس کی ریرھ کی ہڈی میں سنسنی کی لہر دوڑ جاتی، مری کی سڑکوں کی تپن در تپن اترائی آسمان سے باتیں کرتے اونچے سرٹفک پہاڑ اور درخت جنہوں نے آتے وقت اس قدر Fascinate (مستور) کیا تھا اب ماحول کو اور بھی پراسرار بنا دیتے تھے۔
 رات کی برقیاری کی وجہ سے درختوں کے سبز پتوں پر کہیں کہیں برف کی پٹکی سی کانچ جیسی تہہ جہی ہوئی تھی۔ صبح سے موسم کچھ نارمل ہو گیا تھا۔ صبح چار بجے کے قریب برقیاری رک گئی تھی اب صرف کمری کمر تھا۔ اتنی شدید سردی دھند تھی کہ اس میں چھپے بادل بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میا لاسا اندھیرا سب طرف پھیلا ہوا تھا صبح کی ٹریفک سے سڑکوں کی برف کافی حد تک پگھل گئی تھی جب کہ کناروں پر ابھی بھی برف اٹھنی تھی جیسے اونچی سڑک کمری اترائی کی طرف جاتی اس کا دل بھی جیسے نیچے نیچے جانے لگتا تھا۔ ڈرائیور کی مشاتی تھی جو اتنے خدرا راستوں پر بڑی سبک روی سے گاڑی دوڑا رہا تھا۔

تین بجے کا ٹائم تھا، لگتا تھا جیسے تھوڑی سی دیر میں گہری شام ہو جائے گی۔ اندھیرے میں رستہ کیسے نظر آئے گا۔ اسے خوف نے اکھیرا اور اگر کوئی موڑ بہت اچانک آگیا، کہیں گہری کھائی آگئی، ڈرائیور کو اندھیرے کی وجہ سے کچھ دکھائی نہ دیا تو؟“ اسے جھرجھری سی آگئی ”مئی کو تو سفید چادر مل گئی ہے کفن کی صورت میں تو ایسے ہی۔“ اسے

جھرجھری سی آگئی۔ ”نہیں اللہ میری توبہ۔ اللہ میاں جی بھیک ہے مجھے مئی سے بے حد بیمار تھا، لیکن اس طرح مرنا منظور نہیں۔“ اس نے دل ہی دل میں اللہ سے دعا کی۔ ”کاش عاکف بچا مجھے اپنے ساتھ بٹھالیتے۔ انہیں میرا خیال کیوں نہیں آیا۔ انہوں نے بھی نرگس آنٹی کی طرح مئی کی موت پر ایک آنسو نہیں بہایا جب نرگس آنٹی کو دکھ نہیں ہوا تو عاکف بچا کو کیوں ہونے لگا۔ وہ تو آنٹی کے اشاروں پر چلتے پھرتے ہیں۔“

وہ کھڑکی سے باہر افسردگی سے دیکھ رہی تھی۔ فضا میں مئی کی وجہ سے باہر کے شیشے بار بار دھندلا رہے تھے اندر کی فضا گرم تھی۔ گاڑی میں بیٹھ کر رہا تھا جس کی وجہ سے باہر کی ٹھنڈک اندر اتنی اثر انداز نہیں ہو رہی تھی۔ پھر شاید خدا نے اس کی سہیلی۔ عاکف بچا نے یا شاید نرگس آنٹی نے اسے دونوں گاڑیاں رکوا کر اپنے ساتھ کچھلی سیٹ پر بٹھالیا۔ اسے کچھ خوشی تو ہوئی لیکن ساتھ ہی مئی سے دائمی جدائی کے جان لیوا اور احساس نے گھیر لیا اس گاڑی کا ماحول تو ایسا بے یس سے بھی زیادہ سرد اور بے حس تھا۔

”فصہ! کچھ کھا تو تم۔ وہ پیچھے ہٹ پات میں سینڈویچ پڑے ہیں وہ لے لو۔“ کچھ دیر بعد عاکف بچا نے مڑ کر اسے کہا تو اسے معلوم ہوا کہ اس گاڑی اور ایسا بے یس میں ایک نمایاں فرق تو یہ ہے کہ مردے کھاتے کچھ نہیں اور زندہ لوگ کھائے بغیر رہ نہیں سکتے۔ چاہے ان کے سامنے مردہ وجود پڑا ہو یا وہ اگلی گاڑی میں جا رہا ہو۔ اب اس نے غور سے دیکھا کہ نرگس آنٹی اور عاکف بچا کافی کے ڈس پوزا بیل گلاس ہونٹوں سے لگائے بیٹھے تھے وہ دونوں کچ کر چکے تھے۔ شاید اسی لیے انہیں اس کا خیال آگیا تھا۔

”کھا لو نالے کر۔ ابھی تو سفر کافی لمبا ہے۔“ اسے اسی طرح بیٹھے دیکھ کر عاکف بچا نے پھر مڑ کر کہا۔ ”چچا جان! مجھے بھوک نہیں ہے۔“ اس نے تو رات سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ پھر بھی اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا معدہ بھرا ہوا ہے۔ کبھی کبھی معدے کے لیے غم سے بڑی خوراک کوئی نہیں ہوتی۔ یہ ہر بھوک کو منادیتی ہے وقتی طور پر ہی سہی۔

”کھا لو پھر رات تک کچھ نہیں ملے گا۔ صبح سے بھی تم نے کچھ نہیں کھایا۔“ چچا جان کو بہت مدت کے بعد اس سے ہمدردی حنائی کا خیال آیا تھا۔ ”سن نہیں رہی ہو۔ اتنا دکھاؤ کہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا تمہارے اس ذرا سے میری ماں واپس آجائے گی۔ اس طرح کی پر فار منس مجھے متاثر نہیں کرے گی۔ کھا لو ورنہ تمہارے چچا کو چین نہیں آئے گا۔“

نرگس آنٹی نے کافی کا گلاس ہاتھ میں پکڑ کر بڑے تعارت بھرے لہجے میں کہا تو اس نے فوراً ”میکا کی انداز میں مڑ کر بات بات اٹھالیا اور اس میں سے ایک سینڈویچ اٹھا کر بات بات واپس رکھ دیا۔ ”پتا نہیں اب کیا ہو گا۔ نرگس آنٹی مجھے رکھ لیں گی۔“ پہلے لقمے کے ساتھ ہی یہ تلخ سوال پھر اس کے ذہن میں ابھرا ”اس نے کن اکھیوں سے ہزار سی کافی پتی نرگس آنٹی کو دیکھا۔

”بہت مشکل ہے۔“ اس کے دل نے جواب دیا۔ ”چلو اچھا ہے شاید اسی طرح یہ مجھے آپ کی پاس بھیج دیں۔ اللہ کرے۔“ اس کے دل نے فوراً ”اسے ایک خوش کن دعا کاراستہ دکھایا۔

باقی کا رستہ اس نے ہی دعا مانگتے گزارا۔ جب وہ گھر پہنچی تو کوٹھی کے کشادہ کمان میں بہت سے لوگ اکٹھے ہو چکے تھے رات کے شاید آٹھ بج رہے تھے سو ڈیوڈ بزنس مین میت کے انتظار میں بے چین بیٹھے تھے۔ مئی کو جاتے ہی منلانے کے لیے لے گئے اور ساڑھے نو بجے جنازہ اٹھالیا گیا۔

اگلے دن شام کو قفل کر لیے گئے اور رات تک گھر کی فضا کو سو گوار ماحول سے آزاد کر دیا گیا تھا۔ تعزیت کے لیے آنے والوں کو اب عاکف بچا سے ملنا ہو گا۔ کیونکہ نرگس آنٹی کو تواب فرصت نہیں ہوگی۔ وہ یہ کہہ کر اپنے کمرے

میں چلی گئی تھیں۔ وہ دن کی اس مشقت نے انہیں بے حد تھکا دیا تھا۔ اب وہ مکمل آرام کریں گی کوئی انہیں ڈسٹرب نہیں کرے گا سب کو کہہ دیا گیا۔

وہ بھی چپکے سے اٹھ کر انیکسی کی طرف آگئی۔ انیکسی کا دروازہ بند تھا اس نے اندر کی طرف دھکیلا شاید اندر سے لاکھڑا ہو پریشانی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی رات کے آٹھ بج رہے تھے سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ اس کا جسم اور ذہن دونوں سکون مانگ رہے تھے اتنے دنوں کی ذہنی ٹینشن نے اسے تھکا دیا تھا۔

”اب کیا کروں واپس اندر جاؤں۔“ دروازہ لاکھ دیکھ کر اس نے سوچا۔ ”اندر کہاں سوؤں گی۔“ عبدل چوکیدار سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ نرگس آنٹی کا سب سے پرانا ملازم تھا۔ وہ سڑک کی طرف آکر عبدل کو بلائے کا سوچ رہی تھی وہ خود ہی اسے دیکھ کر آگیا۔

”عبدل چا چا اب یہ دروازہ نہیں کھل رہا۔ کیا لاکھ ہے۔ مجھے سونا تھا۔“ ”لی لی! آپ کا سامان تو وہ جو سرونٹ کوارٹرز کے ساتھ کوارٹرز بنا ہے۔ نیا والا۔ اس میں پڑا ہے۔ بیگم صاحب نے آپ کے جانے کے بعد آپ کا سامان ادھر رکھوا دیا تھا۔ انیکسی میں ان کے مہمان آکر ٹھہرے تھے۔ اس کوارٹرز کی چابی یہ ہے آپ ادھر چلی جائیں۔“ اس نے جیب سے چابی نکال کر اس کی طرف بڑھائی اسے وہاں کھڑے ہونا دشوار ہو گیا۔

”میں اور سرونٹ کوارٹرز میں؟“ اس کا دل جیسے مان نہیں رہا تھا۔ ”مئی کو دی گئی سہولتیں ان کے ساتھ ہی کل رات دفن کر دی گئی ہیں۔ اب تمہارا مقام یہاں سرونٹ کوارٹرز کے علاوہ اور کہاں ہو سکتا ہے۔“ اس کا دل ہنسا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر چابی لے لی اور واپس مڑ گئی۔ ”اور لی لی! بیگم صاحب نے کہا تھا کہ کل صبح سے آپ بچن کے کام کروائیں گی، حمید اور شریفاں کے ساتھ۔ خاص طور پر صبح کا ناشتہ اور رات کا کھانا وغیرہ۔ صاحب صبح سات بجے ناشتہ کرتے ہیں اور بیگم صاحب سات بجے جو سہلی ہیں۔ آٹھ بجے ناشتہ کرتی ہیں۔ آپ جو دینے جائیں تو ان سے ناشتے کا پوچھ لیں کہ وہ کیا لیں گی۔“ اس نے پیچھے سے اسے نیا حکم نامہ سنایا تو اس کا میٹر گھومنے لگا۔

”میں کوئی ملازم ہوں ان کی جوان کے لیے جو اس اور ناشتے لے کر جاؤں۔“ وہ کھول کر رہ گئی۔ ”مجھے کچن کا کام نہیں آتا۔ آپ آنٹی سے کہہ دیں۔“ اس کے ذہن نے بروقت جواب تیار کر کے ارسال کیا۔ ”مجھے نہیں پتا جی۔ انہوں نے کہہ دیا تھا اور اب تو وہ سونے کے لیے چلی گئی ہیں۔ صبح آپ خود ہی کہہ دیجئے گا۔“ وہ بے رخی سے جواب دے کر واپس چوکیدار کی طرف مڑ گیا۔

وہ بے بسی سے اسے جاتے دیکھنے لگی اسے پتا تھا کہ وہ نرگس آنٹی سے کسی بھی قسم کا جواب تو کیا سوال بھی نہیں کر سکتی۔ اس نے سر اٹھا کر تاروں بھرے آسمان کو ایک نظر دیکھا ”فطرت ہر چیز سے بے نیاز ہے۔ چاہے کوئی جئے چاہے کوئی مرے چاہے کوئی مرمے کے جئے تارے چمکتے رہیں گے پھول کھلتے رہیں گے ہوا میں چلتی رہیں گی پادلوں پرستے رہیں گے اور یہ سب مصروف عمل مظاہر فطرت انسان کی بے بسی وہ کسی کا مذاق اڑاتے رہیں گے کہ وہ کچھو کچھ حالات کا اثر ہو سکتا ہے ہم پر تو نہیں ہوتا۔ بابا۔ بابا۔“ وہ تھکے تھکے قدموں سے کوارٹرز کی طرف چل دی۔

پھر گھر میں جیسے ایک محاذ کھل گیا اب رات بھائی حنا کے لیے اڑ گئے اور تائی جی درنایاب کے لیے تائی جی اس مسئلے پر یوں چپ تھے جیسے ان کا اس سے کوئی تعلق ہی نہ ہو اور ولید تھا لی کا بیٹن بننا ہوا تھا تائی جی کے گھٹنے کے ساتھ لگ کر

بیٹھتا تو ان کی ہاں میں ہاں ملاتا۔ ان کے فیصلے کو دور اندیشی اور ابرار بھائی کے بہتر مستقبل کا ضامن قرار دیتا اور تالی جی کو تو یہی صدمہ کم نہیں تھا کہ ابرار سے انہیں یہ توقع نہ تھی۔

”تانا فرماں بردار اتنا سعادت مند بچہ میرا۔ میں رات کو دن کہوں تو وہ دن کہنے والا اب زندگی میں پہلی بار اتنی ضد پکڑی ہے اس نے بلکہ اڑ گیا ہے۔ نامعلوم اس جادو گرنی نے کیا جادو کیا ہے میرے بچے پر نہ میری سنتا ہے نہ سمجھتا ہے۔ مجھے ابرار سے کم از کم یہ توقع نہ تھی کہ وہ مجھ سے مقابلہ بازی کرے گا۔“ تالی جی جیسے ہاتھ ملے جاتیں۔

”آپ کو ابرار بھائی سے توقع نہیں تھی۔ مجھ سے تو ہے نا؟“ وہ فوراً ان کی بات پکڑ لیتا۔

”میں کھال نہ کھینچ لوں گی تمہاری جو میرے حکم سے زرا ادھر ادھر چلے تم۔ ابرار تو میرے کسے کا مان رکھتا تھا تم تو بن کسے میری بات کو سمجھتے ہو۔ تمہارا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ وہ اس کے لیے بھاگنے کا کوئی راستہ نہ چھوڑتیں۔

”ای جان! وہ خلیل جبران نے کہا ہے کہ تمہارے بچے تمہارے نہیں وہ کماتوں سے نکلے ہوئے تیر ہیں۔ تم انہیں جنم تو دے سکتے ہو ان کے خیالات پر قادر نہیں ہو سکتے۔“ وہ انہیں سمجھانا شروع کر دیتا۔

”کون منحوس ہے یہ خلیل جبران جو ایسے ناخوار خیالات لوگوں میں پھیلاتا ہے۔ دنیا کی ہر چیز اپنی جگہ ماں باپ کی اور ان کے فیصلوں کی اہمیت اپنی جگہ۔ نافرمانوں کے لیے نہ اس دنیا میں سکون ہے نہ اس دنیا میں۔ یہی کچھ پڑھتے ہو تم کالج کتابوں میں۔ زرا سمر نکالو تو ماں باپ سے ہی منہ ماری کرنے لگو۔“

تالی جی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنے دونوں بیٹوں کے دل دماغ سے اپنی اہمیت کے سوا ہر خیال کو کھرچ ڈالیں۔

”ای جان! ماں باپ کی اہمیت اپنی جگہ مگر مرضی اور پسند اور پھر پسند کی خوشی اس سے بڑھ کر تو کچھ نہیں نا۔“ وہ ان کے کندھے دبانے لگتا۔

”ماں باپ تمہاری پسند سے خوش نہ ہوں تو کیا تمہیں چین آجائے گا خوشی مل جائے گی۔“ تالی جی اس کے دونوں ہاتھ پرے جھٹکتیں۔

”ہاں۔ یہ بات بس سچ ہے خوشی کہاں ملے گی۔ یہ تو ادھوری خوشی ہوگی، ادھورا سکون۔“ وہ سوچ میں پڑ جاتا۔

”لیکن ای جان! ایک درمیانی راہ بھی تو ہے؟“

”وہ کیا؟“ تالی جی اکتا کر پوچھتیں۔

”کہ پہلے اپنی پسند کو والدین کی پسند بناؤ پھر انہما کر دو۔ دونوں معاملے سیدھے۔“ اس نے چٹکی بجا کر کہا۔

”فضول کی بحث۔“ تالی جی بیزار ہوا تھیں۔ ولید کی بات میں وزن تھا، لیکن اب ان کا اپنا اتنا وزن ہو چکا تھا کہ وہ کسی وزن دار بات کو سہ نہیں سکتی تھیں۔ اس لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”تم کہہ دو جا کر بھائی سے۔ بھلے دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے میں اپنی بہو اور اس کی بیوی صرف درنا یا اب ہی کو بتاؤں گی۔ میں نے کفیل بھائی سے بات کر لی ہے۔ وہ راضی ہیں۔ بس مجھے ابرار کی ہاں کا انتظار ہے اگلے مہینے بارات روانہ کر دوں گی۔ وہ کون سے کوئی بھوکے ننگے ہیں راتوں رات بیٹی کی رخصتی کا انتظام کر لیں گے۔ بتا دو تم ابرار کو اس کے علاوہ میں نہ کوئی بات سنوں گی نہ بحث کروں گی ہاں۔“ تیز تیز بولتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

”تم بے شک ای سے جا کر کہہ دو چاہے کچھ ہو جائے میں شادی حنائی سے کروں گا۔ یہ میری زبان اور وعدے کی پاس داری کا مسئلہ ہے میں وعدہ کر چکا ہوں۔ صرف پسند کا مسئلہ نہیں۔“ ابرار بھائی ساری بات سن کر دو ٹوک انداز میں کہتے۔

”خدا ہو گئی بھائی! آپ جھگ رہے ہیں نہ ای، آخر یہ مسئلہ کیسے حل ہو گا؟“ ولید بیزار ہو کر ان کے بیڈ پر لیٹ گیا۔

”میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ حنا نہیں تو کوئی بھی نہیں۔“ وہ کمرے میں شل شل کے بول رہے تھے۔

”ویسے درنا یا اب میں کیا برائی ہے؟ بقول ای کے آپ کی دنیا اور دین دونوں سنور جائیں گے۔ دین ای کی بات ماننے سے اور دنیا درنا یا اب کو بیوی بنانے سے یعنی پانچوں ٹھکی میں۔ میں نے تو آفر کی تھی ای کو کہ یہ دلکش سنہری موقع مجھے فراہم کریں۔ میں تو ایک منٹ کی دیر نہیں لگاؤں گا۔“ وہ اٹھ کر دونوں تکیے کمرے کے پیچھے رکھ کر بیٹھ گیا۔

”درنا یا اب کی سب سے بڑی برائی اس کی دولت ہی ہے ولید! کیا تم نہیں جانتے She is a Snob وہ مغرور ہے۔“ وہ رک کر اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔

”بھائی وہ مغرور ہونے میں حق بجانب ہے۔ آخر کولا کھوں کروڑوں کی اکلوتی وارث ہے مگر اب کیا کیا جائے۔ ای کی ضد کا آپ کو پتا ہے۔ ہمیشہ سے وہ اپنی بات ہی منواتی آئی ہیں اور اب بھی انہوں نے اس بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ اب ان کے سامنے ان نہیں کر سکتے۔ ہم تو پھر۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”ولید! یہ انا کا مسئلہ نہیں۔ یہ میری پوری زندگی کا مسئلہ ہے۔ کیا وہ میری زندگی کو ایک عذاب مسلسل بنا دینا چاہتی ہیں کہ میں اپنی مرضی سے سانس بھی نہ لے سکوں۔“ وہ بے بسی سے بولے۔

”آپ حنا کے لیے کتنے سنجیدہ ہیں؟“

”شادی کی حد تک۔“

”تو پھر کر لیں شادی۔ ای بعد میں خود ہی مان جائیں گی۔ کب تک ناراض رہیں گی۔“ ولید نے انہیں بے خوف مشورہ دیا۔

”نہیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا بہر حال۔“ انہوں نے گہرا سانس لیا۔ ”ای کی رضا بہت ضروری ہے۔“

”تو پھر آپ بزدل ہیں اور بزدلوں کو دنیا میں ان کی پسند کا کچھ نہیں ملا کرتا۔ یاد رکھیے گا۔“

”میں بزدل نہیں ہوں ولید! حنا بھی اس بات کے لیے تیار نہیں نہ اس کی ای ای وہ بے حد وضع دار لوگ ہیں وہ تو اس روز میرے بے حد اصرار پر گھر آگئی تھی بعد میں وہ مجھ سے ناراض ہو گئی تھی۔ ای نے جیسی اس کی پذیرائی کی تھی۔“ ابرار کے لہجے میں افسوس تھا۔

”وضع دار لوگوں کو کم از کم عشق وغیرہ نہیں کرنا چاہیے اور ای تو ایسے ہی کرتی ہیں آپ کو معلوم نہیں تھا۔ آپ کو حنا کو گھر لانا ہی نہیں چاہیے تھا پر بزدل وغیرہ تو بعد کا مسئلہ ہے۔ پہلے تو کسی کی عزت نفس کا سوال ہے اور آپ کو پتا ہے۔ ای کو صرف اسی چیز کا علم نہیں کسی کی کوئی عزت نفس بھی ہوتی ہے۔“ ولید ماں کی رگ رگ سے واقف تھا۔

”پھر میں کیا کروں۔“ وہ بے بس ہو کر بولے۔

”حنا سے بات کی آپ نے؟“

”وہ کسی صورت نہیں مانتی کورٹ میں چر۔“

”تو پھر ای کا کہا مان لیں۔“

”نا ممکن۔“

”تو پھر؟“

”تو پھر میں نے ایک اور فیصلہ کیا ہے۔“

”کیا؟“ ولید سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”دو تین دن بعد بتاؤں گا۔ اب مجھے نیند آرہی ہے۔ تم بھی جاؤ۔“ وہ خشک لہجے میں بولے۔
ایک مہینے بعد انہوں نے عقدہ کھولا۔

”ولید! میں اپنی کمپنی کی طرف سے جدہ جا رہا ہوں ڈیپوٹیشن پر شاید مستقل وہیں رہ جاؤں۔“ ان کا لہجہ مضبوط تھا۔

”وہ وہاں جا کر دکھائے۔ مری ہوئی ماں کا چہرہ بھی نہیں دیکھے گا وصیت کر جاؤں گی۔ جابتا دے اسے۔“ تائی جی سن کر گرج کر بولیں۔

بتانے کی نوبت ہی نہ آئی کہ اسی رات تائی جی کے سینے میں درد ہوا انہیں انجانا کا انیک ہوا تھا۔ ان کی ہائے وائے کی پکار اور پہلے زرد رنگ نے ابرار بھائی سے ان کی ساری قوت مدافعت چھین لی۔ وہ ایک رات ایک دن ہاسپٹل میں رہیں۔ اگلی شام گھر آ گئیں۔ ابرار بھائی جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے منہ پھیر لیا وہ چپ چاپ ان کے بستر کے بائیں کنارے ٹک گئے۔ کتنے لمحے چپ چاپ گزر گئے۔ تایا جی بیوی اور بیٹے دونوں کے تاثرات کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہ رہے تھے کہ ابرار بھائی بول اٹھے۔

”آئی ایم سوری امی! میں کہیں نہیں جاؤں گا اور وہی کروں گا جو آپ کہیں گی۔“ ان کا سر جھکا ہوا تھا اور آواز کسی گڑھے میں سے آرہی تھی۔

اماں جی کا چہرہ کھل اٹھا انہوں نے ذرا سا اٹھ کر ان کا چہرہ چوم لیا۔
”میرا بچہ سدا خوش رہو۔“ ابرار بھائی کا سر اور جھک گیا۔

”مڈل کلاس شریف مردوں کا ایک البیہ ہوتا ہے ابرار صاحب! وہ ساری عمر ماما زبوائے بنے رہنے میں ہی اطمینان پاتے ہیں۔ مجھ سے شادی کر کے آپ کا ضمیر آپ کو کہیں چین نہیں لینے دے گا اتنی بڑی سزا اپنے لیے تجویز نہ کریں اس دنیا کا برنخ ضمیر کی عدالت ہے جو ایک بار اس کے کٹہرے میں کھڑا ہو گیا۔ وہ تمام عمر کسی خوشی میں لذت نہیں پاسکتا۔ آج یا کل آپ کو ہر حال اپنی ماں ہی کا کہنا ماننا ہو گا۔ اس لیے میرا خیال دل سے نکال دیں۔“

ایک ہفتہ پہلے حنا ان کی آفس ٹیمبل پر کھتی ہوئی رونے لگی اور پھر اٹھ کر چلی گئی اسی دن انہوں نے باہر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور آج؟

وہ واقعی ماما زبوائے تھے۔ ماں کی حکم عدولی کم از کم اس زندگی میں نہیں کر سکتے تھے اور نظریہ آواگون پر ان کا یقین نہیں تھا اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ان کا یہ جھکا ہوا سر اب کبھی نہیں اٹھ سکے گا۔



چھوٹا سا کوارٹر جس کی چھت بمشکل اس کے قد جتنی ہوگی۔ اس کی دیواریں سیلن زدہ تھیں انہیں دیکھ کر گیلی بن کا احساس ہوتا تھا جیسے رات بھر بارش ان دیواروں سے لپٹ کر روتی رہی ہے یا ان پر ابھی کسی نے پانی کا چھڑکاؤ کیا ہو۔ کالے گیلے سیمنٹ پر کہیں کہیں سفید سا جھلک رہا تھا۔ اس کا فرش اینٹوں کا تھا ایک کوٹھڑی نما کمرہ جس کے آگے صحن یا برآمدہ تھا جس پر چھت تھی اس کوٹھڑی میں ایک کھڑکی کھلتی تھی جہاں سے مٹی کا پہلے والا کمرہ صاف نظر آتا تھا۔ فرامیسی سفید فرنیچر اور سفید پردوں والا کمرہ اور اس کوٹھڑی میں رہنے والا یا نیا آنے والا یہ گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کوٹھڑی میں اس درجہ پسماندہ کوارٹر بھی ہو سکتا ہے۔ عیدل نے کہا تھا وہ کوارٹر نیا بنا ہے حالانکہ نئے کوارٹر اس کوٹھڑی سے جھٹ کر کوئی دس بارہ گز کے فاصلے پر تھے جہاں کوٹھڑی کے دیگر ملازمین رتے تھے۔ یہ سرونٹ کوارٹر شاید اس کوٹھڑی کی تعمیر سے پہلے بنایا گیا تھا، صحن میں مٹی کے تیل کا چولہا بڑا تھا۔ تام چینی کی دو گندی پلیٹیں، ایک اسٹیل کا کلاس دو مٹی کی پیالیاں اور سلور کی دیبچی اس کوارٹر کے کچن کی کل کائنات تھے۔ کوٹھڑی کے اندر

بان کی چارپائی تھی جس پر میلا سا ایک بستر بچھا تھا اور تیز رنگوں والے پرنٹ کا لحاف پڑا تھا۔

رات تو اس نے جیسے تیسے گزار لی صبح ہوتے ہی اس کو ارٹھر کے ماحول کو دیکھتے ہی اس کو ابکانی آنے لگی۔ صحن میں لگے نلکے سے اس نے پانی کے دو تین چھلکے منہ پر مارے بالوں پر انسایدھا کنگھا کیا اور کو ارٹھر کا دروازہ بند کر کے باہر نکل آئی۔ باہر ہر طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ سرما کی نرم گرم دھوپ اس کے سردی سے ٹھنڈے ہوئے وجود کو جیسے ایک دم سے سکون کا احساس ہوا۔ وہ ست قدموں سے چلتی ہوئی گونجی کے اندر آگئی۔ ڈاکٹنگ ٹیبل پر ناشتہ ہو رہا تھا۔ گرم گرم آلیٹ اور خرائی انڈوں کی مسک ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اس کی بھوک چمک اٹھی۔ عاکف چچا اسے دیکھ کر ذرا سا مسکرائے نرگس آنٹی کا چہرہ درشت سا ہو گیا اور سارہ نے دودھ کا گلاس اٹھاتے ہوئے ایک سرسری سی نگاہ اس کے بے وقعت وجود پر ڈالی۔

”آجاؤ۔ فضلہ! ناشتہ کرو۔“ عاکف چچا نے اسے دعوت دی۔

”وہ کر لے گی خود ہی“ سارا دن اور اس نے یہاں رہ کر کیا کرنا ہوتا ہے روٹیاں ہی تو ٹوٹی ہوتی ہیں۔ آپ ذرا جلدی کریں آفس سے دیر ہو رہی ہے۔“ نرگس آنٹی نے بڑی نزاکت سے نشوونما پر اپنے لپ اسٹک زدہ ہونٹوں کے کنارے صاف کیے۔ مٹی جیسی ریفائنڈ عورت کی مٹی اکثر مٹی جیسا لہانہ گفتگو کرتی تھی۔ فضلہ نے سوچا۔

”ہاں۔ بس میں نے تو کر لیا ہے چار باہوں میں تو۔ فضلہ! اوھر آجاؤ تم میری پیسز پر۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”ہو نہ۔!“ نرگس آنٹی ان کے چو پچلوں پر منہ بنا کر کھڑی ہو گئیں اور عاکف چچا سے پہلے باہر کی طرف بڑھ گئیں۔ ”عاکف چچا! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔“ وہ ان کے پاس آکر بولی۔

”ہاں کرو۔“ وہ جاتے جاتے رک گئے۔

”مجھے کراچی بھجوا دیں پلیز ایکی آپنی کے پاس۔ مجھے یہاں نہیں رہنا پلینز چچا جان!“ وہ بڑا حوصلہ کر کے بولی تھی پھر بھی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”گڈ بای!“ ابھی تو مٹی کا سوئم ہوا ہے۔ اتنی جلدی تو میں کہیں نہیں جاسکتا۔ ہاں آنٹی پر اس میں ایک دو ہفتوں میں تمہیں خود کراچی لے چلوں گا پھر تمہاری مرضی تمہاں رہنا یا یہاں آجانا۔ لی الحال تھوڑا انتظار کرو۔ میں آج کل ذرا بڑی ہوں، ٹھیک ہے۔ اب تم ناشتہ کرو۔“ ان کا لہجہ خلاف معمول نرم تھا۔

”عاکف چچا! مجھے اس کو ارٹھر میں نہیں رہنا۔ مجھے وہاں سے خوف آتا ہے پلیز۔ مجھے ادھر ہی رکھ لیں۔“ وہ ان کے کوٹ کا بازو تھام کر منت سے بولی۔

”کون سے کو ارٹھر۔ کو ارٹھر میں ہو تم؟ تم ادھر ہی رہو نا۔ ادھر کہاں رہ رہی ہو تم؟ میں مٹی کا کمرہ ٹھیک کروا رہا ہوں تمہارے لیے وہاں کوئی بھی نہیں ہوتا۔ میں جاتے ہوئے عبدل سے کہہ دوں گا۔ تم وہیں رہنا دو گے۔ اب میں چلتا ہوں تم ناشتہ کرو۔“

وہ جلدی میں تھے ہمیشہ کی طرح جلدی جلدی اس کی تشفی کر کے بولے۔ سارہ ان دونوں کی گفتگو سے بے نیاز اخبار دیکھتے ہوئے گھونٹ گھونٹ دودھ پی رہی تھی۔

”عاکف! اب ابھی جاؤ۔ گھنٹے سے میں ڈسٹ کر رہی ہوں۔“ نرگس آنٹی دوبارہ اندر آکر دھڑکیں تو عاکف چچا کو جیسے جانے کا راستہ بھول گیا پھر آگیا ہر طرف لپکے۔

”اور سنو فضلہ! شام کو مٹی کی تعزیت کے لیے میرے کچھ خاص مہمان آنے ہیں ان کے کھانے کا انتظام ادھر ہی ہو گا۔ ڈاکٹنگ روم میں تم شریفان اور بنگلے کے ساتھ کوٹنگ کر لینا، یوں منہ اٹھا کر فاس نہ گھوما کرو کوئی کام بھی کر لیا کرو۔ مٹی کی آڑ میں تم نے بہت عرصہ آرام سے ہاتھ پاؤں توڑ کر کھالی لیا ہے اب ذرا خود سے بھی کچھ کرنا سیکھ لو پھر

کل کو تمہارے بیک وڈر رشتہ دار کہیں طے تمہیں نہیں نے پھوڑ رکھا۔ شریفان سے کچھ نہ کچھ سیکھ لو یہ تمہاری کلاس کا تقاضا بھی ہے انڈر اسٹینڈ اور بات بات پر چچا کے آگے رونا دھونا چھوڑ دو۔ (تم اب ایک بچی نہیں ہو) Girl You are a grooming۔“ وہ کہہ کر ٹک ٹک کرتی باہر نکل گئیں۔

”میں آرنو مور اسے چائلڈ فضلہ ڈارلنگ!“ سارہ ہنستے ہوئے ہاتھ جھاڑ کر کھڑی ہو گئی۔ ”انڈر اسٹینڈ۔“ وہ شرارت سے اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولی۔ ”تم نے کراچی جانا ہے تو جاؤ نا پلیز میں تو تمہیں دیکھ دیکھ کر بور ہو گئی ہوں۔“ ریلی تم اس قدر ڈل اور ان اڑکیٹو ہو کہ تمہیں خود اپنے ساتھ چند دن گزارنے پر جائیں تو تم خود بور ہو جاؤ۔ تھنک گاڈ ایک آدھ ہفتے بعد میرے ایگزام شروع ہو جائیں گے۔ ایگزام کے بعد ہم کہیں نہ کہیں فلالی کر جائیں گے۔ تمہاری پوری ریت سے جان چھوٹ جائے گی۔“ وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے تقریباً ”چھلٹے ہوئے باہر نکل گئی۔

”ایگزام۔“ مٹی نے کہا تھا فضلہ جان مجھ سے راس کر کہ تم میٹرک کا ایگزام ضرور دو گی۔ میں نے تمہارا ایڈمیشن بھجوا دیا ہے۔“ اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ ”سرزیر کا فون نمبر کہاں ہے۔ ان سے پتا کرتی ہوں۔“ وہ واپس کو ارٹھر کی طرف بھاگی۔ اس کا سارا سامان ادھر ہی تھا۔

سرزیر نے اسے بتایا کہ اس کا داخلہ واقعی جا چکا ہے اور ان کے پاس اس کی رول نمبر سلپ بھی آچکی ہے۔ ”گلے ہفتے سے ایگزام شروع ہونے والے ہیں پیسز زدے دو۔“

ناشتہ کرتے ہی وہ کو ارٹھر میں چلی آئی۔ ادھر سے اپنی کتابیں اٹھائیں ان کی گرد جھاڑی اور انہیں لے کر وہ کو ارٹھر کے پچھلی طرف دھوپ میں چلی آئی شام کو آنٹی نرگس کے گیسٹ آئے ہیں وہ قطعی بھول چکی تھی۔ شام ڈھلنے تک وہ وہیں بیٹھی پڑھتی رہی۔ درمیان میں بھوک لگی وہ نظر انداز کر گئی۔

”ایک ہفتہ تو ہے بیچ میں۔ شام کو سر آجائیں گے رول نمبر سلپ اور ڈیٹ شیٹ لے کر۔“ اس نے خود کو سمجھایا۔ شام کو وہ مغرب سے پہلے ہی جا کر شریفان سے کھانا لے آئی اور کو ارٹھر میں بیٹھ کر کھانے لگی۔

”یہاں کم از کم سکون تو ہے کوٹھی میں کس قدر ہنگامہ ہے۔ مہمان آنے والے ہیں نوکروں کی کم بختی آئی ہوئی ہے۔ شکر ہے نرگس آنٹی کی مجھ پر نظر نہیں پڑی ورنہ میری شامت آجاتی۔“ وہ کھانا کھاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

”چائے پینے کو دل چاہ رہا ہے۔ چستی آجائے گی رات کو دیر تک پڑھوں گی کراچی جانے سے پہلے ایگزام تو دے دوں۔ وہیں کالج میں ایڈمیشن لے لوں گی ایکی آپنی اور عبیدہ آپنی رفون پر پوچھتی ہیں۔“ فضلہ اسکول جاری ہوا اسٹڈیز کیسی جارہی ہیں۔“ اب میں انہیں کیا بتاؤں کہ میں نے تو اسکول کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ میرا میٹرک کا رزلٹ اچھا آگیا تو دونوں خوش ہو جائیں گی ابھی تو اس بارہ دن ہیں ایگزام میں۔“ وہ پھر سے کتابیں لے کر دست لگی۔

♥ ♥ ♥ ♥

گھر میں ابراہیم بھائی کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔ تائی جی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ساری خدائی بیچ کر ابراہیم

بھائی کی بری میں لگا دیں۔ تائی جی کی بڑی باتیں ان کا تملانا تائی جی پر کچھ اثر نہیں کر رہا تھا۔ شادی کی تیاریوں میں سرفہرست از سرفہر گھر کی تعمیر و مرمت شامل تھی۔ ابراہیم بھائی کا کمرو چھوٹا تھا اس کے ساتھ اسٹور روم خاصا بڑا تھا تائی جی نے اسٹور کو کمرے میں شامل کر کے اسے لکڑی بنڈ روم کی شکل دے دی تھی۔ سارے گھر میں پینٹ ہو رہا تھا پچھلے صحن کی بھی قسمت جاگ اٹھی تھی۔ سارا صحن صاف کروا کے نئے گیلے اور پودے لگائے گئے تھے کیوڑوں کے ورڈے نئے منگوائے گئے تھے ان پر پینٹ کروایا تھا۔ کچن کی سادہ سلیب پروائنٹ فارمیکا کے کینٹ لگوائے گئے تھانک نی کھڑکیاں اور دروازہ کچن کی شکل ہی بدل گئی تھی باہر کے اجڑے ہوئے لان کو سنوارا گیا تائی جی نے ایک مالدار کھا چند ہی دنوں میں ہر ابھر لان آنکھوں کو تراوٹ بخشنے لگا۔

”ہوں لگ رہا ہے مصر کی قلوب پڑھ آرہی ہے گھر کی انپکشن پر۔ چلو اسی بہانے ہم بھی کچھ عرصہ اچھی اور پر آسائش زندگی کے مزے لوٹ لیں گے۔“

ولید آتے جاتے تالی جی کو سنا تا وہ ان سنی کر دیتیں۔ آج کل انہیں اپنے گھٹنوں اور جوڑوں کا درد بھی بھولا ہوا تھا۔ سچ پانچ بجے اٹھ جاتیں پھر سارا دن ایک پل کو بستر سے کمر نہ نکالتیں۔ سارا دن ریٹھی کپڑوں، چائنا سلک کے دوپٹوں، جارحٹ اور شیٹون اور ویلوٹ کی نئی ورائٹی میں الجھی رہتیں۔ آج کل ان کا رویہ ایمن سے بہت اچھا ہو گیا تھا۔ سارا کام اسی سے کرواتیں اندر باہر کے چکر درزی کے مشورے، جیولر کے پیمبرے سب میں ایمن کی شرکت لازمی ہوتی تھی اور ولید ان کا ڈرائیور بنا ہوا تھا۔

”تم پاگل ہو رہی ہو انیسہ! ان فضول کے بکھیرٹوں اور اسراف میں۔ میں کہتا ہوں کچھ خدا کا خوف کرو۔ کچھ ہمارے کھانے پینے کے لیے بعد میں بھی رہنے دو، کیوں ہم سب کا دیوالیہ کروانا ہے۔ آج یہ سب کر لوگی کل ولید کی دفعہ ہمارے پاس اتنا نہ ہوا تو۔ پھر ایمن بھی تو ہے سب بچوں کا خیال رکھو کیوں ایک ہی کی خوشی پر سب کچھ لٹا رہی ہو۔“ تایا جی بھی پیار سے کبھی منت سے تالی جی کو سمجھانے کی کوشش کرتے۔

”نہ ولید کے ابو! مجھے ایک بات بتاؤ کیا میں اس قدر بے وقوف ہوں جو سب کچھ اندھے کنوئیں میں جھونک دوں گی، آخر مجھے کچھ نظر آ رہا ہے تو میں کر رہی ہوں نا۔ میرے گھر میں بس نہیں آرہی۔ لکشمی آرہی ہے۔ تم اتنی سی بات کیوں نہیں سمجھتے آج اگر میں اس کے چاہتیں کروں گی تو کل کو اپنے سینے پورے کروں گی۔ یہ دو تین لاکھ کا خرچ انشاء اللہ بمسودہ سود میں چالیس سے زائد کی صورت میں پورا ہو جائے گا۔ اتنی سمجھ تو آپ کو بھی ہے۔“ وہ بڑے زیرک انداز میں کہتیں۔

”اتنی سمجھ مجھے ہے پر تمہیں نہیں ہے۔ تم جو خواب دیکھ رہی ہو۔ اس کا انجام اگر الٹ ہو گیا تو سوچو ذرا کیا ہو گا ہمارے پاس کیا بچ جائے گا۔ اپنے نقصان کا حساب لگانے کے لیے حواس بھی نہیں رہیں گے۔ تم سوچو ذرا کیا گھیل اتنا بے وقوف ہے کہ سب کچھ اٹھا کر تمہاری جھولی میں ڈال دے گا۔ اس نے خود ساری زندگی ایک بیٹے کی طرح گزار دی ہے روپے کی جگہ اس نے دھیلا خرچ کیا ہے۔ پیسے سے اتنا پیار کرنے والا کیا پونہی سب کچھ تمہارے حوالے کر دے گا۔ درنایاب اس کی بیٹی ہے اور پھر تمہاری بھانجی۔ جس نے ساری زندگی تم سے ٹھیک طریقے سے بات نہیں کی، کیا اب وہ اتنی آسانی سے یہ سب ہو جانے دے گی۔ پیسے کی ترسیل وہ کم از کم تمہاری طرف نہیں ہونے دے گی۔ یہ سب کچھ سوچ لو۔“ تایا جی انہیں ڈراتے۔

”ہاں یہ باتیں تو کبھی کبھی مجھے بھی خوفزدہ کرتی ہیں، لیکن انسان کو کبھی منفی سوچ نہیں رکھنی چاہیے آگے آجاتی ہے میں بھی یونہی دل کو سمجھا لیتی ہوں تو ٹھیک ہو جاتا ہے پھر بھی خدا نخواستہ اگر ایسا ہو گیا تو کیا ہو اب تین چار لاکھ لگا رہی ہوں۔ نارمل حالات میں بھی تو ڈیڑھ دو لاکھ لگ ہی جاتے ہیں نہ کچھ ہاتھ آیا تو نہ سہی اور دونوں بچوں کی دفعہ اللہ مالک ہے۔ میری خوشی کو کرنا نہ کریں۔ یہ ہولناک نقشے کھینچ کھینچ کر۔ میں ذرا بازار جا رہی ہوں۔ ولید کہاں ہے اسے ذرا میرے پاس بھیجیں میں بچن میں ہوں دیکھوں ایمن نے کھانا تیار کر لیا ہے تو ذرا میرے ساتھ چلے۔“

وہ اٹھنے لگیں۔

”ارے خدا کی بندی! اس وقت تو بیٹھو۔ سات بج رہے ہیں۔ بازار بند ہونے کو ہیں کل چلی جانا اور اس بچی کو بھی کچھ بڑھ لینے دو۔ اس کے فائنل امتحان سر رہیں سارا دن یہ ہانڈی چولہا اور تمہارے بازاروں کے چوٹیلے اس کا

کتنا خرچ ہو رہا ہے تمہیں کچھ تو خیال کرنا چاہیے۔“

”خیال ہی تو کر رہی ہوں۔ یہ مواڑ بھالی کا گناہ اس سال ختم ہو جائے گا تو کل اس نے یہی کام کرنے ہیں۔ دعا کریں اس دوران ہی کیس اچھا رشتہ نظر آجائے تو میں ایک دن کی دیر نہ لگاؤں۔ پڑھ کے اس نے کیا کرنا ہے تو کری کر لی ہے کوئی۔ دو چار سالوں بعد سب پڑھا لکھا چوٹ ہو جاتا ہے۔ پھر یہی ہانڈی چولہا اور کپڑے لٹے کی سمجھداری کام آتی ہے۔ میں اسی کام میں اسے ماہر کر رہی ہوں۔ دیکھئے گا جس گھر میں جائے گی ان کاموں میں مات نہیں کھائے گی، یہی چیزیں کام والی ہیں یہ ڈگریاں تو الماریوں کے پچھلے خانوں میں کیس پڑی سڑتی ہیں ان کو کون پوچھتا ہے۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ ”کھانا بھجواؤں آپ کے لیے؟“

”نہیں ابھی نہیں میں کہتا ہوں پھر تو ایمن جس گھر میں جائے گی۔ اس کے تو نصیب جاگ جائیں گے بقول تمہارے۔ امور خانہ داری میں اس قدر ماہر ہو کر دیا ہے تم نے اسے۔“ تایا جی یونہی بولے۔

”ہاں تو میں غلط کہہ رہی ہوں۔ دیکھیے گا آپ کیما سسرال میں نام کرے گی جا کر میری تربیت کوئی ایسی دہی ہے۔“ وہ فخریہ انداز میں بولیں۔

”بڑی خوش قسمت ہوگی پھر تو ایمن کی سسرال۔ ہے نا؟“ وہ مسکرا رہے تھے۔

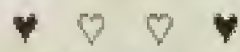
”ظاہر ہے اس میں کیا شک ہے۔“ تالی جی ان کے انداز کو سمجھ نہیں پا رہی تھیں۔

”اب یاد رکھنا اس بات کو بلکہ قائم رہنا اس بات پر۔“ وہ کھڑے ہو کر ہنستے ہوئے بولے۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ رک کر ذرا نیچے چٹوٹ سے بولیں۔

”کوئی مطلب نہیں۔ تم جاؤ دیر ہو رہی ہے۔ میں ولید کو دیکھتا ہوں اور جلدی آجانا میں اتنی دیر کھانے کا انتظار نہیں کر سکتا۔“ وہ باہر کی طرف مڑتے ہوئے بولے۔

”سی لیے تو کہہ رہی ہوں۔ ابھی کھالیں۔ ہمیں دیر ہو جائے گی۔“ تالی جی بڑبڑائیں وہ ان سنی کر کے باہر نکل گئے۔



اس کے ایجنڈام اس کی توقع کے خلاف اچھے ہوئے تھے۔ آخری پیر دے کرو بہت خوش خوش سوئی تھی۔ ”آج تو جو مرضی ہو جائے میں چچا جان سے کہوں گی۔ اب مجھے کراچی بھجوا دیں یا مجھے ٹرین میں بٹھادیں۔ میں خود ہی پہنچ جاؤں گی۔ ایڈریس مجھے لکھ دیں۔“ وہ منصوبے بناتی عاکف چچا کے کمرے کی طرف آئی۔

”شریفاں! عاکف چچا اندر ہیں؟“ پاس سے گزرتی شریفاں سے اس نے پوچھا۔

”نہیں جی۔ صاحب جی تو کل سے اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔“ وہ ذرا رک کر بولی۔

”کب تک آجائیں گے؟“ بھلا اس نوکرائی کو بے چاری کو کیا معلوم پھر بھی وہ پوچھ بیٹھی۔



۴
چوتھی قسط

”پتا نہیں جی شاید دو تین دن لگیں گے۔ کافی بھاری سوٹ لیس لے کر گئے تھے اور آج بیگم صاحبہ بھی چلی گئی ہیں، سارہ لی لی کو لے کر۔“

”اوہ! تو اس کا مطلب ہے، میں کو بھی میں اکیلی ہوں اور مجھے کسی نے بتانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی، وہ مرے مرے قدموں سے واپس لاؤں گے میں صوفے پر بیٹھ گئی۔“

عاکف چچا واقعی تین دن کے بعد آئے۔ وہ تین دن ادھر ہی رہی کوارٹر میں جاتے ڈر لگ رہا تھا۔ اکیلے پن کا احساس بڑھ گیا تھا۔

”عاکف چچا! آپ مجھے بتا کر بھی نہیں گئے کہ اسلام آباد جا رہے ہیں۔“ وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئے وہ فوراً آگے بڑھ کر شکایتا بولی۔

”چلو اب تم رہ گئی ہو جسے میں بتا کر آیا جایا کروں۔“ وہ غصے سے بگڑ کر بولے۔

”مجھے کراچی جانا تھا اس لیے۔ میرے ایگزیم کتنے دن پہلے ختم ہو گئے ہیں۔ آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ مجھے لے جائیں گے۔“ وہ ان کے غصے سے ذرا سہم کر بولی۔

”ہاں کہا تھا۔ غلطی ہو گئی۔ پورا نہیں کیا۔ اب میں بے حد تھکا ہوا ہوں، نہیں تو تمہیں ابھی لے جاتا کراچی۔“

کراچی میں پھول بتاشے بٹ رہے ہیں، وہاں جاؤ گی تو سارا شوق ہوا ہو جائے گا۔ یہاں کا آرام تم سے سہا نہیں جا رہا۔ اب جب جاؤں گا لے جاؤں گا۔ مجھے اب کچھ آرام کرنے دو۔ میں ابھی اتنے لمبے سفر سے لوٹا ہوں۔“

وہ غصے سے بڑبڑاتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھے، ان کا مزاج بے حد بگڑا ہوا تھا۔ اس کی مزید بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

پھر کتنے دن اور چپکے سے سرک گئے۔ اس کا میٹرک کارزلٹ بھی آگیا وہ فرسٹ ڈویژن سے پاس ہو گئی۔

”عاکف چچا! مجھے کالج میں ایڈمیشن لینا ہے۔“ انسان بڑی ڈھیٹ چیز ہے، فرمائش کرنے سے نہیں باز رہتا۔

”تمہارے بچے کے باوجود۔“

”ہاں لے لینا۔ میں کہہ دوں گا اشرف سے، تمہارا داخلہ کروادے۔“ انہوں نے اپنے منیجر کا نام لیا وہ خوش ہو

گئی۔

پھر ان ہی دنوں تیا جی کراچی سے ابرار بھائی کی شادی کا کارڈ لے کر آگئے اس سے بڑی محبت سے ملے۔
 ”تیا جی! مجھے اپنے ساتھ لے جائیں۔“ ان کے محبت بھرے رویے سے متاثر ہو کر وہ پھر سے فرمائش کر بیٹھی۔
 ”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ تم چلو میرے ساتھ۔“ ایمن نے ہنس بھرتی کر دی اور تمہاری تائی جی بھی۔ اب تم میرے ساتھ ہی چلنا۔“ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولے۔ اس کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔
 ”عائف کو تو تاؤم نہیں ملتا پچی کو بہنوں سے ملو الٹے دنیا جہان کے لوگ کاروبار کرتے ہیں۔ لیکن تمہارا کاروبار ساری دنیا سے نرالا ہے۔ جس سے ذرا سا بھی وقت نہیں ملتا کہ کبھی فون کر کے ہی کسی کی خبر پوچھ لے۔“ وہ عائف چچا سے بولے۔

”سوری بھائی جان! بس کیا کروں ایسا الجھا ہوں اس برنس میں کہ کیا پتاؤں مجھ سے فضلہ نے کتنی بار کہا ہے کہ میں اسے کراچی لے جاؤں پھر وہی وقت کی کمی۔ کراچی جاتا بھی ہوں۔ بھاگم بھاگ میں ہی وقت گزر جاتا ہے، لیکن اب انشاء اللہ شادی میں ضرور آؤں گا۔ میرا آپ سے پکا وعدہ ہے اور فضلہ کو بھی ضرور لاؤں گا۔“ اسے معلوم تھا کہ ان کا وعدہ پہلے وعدوں جیسا ”پکا“ ہے۔

”خیر تمہاری مرضی۔ تم آنا یا نہ آنا لیکن فضلہ کو میں لے کر جا رہا ہوں۔ ایمن نے مجھے تاکید کی تھی۔ اب میں تو بچی کا دل نہیں توڑ سکتا اور اس فضلہ کی طرف دیکھا ہے تم نے کس قدر کمزور ہو گئی ہے اور رنگ بھی کیسا دھم سا ہو گیا ہے۔“

”بس بھائی جان! کیا کروں اتنی تو کوشش کرتا ہوں حتی الامکان جب بھی وقت ملے۔ اس کا خیال رکھوں۔ بس مصروف بندہ ہوں۔ بہت کچھ چاہتے ہوئے بھی نہیں کر سکتا۔ اس کا اپنا گھر ہے۔ یہ اپنا خیال خود رکھ لیا کرے۔ کوئی اسے منع کرتا ہے۔ یہ خود ہی ابھی تک بھبھکتی سب۔“ وہ روایتی لہجے میں بول رہے تھے۔

”اور تمہاری بیوی۔ اس کو کیوں بھول جاتے ہو۔ وہ یہاں کسی کو اپنی اجازت کے بغیر سانس لینے دیتی ہے جو اسے خیر بہر حال اب تو میں اسے اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ تم فضلہ! تیار رہو مجھے ایک دو جگہ کارڈ دینے جانا ہے۔ ایک تو تمہاری تائی جی کی۔ بن کے گھر اور ایک دو رشتہ داروں کی طرف اور پھر میں رات کو یا کل صبح آؤں گا اور تمہیں لے جاؤں گا۔“

وہ فضلہ سے بولے تو وہ سر ہلائے گی۔

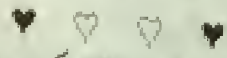
”اور عائف میاں! آجانا تم بھی۔ دو گھڑی کو اپنی مصروف زندگی سے وقت نکال کر ہم غریبوں کے لیے بھی۔ ہو سکے تو اپنی بیٹی کو بھی لے آنا پیسہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو۔ رشتے ناتے تو نہیں خرید کر دے سکتا۔ یہ تو خدا کے عطا کیے ہوتے ہیں اسے اپنے رشتہ داروں کی پہچان کرنا اور نہ ماں کی طرح وہ بھی زندگی کسی آدم پیزار کی طرح ہی گزار دے گی۔ اسے شادی میں ضرور لے کر آنا۔ سفینہ بھی آئے گی۔ سب سے ملاقات کرنا اس کی۔“ عائف چچا اثبات میں سر ہلائے گئے۔

”چچا! میں جتنا ہوں۔ رات کو یا کل صبح آؤں گا۔ فضلہ! تم تیار رہنا۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔
 ”بھائی جان! اکل چلے جائے گا۔ آج آرام کریں۔“ عائف چچا تکلفاً بولے۔

”نہیں! آج آرام کا وقت نہیں ہے۔ ابھی رات کے کام کرتے ہیں۔ تمہیں بہر حال تاکید ہے آجانا یا دے۔“ وہ کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔

فضلہ خوشی خوشی جا کر اپنا سوٹ کیس تیار کرنے لگی۔ کپڑے اس کے پاس کون سے ڈھنگ کے تھے وہی جو نرگس آنٹی کبھی کبھی سارہ کے نئے رانے نکال کر دیتیں ان ہی سے اس کا گزارا ہوتا تھا۔ کئی سالوں سے اس کے نئے کپڑے نہیں بنے تھے۔ ہاں غمی کو کبھی خیال آ جاتا تو وہ کسی نوکر کے ہاتھ اس کا نیا سوٹ منگوا لیتیں اور نوکر کا پسند کیا ہوا سوٹ بھی عجیب سا ہی ہوتا تھا۔ مٹی کو افسوس ہوتا مگر وہ کیا کر سکتی تھیں اور نرگس آنٹی عید تہوار پر سارے گھر کے نوکروں کے کپڑے سلواتیں۔ اسے ہمیشہ بھول جاتیں۔ عائف چچا کو بھی عید کے روز یاد آتا تو محض اس کو چند سو

روپے دے کر فرض سے سبکدوش ہو جاتے اور اسے تو خدا کرنا آتا ہی نہ تھا۔
 اس نے جلدی جلدی سوٹ کیس بند کیا اور لاؤنج میں آکر بیٹھ گئی اسے بیٹھے رات کے اٹھ بج گئے تیا جی آئے ہی نہیں۔ اس نے تنگ آکر کھانا بھی کھا لیا۔ چچا بھی گھر پر نہیں تھے۔ وہ صوفے پر بیٹھے بیٹھے ہی سوئی اور اٹنی صبح بھی ہو گئی۔ گیارہ بجے امید کی شمع بالکل ہی گل ہو گئی۔ تیا جی اسے بھول گئے تھے یا جان بوجھ کر چھوڑ گئے تھے۔ اسے لگا اب وہ اس فتنے سے کہیں بھی نہیں جاسکے گی۔ رات صوفے پر سونے کی وجہ سے اس کا جسم اکڑ سا گیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اسے بخار ہو جائے گا۔ کل سے زلہ زکام اور کھانسی بھی تھی پھر اوپر سے یہ دکھ۔ اس کا دل جیسے ٹوٹ سا گیا۔ وہ کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی پھر کوارٹر میں آکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔



درنایاب واقعی درنایاب تھی۔ اگر تائی جی اس کے انتقال کی خاطر یوں تن من و جان کی بازی لگائے بیٹھی تھیں تو کچھ غلط نہ تھا۔ وہ واقعی قدرت کی صنائی کا منہ پونٹا شاہکار تھی۔ جیسے سنگ مرمر کا تراشا ہوا حقیقی مجسمہ جو چھم سے تائی جی کی کسی نیکی کے انعام کے طور پر ان کے گھر آگئے تھے۔ انازل ہوا تھا۔ پکی دلی ٹاؤک سی اور رنگ اتنا سرخ و سفید کہ ہاتھ لگاتے بھی ڈر گئے کہ کہیں میلی نہ ہو جائے۔ باداموں جیسی بڑی بڑی براؤن آنکھیں لائٹ براؤن گندم کے خوشوں جیسے گھنگھریالے بال ہال اور اوپر سے شدید سے بیٹھا لہجہ کو کل سی سر کی توازن۔

ایمن جتنی دیر اس کے پاس بیٹھی رہی، یہی سوچتی رہی کہ کہیں تو قدرت نے کوئی کمی چھوڑی ہوگی لیکن فی الحال اپنی کوشش کے باوجود وہ کوئی ایسی خامی تلاش نہ کر سکی۔ تائی جی اس کے واری صدے جاری تھیں۔ اسے اپنے گھر میں دیکھ دیکھ کر ان کا جیسے خون بڑھ رہا تھا۔ ساری بیماری ساری بیماری انہیں بھول گئی تھی۔ خلاف توقع تیا جی بھی بے حد خوش تھے اور خوش کیوں نہ ہوتے۔ درنایاب کی گاڑی کے پیچھے سامان سے لدے پھندے دوڑکے جو آئے تھے، جن کو خالی کرنے میں ہی پوری رات گزر گئی تھی اور چند روز تائی جی کو اس سامان کو ٹھکانے لگانے میں لگے تھے۔

ویسے تو سارا کچھ درنایاب کا ہی تھا، لیکن پھر بھی کفیل ماموں نے دینے کی حد کر دی تھی۔ تائی جی کو جو سیٹ انہوں نے دیا تھا وہ دس تو لے کا تھا۔ کتنی راتیں انہیں نیند نہیں آئی تھی۔ رات گئے تک وہ سیٹ پہنے رکھتیں ہر آئے گئے کو کانوں اور گلے سے اتار اتار کر دکھاتیں۔

”دیکھو تو وزن پورے دس تو لے کا ہے اور یہ بازو کے کٹھن بھی تین تین تو لے کے ہیں، خالص سونے کی لشکارے مارنی چمک دیمک دیکھنے والوں کی آنکھیں خیر ہو کر دیتی اور تائی جی کا سر فخر سے اور اونچا ہو جاتا۔ تیا جی کی سونے کی انگوٹھی اور چین دنوں تائی جی نے سنبھال لی تھیں۔

”آپ نے اس عمر میں سونا پہن کر کیا کرنا ہے۔ ویسے بھی مرد کو سونا حرام ہے۔“ انہوں نے دونوں چیزیں اپنے قبضے میں کر لیں۔

اس قدر حسین و جمیل اور صاحب ثروت و لمن کو پا کر ابرار بھائی۔ جیسے سارے روئے بھول گئے تھے۔ اس جیسی درنایاب پر ایک حنا کیا اس جیسی دس حنائیں بھی ہوئے آرام سے قرآن کی جاسکتی تھیں بارات والے دن تک جو ان کا منہ سو جا ہوا تھا۔ پیشانی پر شکنوں کا جو جال پچھلے چار پانچ ماہ سے بنا ہوا تھا اب ایک ایسی اس کی جگہ خوشی و انبساط، محبت اور بہت کچھ پالنے کی انہونی مسرت نے جگہ لے لی تھی۔ ماں سے ان کے سارے گلے شکوے جاتے رہے تھے۔ درنایاب نے جیسے ان کے وجود ان کے خیال اور محبت سے محرومی جیسے سارے خلا پر کھڑے تھے۔ انہیں اب اس کے بغیر ایک بل چین نہیں آتا تھا۔ سارا دن وہ دونوں اپنے کمرے میں ہی رہتے تھے۔ دونوں صرف دو ٹائم کا کھانا کھانے باہر نکلتے تھے۔ ناشتہ اپنے کمرے میں ہی کرتے تھے۔

کفیل ماموں نے بیٹی کی خدمت کے لیے نوکرانی ساتھ دی تھی۔ جسے ہر وقت بی بی کی ڈائٹ کا غم ستا رہا تھا۔ ناشتہ اور کھانا درنایاب کی پسند کے مطابق ہی بناتا تھا۔ یہ ایمن کے حق میں اچھا ہی ہوا تھا۔ اس کے فاسل انگریز ام سر پر تھے۔ پہلے شادی کی تیاریوں میں اور بعد میں شادی کی مصروفیات میں اس کی بڑھائی کا بڑا حرج ہو چکا تھا۔ وہ اب ذہنت کو چن میں لگا کر خود پر ہنسنے بیٹھ جاتی۔ تالی جی کو بھی ساری عمر کی مشقت کے بعد جیسے اب ہی چین ملا تھا۔ وہ سارا دن بستر پر ہی اٹھتی رہتیں یا پھر کرسی اٹھ کے پورے گھر کا چکر لگاتیں اور سبے بجائے کمرے دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کرتیں۔

”وہ کھانا تو لید! میں تمہارے لیے بھی ایسی ہی دلسن ڈھونڈوں گی۔ بس تم ذرا نوکری سے لگ جاؤ۔“ وہ لید کو خوش کرنے کے لیے کہتیں۔

”سچ ای! واقعی ابرار بھائی کو تو دنیا میں ہی جنت اور حور و نون مل گئے۔ پتا نہیں اپنی ایسی قسمت ہے کہ نہیں۔ وہ امی کہتے ہیں جس نے اس دنیا میں جنت کے مزے لوٹ لیے۔“ اسے آخرت میں کچھ نہیں ملے گا اور یہ دنیا تو چند روزہ ہے اس کے جنت کی خاص ضرورت تو نہیں۔ میں تو یہ سب اگلی دنیا میں ہی لوں گا۔“ وہ یونہی ہانکنے لگتا۔

”فضول نہ بکا کرو! جنت تو انسان کو اپنے اعمال کی وجہ سے ملتی ہے۔ دنیا کے سارے امیر کبیر لوگ برے نہیں ہوتے۔ بہت زیادہ اچھے اور نیک بھی ہوتے ہیں۔ ان کے نیک اعمال کے بدلے ہی میں تو ان کو اس دنیا میں آسائش ملتی ہیں جو ان کی نیکیوں کی جزا کا ایک حصہ ہوتی ہیں۔ باقی کا آخرت میں ملے گا۔ یہ سب فضول باتیں ہیں کہ جس کو یہاں جنت مل گئی۔ آگے کچھ نہیں ملے گا۔ دیکھنا تو انشاء اللہ تمہارے لیے بھی ایسی ہی حور تلاش کروں گی میں۔“

”امی جان! یہ ابرار بھائی آفس کب سے جانا شروع کریں گے؟ ان کی چھٹی لمبی نہیں ہو گئی؟“ اس نے موضوع بدلا۔

”اے لو بھلا اب اسے آفس جانے کی کیا ضرورت۔ نوکری سے تو اس نے استعفیٰ دے دیا ہے۔ اب ذرا اپنی مومن سے فارغ ہو آئیں پھر تمہارے ماموں کے آفس جایا کریں گے۔ گلاس فیکٹری انہوں نے اس کے نام کر دی ہے۔ بس جا کر وہاں کا انتظام سنبھالے گا۔“ تالی جی کے ایشیائے کتاب پر جتنی ایمن کو بھی حیران کر دیا۔

”وہ اس کا مطلب ہے اب وہ بھابی کے لیے ایک روپیہ بھی لائیں گے تو وہ بھی ان کے باپ کے مال میں ہے۔ دیری سیڑ انی جان! یہ تو انہوں نے اچھا نہیں کیا۔ اپنی مردانگی ختم کر لی۔ آپ نے بھائی جان کو ختم کر دیا۔ اب وہ ساری زندگی اپنی مرضی کے اپنی خوشی سے کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔ سب کچھ بھابی کی وجہ سے بھابی کے دم سے اور بھابی کے حکم سے ہو گا۔ امی! آپ نے بڑے کھانے کا سودا کیا ہے۔ اب خود کو ان چند روزہ خوشیوں کا

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی بڑی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر لازم ہے لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بڑے مرتب سے محفوظ رکھیں

تاوان دینے کے لیے بھی تیار لیں۔ اس کا چہرہ حد درجہ سنجیدہ اور افسردہ ہو گیا تھا۔

”کیا بکو اس کر رہے ہو۔ ابرار کی جگہ کوئی بھی ہونا جو بھی نایاب سے شادی کرتا، سارا کچھ اسی کا ہونا تھا اور اس میں کیا برائی ہے۔ انہوں نے ہمیں اپنی بیٹی بھی تو دی ہے۔ اب اگر ہمارا بیٹا ان کا بازو بنے گا تو ہمیں اس بات کی خوشی ہونی چاہیے۔“

”امی جان! آپ کو کچھ بھی اندازہ نہیں۔ کیا ابرار بھائی اب یہاں رہ سکیں گے، کبھی نہیں۔ ماموں نے ان کو خرید لیا ہے اور آپ نے بڑی خوشی سے انہیں بچھ دیا ہے۔ امی! آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا ایک تو پہلے ان کی خواہش اور خوشی کا گلا گھونٹا آپ نے دوسرے ان کے ساتھ یہ ظلم کر دیا۔“ وہ افسوس سے سر ہلائے جا رہا تھا۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا، اگر انہوں نے ابرار کو گھر دامادی بنانا ہو تو بیٹی کو اوھر رخصت کر کے بھیجتے ہے وقوف!“

”صرف اس لیے کہ اب ابرار بھائی اپنی خوشی اور مرضی سے بھابی کے ساتھ وہاں جا سکیں گے اور ماموں پر کوئی الزام بھی نہیں آئے گا۔ وہ اتنے بڑے بڑے بزرگس میں ہیں، زندگی کا اتنا بڑا جوا انہوں نے یونہی تو نہیں کھیلایا اور آپ کی آنکھیں ان کی چمک دمک میں کچھ بھی نہیں دیکھ سکیں۔ کچھ بھی نہیں سمجھ سکیں اور حیرت ہے ابو نے آپ کو یہ سب کہنے کر دیا۔“ اب اس کا لہجہ غصیلہ ہو چلا تھا۔

”فضول بکو اس کیے جا رہے ہو۔ اتنی بڑی نعمت ہضم نہیں ہو رہی۔ خدا نے بیٹھے بٹھائے سن لی۔ نکشی نے سارے گھر کو روشن کر دیا اور تم جاہلوں کی طرح اپنی مردانگی کا روٹا روٹے جا رہے ہو۔ پیسے سے بڑھ کر آج کل کوئی مردانگی نہیں جس کے پاس پیسہ ہے۔ دلیری اور بہادری بھی اسی کی ہے ورنہ تو تم جیسے مرد بھی کیڑے مکوڑوں کی طرح دو دو ٹکوں کی نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ ان کی مردانگی کا دن رات مذاق اڑایا جاتا ہے۔ کوئی ان کو منہ نہیں لگاتا، تم کس مردانگی کی بات کرتے ہو پیسے کے بغیر خالی جش، یہ ذلیل ڈول کوئی معنی نہیں رکھتا۔ میدان عمل میں نکلو گے تو ماں کی باتوں کو سمجھو گے۔ ابھی تو یہ سب پٹ بھرے کی باتیں ہیں۔ آنتیں بھوک سے مل کھا رہی ہوں تو یہ سب لفظی بکو اس لگتی ہے۔ ہاتھ میں روٹی نہ ہو تو لوگوں کا ایمان سے یقین اٹھ جاتا ہے۔ لوگ خدا کو بھول جاتے ہیں وہ کیا کہا ہے کسی نے

چتر گن اسلام اے چھوواں نک

جے نہ ہوئے چھوواں بچوں جانندے مک
(اسلام کے پانچ رکن ہیں اور چھٹا روٹی اگر روٹی نہ ہو تو ان پانچوں کا وجود ختم ہو جاتا ہے) شکر کرو اللہ کا جس نے گھر بیٹھے بھائے اتنے دھن دولت سے نوازا دیا ہے۔ فقیری تو بزدل ہے کو کھر کے نزدیک لے جاتی ہے اور آج کل کی سفید پوشی اللہ میری توبہ اس سے اچھا انسان مر جائے۔“

تائی جی کی آواز بلند ہو گئی تھی اور غصہ ان کے چہرے سے چھلک رہا تھا۔

”چاہے بھوک کفر کے نزدیک لے جائے یا موت کے۔ میں ایسی روٹی ایسے رزق سے مرنے کو ترجیح دوں گا جو بیوی کے توسط سے مجھ تک پہنچے۔ آپ یہ بات میری لکھ لیجیے۔ چاہے کچھ ہو جائے مجھے ایسی جگہ شادی نہیں کرنی۔ جہاں اپنا آپ بیچ کر چھ مال ملے اور آپ بھی میرے لیے ایسی کوئی کوشش نہ کیجیے گا۔ ایک بیٹے کے بدلے جتنا مال مل گیا ہے۔ وہ آپ کی باقی زندگی کے لیے کافی ہے۔ اسی کو غنیمت سمجھیے گا۔ مجھے اپنے زور بازو کی کمائی چاہیے اور کچھ نہیں۔“ وہ غصے میں آکر کھڑا ہو گیا۔

”دیکھوں گی۔ اس زور بازو کا مان کتنے دن رہے گا۔ ذرا امتحان دے لو۔ نوکری کے لیے جوتیاں چٹخانی پڑیں گی تو خود ہی دماغ ٹھکانے آجائے گا۔“ وہ بھی دوبدو بولیں۔

اندر فون کی گھنٹی کافی دیر سے بج رہی تھی وہ ان ماں بیٹے کو یونہی الجھتا چھوڑ کر اندر بھاگی۔

”ہیلو! اس نے ریسیور اٹھا کر کہا۔

”ایمن! میں عبیرہ! ایمن! میرا رزلٹ آگیا ہے۔ ایف ایس سی کا۔ سیکنڈ پوزیشن آئی ہے۔ حیدر آباد بورڈ میں۔ ابھی بورڈ کے آفس سے آئی ہوں، کل کے اخبار میں تصویر بھی آئے گی۔ چاندی کا میڈل ملا ہے۔ ایمن! میرا میرٹ بن گیا ہے میڈیکل کا۔ ہائے ایمن! آئی ایم سوہنی۔ میں کیسے بتاؤں تمہیں؟“ عبیرہ نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ ڈالا۔

”واقعی! ریلی عبیرہ! مبارک ہو۔ بہت بہت۔ ہائے میں نے کتنی دعائیں مانگی تھیں کہ تمہارا میرٹ بن جائے۔ بابا کی کتنی خواہش تھی کہ ان کی کوئی بیٹی ڈاکٹر ضرور بنے۔ خدا نے ہماری سن لی، تمہیں پھر مبارک ہو۔“ وہ اونچی اونچی آواز میں خوشی سے بول رہی تھی۔

”ہاں ایمن! خدا نے سن لی ہے۔ اتنی مدت کے بعد خوشی ملی ہے غزالہ آنٹی کہہ رہی تھیں کہ وہ سب کی دعوت کریں گی اس خوشی میں ایک دور زمیں۔ تایا جی اور تائی جی کو بتا دینا۔ ضرور آنا ہے اچھا۔“ وہ بہت خوش تھی۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ بالکل آؤں گی۔ عبیرہ! تم فضلہ کو بھی فون کر دینا اور اسے آنے کے لیے بھی کہنا۔ شادی میں بھی نہیں آئی کتنا تایا جی نے اصرار کیا تھا کہ وہ ان کے ساتھ ہی چلے۔ عاکف پچا نے ٹال دیا کہ وہ خود اسے کراچی لائیں گے اور خود عین شادی والے دن سنگاپور سے سیدھا اوھر آگئے۔ مجھے اس قدر غصہ آیا کہ بتا نہیں سکتی۔“ وہ ان کے سامنے بول پڑی تھی۔

”عاکف پچا! لاہور کیا دنیا کے نقشے سے باہر ہے۔ آپ نے تو حد کر دی ہے، ہم تو اپنی بہن کی شکل کو ترس گئے ہیں۔ آخر کیا تصور ہے اس کا؟“ وہ سفینہ پھوپھو اور تایا جی کا لحاظ کیے بغیر عاکف پچا سے الجھ پڑی تھی۔

”مسوری بیٹا! فیکسٹ ٹائم انشا اللہ چند ہی دنوں میں اسے ضرور لے آؤں گا، تمہیں پتا ہے میں تو بڑی ہوتا ہوں بہت۔ بھائی جان آپ ہی ایمن وغیرہ کو لے آئیں، میں نے تو اتنی دفعہ کہا ہے۔ اب میرا کیا تصور۔“ وہ فوراً ”ہی اپنے کپڑے جھاڑ کر بے قصور بن گئے۔

”ہاں بھائی! یہ تو زیادتی ہے۔ میں بھی تو مومن کو اتنی دور سے لائی ہوں بہنوں سے ملوانے کے لیے۔ بچے ایک دوسرے کو دیکھ کر دریا مٹھمن ہو جاتے ہیں اور آپ تو ایک بار بھی فضلہ کو یہاں نہیں لائے، ہے نا ایمن۔“ سفینہ پھوپھو نے فوراً اس کی حمایت کی۔ وہ غصے کی وجہ سے ان کی ہاں میں ہاں بھی نہ ملا سکی اور عاکف پچا محض آئیں با میں شا میں کرتے رہ گئے۔

”ہاں کر دوں گی فون فضا کو۔ وہ اینڈ کرے گی تو تب ہے نا۔ ستر تو ان کے ملازم ہیں بلائے میں ہی آوا گھنٹہ دگا دیتے ہیں پھر بھی آئی سے کہوں گی۔“

”اور سون کو بھی بتاؤ گی۔“ وہ کچھ انک کر بولی ایک تو اتنی دور فون کرنا خاصا بڑا خرچہ تھا۔ کم از کم غزالہ آنٹی کے لیے۔ دوسرے شادی میں بھی سون کا رویہ کچھ اجنبی سا کچھ نارمل سا تھا۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں ہی اس نے پیپا کی طرح اپنا قد کاٹھ نکالا تھا کہ ایمن نے تو نظر بھر کر نہ اسے دیکھا۔ دوریاں رنگ لے آئی تھیں اس کے دوسرے میں بہت کر جوشی نہ تھی۔ پھوپھو کو وہ ماما کہتا تھا اور نیناں اور تانیہ کا دووانہ تھا۔ ایمن کو اچھا نہیں لگا تھا۔ ”سون کا مشکل ہے ایسی! پھوپھو کا فون آئے گا تو میں کہہ دوں گی ویسے بھی وہ ابھی تو شادی سے ہو کر گئی ہیں اتنی جلدی اسے کہاں لائیں گی۔“

”چلو ٹھیک ہے“ میں ذرا تائی جی کو بتا کر آؤں۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔ تم بھی اب بند کر ڈھیک ہے۔“ اس نے عبیوہ کو احساس دلایا۔

”ہاں ٹھیک ہے۔ خدا حافظ۔“ عبیوہ نے بھی جلدی سے کہا۔

”خدا حافظ۔“ اس نے ریسیور رکھا اور جلدی سے باہر تائی جی کو بتانے کے لیے باہر کی طرف لگی۔

اس روز واقعی پارٹی بڑی زبردست ہوئی تھی سب ہی آئے تھے سوائے فضا اور سون کے۔ تائی جی اور تائی جی اور ایمن تینوں درنا بیاں کی پچھائی گاڑی میں بیٹھ کر آئے تھے۔ لمبی سی گاڑی اور تائی جی کا دور سے لشکرے مارٹنا سٹ اور کنگن گور سے ان کا رویہ خاصا ڈینٹ ماہو گیا تھا۔

پارٹی میں سب ہی لوگ ان سے متاثر ہو رہے تھے اور ویسے بھی غزالہ آنٹی کے حلقہ احباب میں کون سے رئیس ابن ر میں آتے تھے۔ اساتذہ کی برادری کب اتنی بر آسائش زندگی گزارتی ہے سفید پوشی کا بھرم ان کے چہروں سے عیاں ہوتا ہے۔ کہتے ہیں علم کو بہت شرف ہے ایک عالم سو جاہل پر بھاری ہوتا ہے لیکن یہ پرانے زمانوں کی باتیں ہیں۔ آج کل ایک دولت مند صاحب ثروت سو عالم فاضل پر بھاری ہوتا ہے اور عالم تو اپنے مسکین اور سکرے سنے چلنے کی وجہ سے دور ہی سے پہچانا جاتا ہے اور جو دولت اسے کتابیں عطا کرتی ہیں۔ وہ سکے آج کے زمانے میں رائج الوقت نہ ہونے کی وجہ سے ان کے لیے سوائے شرمندگی کے اور کچھ عطا نہیں کرتے۔ اعلا گریڈ پر فائز پرو فیسر اور لیچرر تو پھر بھی اس Status Conscious Society (سٹیٹس کو آسینٹس دینے والی سوسائٹی) میں Move کرنے کے قابل ہوتے ہیں، لیکن عام سرکاری اسکول ٹیچرز اپنے بچوں کو سفید پوشی میں لپٹی عزت کے سوا اور کچھ نہیں دے سکتے۔ غزالہ آنٹی اور انکل جمال دونوں کی سروس اس بھرم کو قائم رکھنے کے لیے کوشاں تھی۔

شام گئے سب رخصت ہو گئے اسے بہت سے تحائف اکٹھے ہوئے تھے۔ غزالہ آنٹی کی پانچویں بیٹیوں نے علیحدہ علیحدہ گفٹ دیے تھے اسے۔ اس نے بہت جابا تھا کہ ایمن رات کو رک جائے وہ دونوں ڈھیر ساری باتیں کریں گی۔ لیکن تائی جی نے انکار کر دیا۔ ”پھر اسے لینے کون آئے گا پھر آجائے گی۔ غزالہ! تم عبیوہ کو کسی دن لے آنا دھر۔ اب تو ویسے بھی اس کا واعلہ ہو جائے گا دھر۔ باشل میں رہے گی تو کیا شہر تو ایک ہی ہو جائے گا نا پھر مل لیتا۔“ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر گاڑی میں جا بیٹھیں تو ایمن بھی بدولی سے عبیوہ سے مل کر ان کے ساتھ جا بیٹھی۔

”اس میں کوئی شک نہیں کہ عبیوہ کے مارکس بہت اچھے آئے ہیں۔ اس نے محنت بھی بہت کی تھی۔ خدا نے محنت کا پھل دے دیا اب آگے کی سوچو۔ غزالہ! کیا اس کا میڈیکل میں اینڈ مشن ہم افورڈ کر سکتے ہیں۔“ وہ غزالہ آنٹی کو

بلانے آئی تھی کہ مل کر تحائف کھولتے ہیں دروازے کے باہر ہی انکل جمال کی آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے۔ ”وہ تو جمال ٹھیک ہے، ہم افورڈ نہیں کر سکتے لیکن یہ بھی تو دیکھیں نا پچی نے کس قدر محنت کی ہے۔ اس کو اگر داخلہ نہ ملا تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا اتنی محنت کا نتیجہ یوں لا حاصل تو نہیں ہونا چاہیے۔“ غزالہ آنٹی بولیں۔

”لا حاصل کیوں میڈیکل کے علاوہ بھی تو بے تحاشا فیلڈ ہیں ایم ایس سی ہے۔ لیچرر شپ ہے۔ میڈیسن کا شعبہ ہے ایم فارمیسی ہے۔ اس کے علاوہ کمپیوٹر کی فیلڈ ہے۔ جس میں چاہے گریجویٹیشن کے بعد آگے پڑھ سکتی ہے۔ تمہیں پتا ہے نائڈیشن کے لیے پیسوں کی نہیں ہزاروں روپوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ باشل کے اخراجات اور کتابوں کا خرچ ہم کیسے برداشت کریں گے۔ پھر ریجہ کی شادی بھی کرنی ہے دو چار ماہ میں۔ آخر ہم اس کے سسرال والوں کو کب تک ٹال سکتے ہیں کچھ بیٹیاں ہیں۔ اب تک تو کم از کم دو تین کی شادیاں کر دینی چاہیے تھیں۔ ریجہ کو گریجویٹیشن کے چار سال ہو گئے ہیں۔ اس نے پرائیویٹ ایم اے بھی کر لیا ہے اور ہم ابھی تک اس قابل نہیں ہو سکے کہ کم از کم اس کے ہی ہاتھ پتے کر سکیں۔ اب جو کچھ اس کے لیے جمع ہوتا ہے وہ ہم عبیوہ کی پرہیزی پر لگا دیں تو کیا ریجہ کو ساری عمر کے لیے گھر میں بٹھالیں۔ ریجہ کے بعد تانیہ سال ہونے کو آیا۔ اس کے ایم اے کو اور اب ٹویس گریجویٹیشن کر رہی ہے۔ تم خود سوچو ان کی تعلیم کے اخراجات اور شادیوں کے اخراجات ایک طرف اور عبیوہ کی پرہیزی کے اخراجات ایک طرف یا تو چاروں پانچوں کی قربانی دے دو صرف عبیوہ کی خاطر۔“

جمال انکل پھر دو رابے پر کھڑے تھے جہاں سات سال پہلے کھڑے تھے۔ ایک طرف ابلی عبیوہ کے مستقبل کا سوال اور دوسری طرف ان کی پانچویں بیٹیوں کے مستقبل کا۔ اور وہ اتنے بے وقوف تو نہیں تھے کہ اس کی خاطر اپنی بچیوں کے مستقبل کو تباہ کر دیتے۔ غزالہ آنٹی بھی خاموش تھیں۔

”کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“ وہ کچھ دیر بعد پھر بولے۔ ”نہیں! آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔“ غزالہ آنٹی کی آواز بے جان تھی جیسے کھینچ کر نکال رہی ہوں۔ ”آج بھی ریجہ کی ساس پوچھ رہی تھی کہ کب ڈیٹ لینے آؤں۔ میں نے اسے کہہ دیا کہ چند دن تک میں فون کر کے بتا دوں گی۔“

”تم بھی تو یہی کہہ رہا ہوں“ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ عبیوہ مجھے بہت پیاری ہے اور پھر جس طرح اس نے ان سات سالوں میں ہمارے گھر میں خود کو اینڈ جسٹ کیا ہے۔ سب گری سر دی تھی ہے پھر پرہیزی میں بغیر ٹوشن اور کسی قسم کی مدد کے خود ہی اتنے اچھے مارکس لے لیے ہیں۔ وہ مجھے اپنی بچیوں سے زیادہ عزیز ہو گئی ہے۔ ان پانچویں نے ماں باپ کی شفقت اور محبت کے ہوتے ہوئے بھی اسٹڈیز میں اتنی کوشش کی کہ کوئی نمایاں کارکردگی نہیں دکھائی اور عبیوہ نے اتنی بڑی محرومی کا جس بہادری سے مقابلہ کیا ہے۔ میں اس بچی کا دل سے قدر دان ہو گیا ہوں لیکن غزالہ! میں کیا کروں۔ میں مجبور ہوں۔ میرے پاس فقط یہ تین کمروں کا گھر ہے اس کے علاوہ اگر کچھ ہو تا تو میں عبیوہ کے مستقبل پر قربان کر دیتا۔ بٹ آنی ایم ریلی سوری۔“ ان کا لہجہ حقیقتاً ”افسردہ تھا عبیوہ کی آنکھوں میں کمی از آنی۔“

”ہم کاش ہم اس کی صحیح سے قدر کر سکتے۔“ غزالہ آنٹی آہستہ سے بولیں۔ ”تم نے بھائی صاحب سے بات کرنی تھی۔ اپنی مجبوری کا حوالہ دینا تھا۔ تھوڑا بہت وہ ہمیں سپورٹ کر دیں اس سلسلے میں۔ کچھ ہم جھیل لیں گے میں ایک ڈیویشنز اور کر لوں گا۔ چند سالوں کی دقت ہوگی۔ آگے انشاء اللہ حالات بہتر ہو جائیں گے اور کچھ نہیں تو وہ باشل کے بجائے عبیوہ کو اپنے گھر میں رکھ لیں تو بھی خاصا خرچ بچ جائے گا۔“ جمال انکل نے کچھ دیر بعد کہا۔

”آپ کے کہنے سے پہلے میں دونوں سے بات کر چکی ہوں، انہوں نے صاف ہی کہہ دیا ہے کہ غزالہ یہ بات طے تھی کہ سب اپنا اپنا بوجھ خود اٹھائیں گے۔ میں نے تو خود ابھی ابرار کی شادی کی ہے اس میں ہی لاکھوں روپے اٹھ گئے ہیں۔ اب تو میرے پاس کچھ نہیں۔ دوسرے ایمین کی بات اور ہے وہ شروع سے رہ رہی ہے، میرا بیٹوں والا گھر ہے ایمین کی بھی ٹکرائی اس کی تائی سائے کی طرح کرتی ہے۔ اس پر عبیدہ کا آجانا۔ سوری تم خود ہی کچھ کر لو۔ بائبل میں اگر وہ رہے تو زیادہ اچھا ہے ہمارے حق میں بھی اور اس کے حق میں بھی۔“ غزالہ آنٹی نے شام کو کتنی دیر تباہی سے علیحدگی میں بیٹھ کر کسی باتیں کی تھیں۔

”ہوں تو ان سے کہتا تھا کہ وہ سکندر کے گھر کا کرایہ ہے اتنے سال ہونے کو آئے اسی میں سے کچھ کر دیں۔ اتنے سالوں سے بھی تو وہی وصول کر رہے ہیں، ہم نے کبھی پوچھا کتنی ترشی کے باوجود۔“

”میں نے یہ بھی کہا تھا کہ لگے ہاؤس بلڈنگ والوں کی قسطیں ابھی تک ادا کر رہا ہوں۔ سارا تو اس میں نکل جاتا ہے پھر تین بار گھر کی مرمت کروائی ہے دوبار گھر کو پینٹ کروایا ہے۔ مجھے تو اپنے پتے سے لگانا پڑ رہا ہے۔ اس سے تو اچھا تھا میں اسے بیچ ہی دیتا۔ کچھ ہاتھ تو آتا۔ میں تو خود پریشان ہوں۔ تمہاری کیا مدد کروں گا۔ آج کل میں ریشاڑا ہونے والا ہوں ابرار نوکری سے استعفیٰ دے بیٹھا ہے۔ پتا نہیں اب کیا کرے گا۔ ولید کی پرچائی کا ایک سال باقی ہے۔ تم میری پریشانی کا اندازہ کر سکتی ہو۔ میں کسے اپنے دکھ سناؤں؟ میں تو پھر چپ کر کے اٹھ گئی۔“ غزالہ آنٹی بولیں۔

”پھر؟“ جمال انکل کا لہجہ سوالیہ تھا۔

”پھر کیا؟“ وہ لانا جواب ہو کر بولیں۔

”کوئی صورت نہیں ہے اور۔“ وہ خود سے بولے۔

”اگلے ہفتے تک ریجہ کی ساس پھر فون کروے گی اور اب کے میں اسے ٹال نہیں سکوں گی۔“ کتنے جان لیوا مسائل تھے۔ اسے تو کچھ خبر نہ تھی۔

”پھر وہی مسائل۔ کسی ایک کے مستقبل کے لیے ہم ان پانچوں کے مستقبل کو تاریک نہیں کر سکتے۔ تم کل پرسوں خود ہی ریجہ کی ساس کو فون کر کے آئے کا کہہ دو۔ کم از کم ایک فرض سے تو سبکدوش ہوں۔ میرا تو ان ہی سوچوں نے دماغ خراب کر دیا ہے اب سب کام اللہ پر چھوڑ دو۔ عبیدہ سے کہو وہ سیدھا سیدھا جالی ایس سی میں ایڈمیشن لے لے بے شک اسے سب صورت حال بتا دیتا۔ سمجھ دار ہے مان جائے گی۔“

کیا صرف وہی سمجھ دار تھی۔ کیا سارے سمجھ دار ہی عذابوں سے گزرتے ہیں۔ پہلے کتنے جبر کے دوزخ تھے جن سے وہ گزر کر آئی تھی۔ اب خوشی کا کوئی جھوٹا آتما محسوس ہوا تھا تو حکم ہوا کہ ہوا کا اوھر سے گزر ہی بند کر دیا جائے۔ اگر کوئی اس کوئی امید کھلتا بھی چاہے تو ہوا کے بغیر دم گھٹ کے مر جائے۔

وہ مرے مرے قدموں سے اوپر بنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس وقت وہی کمرہ خالی مل سکتا تھا۔ نیچے تو پانچوں سوئے کے لیے لیٹ چکی تھیں۔ خوش گچیوں کا دور چل رہا تھا۔ وہ اس وقت کسی کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔

اور ہوا چل رہی تھی۔ وہ آخری سڑھی بڑھ گئی۔ آسمان تانوں سے جگمگا رہا تھا۔

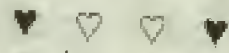
”آئی بڑی خوشی آتا ہوا خواب جو پورا ہونے کے نزدیک آیا تو اسے یوں اپنے ہی قدموں تلے پھیل دیں۔ اسے ٹھوکر مار دیں۔ اپنی ہی خواہش کا مذاق اڑاؤں۔ اسی چست پران ہی بیڑھیوں پر بیٹھ بیٹھ کر میں نے آدھی آدھی رات تک اپنا مغز کھپایا تھا کہ میں کتنی رات کو آنکھوں کے کتنے ہی خواب سجالے تھے اور جب ان خوابوں کے حقیقت ہونے کا وقت آیا تو میں خود ہی دستبردار ہو جاؤں۔“

میرے اللہ یہ کہتا امتحان ہے؟ اس کی آنکھیں بھر گئیں اس نے سر اٹھا کر ستاروں بھرے آسمان کو شکایتا

دیکھا۔ یہ محض آٹھ کھانے کی بات تو نہیں یا طبیعت پر جبر کر کے دال کھانے کی بات تو نہیں۔ زمین پر سونے کا معاملہ بھی نہیں۔ اگر پیار سے نفس کو جسم کو سمجھایا جائے تو جسم بہت سی قربانیاں دینے پر رضامند ہو جاتا ہے لیکن اگر نفس کی خواہش کو ہی برباد کرنے کا حکم دے دیا جائے تو بہت دور تک اور بہت دیر تک ٹوڑ پھوڑ ہوتی رہتی ہے اور اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ٹوڑ پھوڑ کے بعد اندرونی بندہ جی بھی سکے گا یا نہیں یا وہ اپنی مسخ شدہ شکل سے کھیرا کر خود کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے گا۔ اتنی بڑی خوشی سے دستبرداری کے بعد کیا میں اتنی زندہ دلی اتنی دلولہ انگیزی سے جی سکوں گی؟ کبھی نہیں۔

”میرے خدا میں کیسے خود کو تیار کروں اس قربانی کے لیے۔ پانچوں کے لیے ایک کے مستقبل کو تاریک کر دیا جائے۔ آخر میں ہی کیوں؟ میری ہی خواہشوں کو ہر بار مصلوب کیا جاتا ہے۔ صرف اس لیے کہ میرے ماں باپ نہیں۔ کوئی ایسا خیر خواہ نہیں تو اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔ میرے اللہ مجھ سے تو یہ کہا گیا تھا کہ محنت کرو پھل ملے گا میں نے تو پوری نیک نیتی خلوص دل سے محنت کی اور مجھے یہ پھل مل رہا ہے کہ نعمت دے کر مجھ سے چھینی جا رہی ہے بلکہ اپنی خوشی سے لوٹا دینے کو کہا جا رہا ہے۔ میرے اللہ کوئی رستہ نکال کوئی سبیل کوئی آس میری خوشی میری خواہش پوری کرنے کا پھر میں آپ سے کچھ نہیں مانگوں گی۔ کبھی بھی نہیں۔ اپنے لیے تو بالکل نہیں۔“ وہ دعا کرتے کرتے رونے لگی۔

”مجھے اپنے پیارے بندوں کا واسطہ میری دعا قبول فرمائے وہ کروے جو میرے حق میں بہتر ہے۔ میری خواہش پوری فرمادے۔ کہیں سے اتنے پیسے آجائیں کہ مجھے داخلہ مل جائے اللہ میاں میری دعا پوری فرما دے۔“ وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر آنسوؤں کی بستی لڑیوں کے ساتھ دعا مانگنے لگی۔



”عبیدہ! کون سے میڈیکل کالج میں ایڈمیشن لے رہی ہو۔ تم نے بتایا ہی نہیں اتنے دن ہو گئے میں انتظار ہی کرتی رہی۔ آج بھی بڑی مشکل سے تائی جی کی منت کر کے ان کے ساتھ آئی ہوں۔ تمہیں تو ذرا خیال نہیں آیا اور فون بھی تو غزالہ آنٹی کا ٹھیک نہیں تھا۔“

تو تائی ملتے ہی ایمین بولتی چلی گئی، ”وہ گھنٹہ پہلے ہی وہ تائی جی کے ساتھ آئی تھی۔ چائے پی کر اس نے کوئی دس دفعہ عبیدہ کو اشارے سے کہا باہر چلو۔ عبیدہ ڈھیٹ بن کر بیٹھی رہی جیسے اسے ان اشاروں کو سمجھ ہی نہ پاری ہو۔“

آخر تنگ آکر وہ خود ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور غزالہ آنٹی سے کہہ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر ہار لے آئی۔ ”تمہیں پتا ہے تائی جی مجھے صرف ایک گھنٹے کے لیے لائی ہیں۔ ابھی وہ جانے کے لیے شور مچا دیں گی۔ اور تم انجان بن کر بیٹھی ہوئی تھیں۔“ وہ باہر آکر فنگل سے بولی۔

”ام بی! تمہیں پتا ہے اگلے ماہ ریجہ کی شادی ہے۔ چیکس تاریخ کی ڈیٹ رکھی ہے، بڑی مصروفیت رہی ہے اسی لیے تو فون نہ کر سکی اور آگے بھی مصروفیت ہے۔“ وہ اس کی باتوں کو نظر انداز کر کے بولی۔

”ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔ ابھی تو غزالہ آنٹی بتا رہی تھیں تمہارے سامنے تائی جی کو۔ ویسے انہوں نے فون کر کے بھی بتا دیا تھا۔ اس میں کون سی نئی بات ہے بھلا؟“ وہ منہ بنا کر بولی۔ ”میں کیا پوچھ رہی ہوں مہم وہ بتاؤ کون سے کالج میں ایڈمیشن لے رہی ہو۔ میں آج اسی لیے آئی ہوں۔ میں نے تائی جان سے بات کر لی ہے وہ تمہیں اپنے گھر میں رکھنے پر راضی ہو گئی ہیں۔ اب تمہیں بائبل میں نہیں ریشاڑے کا کیسا؟“ وہ خوش ہو کر اس کے آگے ہاتھ پھیلا کر بولی کہ عبیدہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارے۔

”بے کار!“ وہ اس کا ہاتھ نظر انداز کر کے لاپرواہی سے بولی۔

”کیا مطلب؟“ ایمن نے آنکھیں پھیلانیں۔
 ”اس لیے کہ میں کسی میڈیکل کالج میں ایڈمیشن نہیں لے رہی۔ ادھر اپنے ہی کالج میں بی ایس سی میں ایڈمیشن لے چکی ہوں۔ اب تو کلاسز بھی شروع ہو چکی ہیں۔“ وہ بڑے آرام سے بولی۔
 ”عبیرہ! تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا؟ کیا بکواس کر رہی ہو۔“ ایمن اچھل ہی پڑی غصے سے اونچی آواز میں بولی۔

”آہستہ بولو ایسا کیا غضب ہو گیا کہ تم اچھل ہی پڑی ہو۔“ عبیرہ کچھ ناگواری سے بولی۔
 ”غضب؟ ابھی کیا غضب میں کس رہی ہے۔ تم کیا کہہ رہی ہو کہ تم نے میڈیکل کالج میں داخلہ نہیں لینا۔ تمہارا دماغ خراب ہو چکا ہے کیا مجھے غلط سنائی دیا ہے۔“ وہ تیز لہجے میں بولتی چلی گئی۔
 ”نہ تو میرا دماغ خراب ہوا ہے نہ تمہیں غلط سنائی دیا ہے۔ کیونکہ مجھے میرٹ بنانے کا شوق تھا، لیکن میڈیکل میں آگے جانے کا شوق نہیں تھا۔ بی ایس سی کے بعد میں ایم فارمی کروں گی۔ مجھے میڈیسن کی لائن پسند ہے۔ دیری سہل۔“ اس کا لہجہ ہنوز بے نیاز سا تھا ایمن کو غصہ آگیا۔

”عبیرہ! دیکھو، میرا دماغ الٹ جائے گا۔ مجھ سے صاف بات کرو کہ کیا بات ہے۔ تم کیوں ایڈمیشن نہیں لے رہیں۔ کیا تمہیں غزالہ آنٹی نے منع کیا ہے یا انکل جمال نے۔ مجھے سب بتاؤ۔“
 ”مجھے کوئی کیوں منع کرے گا بھلا۔ تم تو پاگل ہو ایمی! دیکھو، بات ہے وہ میں نے تمہیں بتادی ہے۔ یقین کرو میں خود یہ سب چاہ رہی ہوں میڈیسن مجھے پسند ہے۔ ایم بی بی ایس کر بھی لوں تو پھر ماؤس جاب کی خواری وہ بھی ہو گیا تو جاب کا مسئلہ، تمہیں پتا ہے آج کل سب سے زیادہ بے روزگار ڈاکٹرز ہیں۔ اتنا سرمایہ جھونک کر اگر مجھے دھکے ہی کھانے ہیں تو کیا فائدہ؟ اس لیے میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے؟“ اس کا انداز حتمی تھا۔

”عبیرہ! مجھے شک نہیں کرو مجھے صاف بات بتاؤ۔ تم اتنا بڑا قلم خود پر مجھ پر کیوں کر رہی ہو اور جہاں تک تمہارے شوق کا سوال ہے مجھے معلوم ہے نامعلوم کتنے سالوں سے تمہاری آنکھیں یہ خواب بن رہی تھیں کہ تم ڈاکٹر بنو گی۔ سبیا کا خواب پورا کرو گی اور جس روز رزلٹ کا تم نے مجھے فون پر بتایا۔ اس روز بھی تم نے اس خواب کے پورا ہونے پر خدا کا شکر ادا کر رہی تھیں، پھر یہ اچانک فیصلہ اور خواب میں تبدیلی کیونکر؟ تم ایسا کیوں کر رہی ہو؟ مجھے صاف صاف بتاؤ۔“ وہ ٹھہر ٹھہر کر نرم آواز میں اس کے پاس بیٹھ کر بولی۔

”ایمی! میری بہن ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کوئی مجھے مجبور نہیں کر رہا۔ میں اپنی خوشی سے اپنے ارادے سے ایسا کرنا چاہ رہی ہوں اور ضروری ہے کہ مرے ہوؤں کی سب خواہشیں پوری کی جائیں۔ زندہ لوگوں کے اور زندگی کے بھی بہت سے تقاضے ہوتے ہیں جو مرے ہوؤں کی خواہشوں سے زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔“ اس کی آواز مدھم تھی۔

”بلکواس کر رہی ہو تم۔ تم ایسا اپنی خوشی سے نہیں کر رہیں، تمہاری خواہش کو اپنی مرضی سے ٹھوکر نہیں لگا سکتیں اور میں تمہیں ایسا کرنے بھی نہیں دلاؤں گی۔ اگر تم نے ایسا کیا تو میں آج کے بعد تمہاری شکل بھی نہیں دیکھوں گی۔ یہ تم کو سنو۔ تم سب کچھ کی جگہ بخت کی مجھ پر کی ہو رہی ہو۔ اگر تم مجھے کچھ نہیں بتاؤ گی تو قسم سے میں تمہاری شکل آج کے بعد نہیں دیکھوں گی اور نہ تم مجھے دیکھ سکو گی بولو۔“ وہ یکدم خوش اور غصے سے کھڑی ہو گئی۔

”ایمی! کیا ہو گیا ہے تمہیں بات بات پر قسم کھانا، جھوٹوں کا شیوہ ہوتا ہے اور ایسی کیا بات ہے جو میں تم سے چھپاؤں گی۔ میرا تمہارا رشتہ ایسا ہے جو مر کر بھی نہیں ٹوٹ سکتا کہ مرنے کے بعد بھی لوگ ہمیں ایک دوسرے کی بہن کے نام ہی سے پکارتے ہیں۔ اس لیے ایسی جذباتی گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔“ اس کا لہجہ ہنوز ٹھنڈا ٹھہرا تھا جو

ایمن کو سلا گیا۔
 ”اگر تم مجھے نہیں بتانا چاہتیں تو پھر کو تو بیل۔ آج کے بعد مجھ سے کلام نہ کرنا۔ میں کہہ رہی ہوں اگر تمہیں میرا پایا کا ماما کا ذرا بھی خیال ہے تو تم اپنے فیصلے کو بدل لو گی، کل مجھے فون کر کے بتا دینا۔ میں جا رہی ہوں اگر تم نے ایسا نہ کیا تو دوبارہ ادھر کبھی نہیں آؤں گی۔ خدا حافظ۔“
 وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔ عبیرہ نے اس کے پیچھے جانے کی کوشش نہیں کی۔ اسے پتا تھا کہ وہ اس وقت شدید غصے میں ہے اس کی ایک نہیں سنے گی۔ تھوڑی ہی دیر بعد تائی جی اور آنٹی غزالہ کے الوداعی کلمات باہر سے سنائی دیے اور وہ تو کرسی پر کسی بات کی طرح ساکت بیٹھی تھی۔ خاموشی سے ان کے جاتے قد مول کی آہٹ سنتی رہی اور جب دروازہ بند ہونے کی آواز آئی اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس نے کرسی کی پشت سے سر ہٹا دیا۔

♥ ♥ ♥ ♥
 عاکف چچا سنگا پور گئے تھے شادی کی تاریخ آئی بھی اور گزر بھی گئی۔ وہ اگلے روز واپس آئے وہ وہ اس ولولہ لان میں بیٹھی تھی جب ان کی گاڑی پورچ میں آکر رکی۔ اگرچہ دل تو نہیں چاہ رہا تھا پھر بھی وہ بونسی اٹھ کر ان کی طرف چل پڑی۔
 ”اے السلام علیکم عاکف چچا!“ اس نے کچھ بے دلی سے سلام کر کے پاس سے گزر جانا چاہا۔
 ”و علیکم السلام کسی ہونٹہ! ٹھیک ہو؟ ایسے کیوں بیٹھی تھیں لان میں اندر چل کر بیٹھو۔“ ان کا مہوڈ خاصا خوشگوار تھا۔

”بس بونسی۔“ وہ جب خوش ہوتے تھے تو ایسے ہی اس کی فکر کرتے تھے۔
 ”کھانا کھا لیا تم نے۔“ وہ جب خوش ہوتے تھے سبکا پور۔ ان کی مسکراہٹ اس کا حوصلہ بڑھا گئی۔
 ”نہیں ابھی تو نہیں۔ آپ کہاں گئے ہوئے تھے سنگا پور۔“ ان کی مسکراہٹ اس کا حوصلہ بڑھا گئی۔
 ”ہاں وہیں گیا ہوا تھا، کل صبح اچانک یاد آیا کہ آج تو ابراہار کی شادی ہے بھائی صاحب تو سخت خفا ہوں گے۔ بس مت بوجھو جس طرح نکلتی رات آٹھ بجے کی فلائٹ سے کراچی پہنچا۔ رات روانہ ہو رہی تھی پھر بھی شکر ہے ٹائم پر پہنچ گیا۔ سب ہی آئے ہوئے تھے سب نے تمہارا پوچھا میں نے کہا مجبوری تھی میں خود آتا ہوں چکا تھا ورنہ تمہیں ضرور لے کر آتا۔ ایمن تو باقاعدہ مجھ سے لڑنے لگی۔ وہ شروع ہی سے منہ بچٹ اور ذرا بد لحاظ سی ہے، سفینہ نے اسے ڈانٹا۔ میں اس سے وعدہ کر کے آیا ہوں کہ انشا اللہ چند ایک روز میں تمہیں لے کر ضرور آؤں گا کراچی۔“

اب تم تیار رہی رکھنا کسی روز چلیں گے۔ چلو آؤ کھانا کھاتے ہیں بڑی بھوک لگی ہوئی ہے۔
 وہ اپنی روائی میں اسے سب کچھ بتاتے ہوئے اندر کی طرف بڑھے اور وہ تو پھر کی طرح ساکت ہو چکی تھی۔ عاکف چچا کراچی سے ہو بھی آئے مجھے لیے بغیر ایک چائس اس کے حلق میں اٹک گئی۔ آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئیں۔
 وہ بے حس کھڑی انہیں جاتا دیکھتی رہی وہ پیچھے آتے ذرا پیور سے معمول کے انداز میں باتیں کرتے ہوئے اندر چلے گئے۔ کھڑے کھڑے ایک دم سے اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔ گلا خشک ہو گیا۔ ناٹکوں سے جیسے جان نکل گئی۔
 ”پانی۔“ کہیں سے پانی مل جائے۔“ اس نے بڑی کوشش سے گردن ادھر ادھر گھما کر دیکھا۔ خشک حلق سے سانس کی آمدورفت بھی دشوار ہو گئی۔ ایک دم سے اسے ذہر سے کھانسی آئی اور ساتھ ہی آنکھوں سے آنسو اہل پڑے۔ وہ وہیں پورچ میں گاڑی سے نیک لگا کر بے تحاشا کھانستے ہوئے رونے لگی اسے جیسے اپنے اوپر اختیار نہ رہا تھا۔ ہر عمل جیسے بے قابو سا ہو رہا تھا۔ کافی دیر رونے سے اس کا پیٹ تو لپکانا ہوا۔ الپتو قفوف سے کھانسی کی بوجھ سے اس کے جسم میں اکڑاؤ سا پیدا ہو گیا۔ وہ خود کو گھٹیتے ہوئے کوارٹر تک لے آئی۔ شام تک وہ بستر میں بے سادہ

بڑی رہی۔ شام تک اسے بخار ہو گیا تھا۔ پہلے ہی تین چار دن سے سر بھاری اور نزلہ زکام ہو رہا تھا۔ ایک دم سے بخار
 بجھی ہو گیا رات کو عبدل کسی کام کے سلسلے میں اسے بلانے آیا تو اسے بے سدھ بڑے دیکھ کر شریفان کو اپنے ساتھ
 لے آیا۔ وہ اسے زبردستی اٹھا کر اندر کوٹھی میں لے گئی۔ عاکف چچا تو گھر پر نہیں تھے عبدل ہی جا کر ڈاکٹر سے زبانی بتا
 کر دوا لے آیا۔

وہ دو تین دن ادھر ہی رہی دوا کھانے سے خاصا افادہ ہوا تھا۔ بخار بھی اتر گیا تھا اور کھانسی زکام بھی بہتر ہو گیا تھا۔
 عاکف چچا ایک دو دفعہ اس سے طبیعت کا پوچھنے آئے تھے باقی اور کون تھا جس کی اسے فکر تھی۔
 ”اب میں کبھی کوئی آس کوئی امید نہیں لگاؤں گی اور نہ کسی سے کوئی فرمائش کروں گی اور کراچی کو بھول جاؤں
 گی۔“ بیماری کے دوران ہی اس نے خود سے عہد کر لیا۔

اس عہد کی پہلی آزمائش چند روز بعد ہی ہو گئی جب کالج میں ایڈمیشن ہونے لگے۔ عاکف چچا حسب عادت بھول
 گئے۔ اپنے فیجر سے کہنا اور اس نے بھی انہیں یاد نہ کروایا اور اچھا ہی ہوا یاد نہ کروایا اگر اس کا داخلہ ہو جاتا تو نرگس
 آنٹی نے خدا جانے کیا طوفان اٹھانا تھا۔ اس کی بیماری اور اداسی برترس کھا کر عاکف چچا نے سنگاپور سے لائے ہوئے
 سارہ کے لیے چار جوڑوں میں سے ایک اسے دے دیا۔ نرگس آنٹی کو خبر ہو گئی انہوں نے اس کی حد سے زیادہ بے
 عزتی کی کہ وہ خاموشی سے سوٹ وہیں کمرے میں رکھ کر واپس کوارٹر میں آ گئی۔

اب تو اس اجاڑ ویران اور خوفناک سے ماحول والے کوٹھڑی نما کوارٹر سے اس کو انیسیت ہو چلی تھی۔ یہیں آکر
 سکون ملتا تھا۔ اگرچہ باہر سے آنے والا اس کے سیلن زدہ ماحول سے گھبرا اٹھتا تھا، لیکن تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد وہ بھی
 عادی سا ہو جاتا تھا اور اسے تو اب اتنے دن ہو چکے تھے رہتے ہوئے۔

اور دنوں کا کیا ہے۔ وہ تو گزرتے ہی چلے جاتے ہیں۔ سو دن گزرتے چلے گئے۔ اس کی محرومیوں اور تنہائیوں میں
 اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اب تو کراچی سے فون آنا بھی کافی کم ہو گئے تھے۔ ہر کوئی اپنی زندگی میں مصروف ہو کر رہ گیا تھا۔
 اس کے لیے کس کے پاس وقت تھا۔ وہ انیکسی سے مئی کی کتابیں اٹھالائی تھیں اور ڈکشنری بھی۔ اردو کی ان کی جتنی
 کلیکشن تھی وہ سب اس نے چند دنوں پڑھ ڈالی تھی۔ بعد میں عبدل کی منت کر کے اس نے انیکسی کھلوائی تھی
 اور وہاں سے انگریزی کی کتابیں اٹھالائی تھیں۔ شروع شروع میں پڑھنے میں خاصی دقت ہوئی تھی اس کی انگریزی
 اتنی کون سی رواں تھی ایک ایک لائن پڑھتے ہوئے دس بار ڈکشنری کھولنی پڑتی پھر بھی کئی لفظوں کا مطلب معلوم
 ہونے کے باوجود جملے کا مطلب سمجھ میں نہ آتا تھا اور تنہائی میں کچھ اور کرنے کو بھی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ دوسری
 زبان کے لفظوں اور احساسات کا یہ ہیر پھیر اسے دلچسپ مشغلہ لگا تھا۔ تھوڑی دیر کو اکتاتی اس کے بعد پھر کھول کر
 بیٹھ جاتی۔ زبان دانی کا مسئلہ اس کے شوق کے آگے زیادہ دیر تک نہ جا سکا۔

ایک ایک کر کے اس نے انگلش کی ساری کتابیں پڑھ ڈالیں۔ انگلش لٹریچر انسانی فطرت میں چھپے ابدی دکھوں
 اور احساسات کی کتنی صحیح ترجمانی کرتا تھا۔ اس کا اندازہ ان ساری کتابوں کو پڑھنے کے بعد اسے ہوا تھا۔ بارڈی کے
 ناولز شیکسپیر کے ڈرامے اور کیٹس کی پوسٹری اسے بے تحاشا اپنی طرف کھینچنے لگے تھے۔ وہ بار بار ان کتابوں کو
 پڑھتی اور ہر بار نیا لطف اٹھاتی۔ انسانوں سے دوری نے اس کی احتیاجات کو بھی خاصا محدود کر دیا تھا۔ اسے اب کئی
 کئی ہفتے گزر جاتے۔ عاکف چچا سے ملنے ان سے بات کیے ہوئے اور اب دل اس بات کی خواہش بھی نہیں کرتا تھا۔
 اسے انسانوں سے جیسے وحشت سی ہونے لگی تھی۔ دو ٹائم جا کر وہ شریفان سے کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ لے آتی
 اور بس۔ نرگس آنٹی جب اس کی کلاس لیتیں تو وہ دو تین گھنٹے شریفان کے ساتھ کچن میں گزار لیتی جس طرح
 دوسروں کی نظر میں اس کی زندگی کا کچھ مقصد نہ تھا۔ اسی طرح دوسروں کی زندگیوں اور ان کے معمولات کا اس کی نظر
 میں کچھ مقصد نہ تھا۔

سارہ نے انٹر کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا۔ نرگس آنٹی نے اس خوشی میں زبردست فنکشن ارجی کیا تھا۔ وہ رنگ و نور کے سیلاب میں ڈوبے اس ہجوم کو کوارٹر کی تاریک فضاؤں سے دیکھتی رہی۔ ہلاکت شہر ہنگامہ زندگی اور زندہ لوگوں کی علامت ہوتی ہے اور وہ تو خود کو جیتے جی مردہ تصور کر چکی تھی۔ پھر ان چیزوں میں اسے کیا پریشانی، کیا کشش محسوس ہو سکتی تھی اور وہ کسی سنڈریلا کی طرح ایسے فنکشن میں جانے کے لیے بے تاب بھی نہ تھی۔

ہاں اگلے روز نرگس آنٹی نے اسے خوب ڈانٹا کہ اس نے رات کا فنکشن کیوں مس کیا۔ اس کے چچا کو اس کی فکر کھائے جا رہی تھی۔

”میں اور سارہ گیارہ بجے کی فلائٹ سے اسلام آباد جا رہے ہیں، کل شام تک آجائیں گے۔ گھر میں کچھ مہمان ہیں تم ان کا خیال رکھنا اور جا کر اس حجرے میں نہ گھس جانا۔ نوکروں کو من بانیاں کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور اب میں نے سنا کہ تم نے مہمانوں کو ٹھیک طرح سے انٹر میں نہیں کیا اور اس کو ٹھری میں چلی گئیں تو پھر دیکھنا۔ مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔ حد ہوتی ہے بے حسی اور شیلے پن کی بھی۔ پتا نہیں کیا چیز ہو نہ زندگی میں نہ مردوں میں۔“ وہ برسرِ طاق ہوئی برس جھلاتی یا ہر چلی گئیں تو وہ گراسائنس لے کر رہ گئی۔

”یہ دنیا کسی کو کسی حال میں کیوں جینے نہیں دیتی؟“ اس نے افسردگی سے سوچا۔ وہ پھر نرگس آنٹی کی ہدایت کے مطابق کوٹھی میں رہی۔ ”شریلاں! سب مہمانوں نے کھانا کھا لیا؟“ وہ ٹی وی دیکھتے دیکھتے تھک گئی تو آکٹا کر پگن میں چلی گئی۔

”ہاں جی۔ سب نے کھا لیا ہے۔ میں اب برتن اٹھانے جا رہی ہوں۔ وہ ایک مہمان ہیں بیگم صاحب کے وہ انیکسی میں ہیں۔ وہ کچھ دن وہیں رہیں گے انہوں نے کہا تھا کہ ان کا کھانا وہیں پہنچا دیا جائے۔ میں بھول گئی اب یاد آیا ہے۔ آپ بی بی جی! ذرا مہمانی کر دیو۔ یہ کھانا انہیں دے دو۔“ وہ لجاجت سے بولی۔ بوڑھی ہڈیاں کام کر کر کے تھک گئی تھیں۔ اسے ترس سا آگیا۔ انیکسی کا فاصلہ بھی تو کافی تھا۔ اس نے ٹرے پکڑ لیا۔

”پتا نہیں کون سا مہمان ہے جو کچھ دن رہے گا۔ خیر مجھے کیا اچھا ہے اور ہر آگئی۔ اب جا کر آرام کرتی ہوں۔ فضل اور ادرادھر کے کاموں نے تھکا دیا ہے۔“ وہ سوچتی ہوئی انیکسی کی طرف چلی گئی۔

اس کی دستک پر جس نے دروازہ کھولا اسے دیکھ کر وہ ذرا جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔ براؤن پینٹ شرٹ میں ملبوس وہ ایک خوش شکل ہینڈ سم نوجوان تھا۔ اسے بھی شاید ایسی کوئی توقع نہ تھی۔ وہ بھی کچھ حیرانی اور دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔

”یہ کھانا جی!“ اس کی نظروں سے گھبرا کر اس نے ٹرے آگے کر دی۔

”یہ کھانے کا نام ہے اتنی دیر سے۔ یہاں مہمانوں کی یہی تواضع کی جاتی ہے۔“ وہ خواہ مخواہ بگڑ کر بولا۔

”آئی دیر تو نہیں ہوئی۔“ وہ کچھ گھبرا گئی۔ نرگس آنٹی کی دھمکی یاد آگئی تھی۔

”ہاں دیر تو واقعی نہیں ہوئی۔ آپ کون ہیں یہاں ملازمہ ہیں؟“ اس کے سوال پر وہ کنفیوز سی ہو گئی۔ تعارف کے لیے تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے ٹرے اس کے ہاتھ میں تھمائی اور واپس پلٹ گئی۔ وہ حیران نظروں سے اسے دیکھتے دیکھتے رہا۔

”عجیب لڑکی ہے۔ کوئی جواب ہی نہیں دیا۔“ اس نے کندھے اچکا کر دروازہ بند کر لیا۔

گھر کا ماحول کچھ دنوں سے کھنچا کھنچا سا تھا۔ تائی جی کا مزاج اب ہر وقت برہم سار بننے لگا تھا۔ تائی جی کی خاموشی میں لمبے وقفے آتے تھے۔ وہ چپ بیٹھے کئی گھنٹے گزار دیتے۔ ان کی چائے کی پکار بھی خاصی کم ہو گئی تھی کیونکہ اس

پکار کی تکمیل کرنے والوں کی تیوریاں چڑھی رہتی تھیں۔ شادی کو تقریباً دو سال ہونے کو آئے تھے۔ درنایاب کے زیادہ دن اب میکے میں گزرتے تھے جس کی وجہ سے ابرار بھائی بھی اب گھر پر کم ہی نظر آتے تھے۔ دوسرے جب سے انہوں نے کفیل ماموں کا بزنس سنبھالا تھا۔ ان کے پاس وقت خاصا کم ہو گیا تھا۔ سارا دن فیکٹری اور آفس میں گزر جاتا۔ باقی کا وقت کفیل ماموں کی طرف۔ وہ اب گھر کم ہی آتے تھے۔ درنایاب جاتی تو اس کی ملازمہ بھی ساتھ ہی چلی جاتی۔ وہ جاتے ہوئے اپنے لاکھوں کے سامان سے آراستہ بیڈ روم کو لاک کر جاتی۔ ویسے اس طرح ہر دوسرے دن میکے جانا کوئی نئی بات تو نہ تھی کیونکہ وہ تو شادی کے شروع دنوں ہی سے ایسے جا رہی تھی اور تائی جی اسے بڑے شوق سے بھیجا کرتی تھیں۔

”بچی کبھی ماں باپ سے علیحدہ نہیں ہوئی۔ او اس ہو جاتی ہے پھر اکلوتی ہے۔ ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ اچھا ہے ذرا چلی جاتی ہے۔ تینوں کا دل بہل جاتا ہے۔ والدین کون سا شہر سے باہر ہیں۔ صبح ہے ابرار اتم لے جایا کرو نایاب کو۔“

اور نایاب کو جانے کے لیے ابرار کی محتاجی کب تھی، باوردی ڈرائیور ہمہ وقت لمبی مرسدیز گھر کے گیٹ کے آگے کھڑا رہتا تھا۔ چلو یہ تو شروع کے دن تھے۔ اب تو دو سال ہونے کو آئے۔ اب تو نایاب کو گھر کے ماحول میں کس ہونا چاہیے یہ تائی جی کا خیال تھا لیکن وہ ابھی تک مہمانوں کی طرح آتی اور چلی جاتی تھی۔ اس کے اس بے حس اور سرد رویے سے تائی جی اکتانے لگی تھیں۔ کئی بار وہ اسے دیکھ کر بھی نہ دیکھ پاتیں۔ اپنا دھیان خواہ مخواہ اور ادرادھر کر لیتیں، اسے بھی شاید تائی جی کے اسی رویے کا انتظار تھا۔ اس کا میکے میں قیام طویل ہونے لگا۔ اس نے آتے جاتے اب تائی جی سے پوچھنے کا تکلف بھی چھوڑ دیا اور ابرار آفس سے ہی فون کر کے پوچھ لیتا کہ نایاب کہاں ہے۔ وہ جہاں ہوتی وہ وہاں ہی چلے جاتے۔

ولید کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی لیکن ابھی جاب نہیں ملی تھی۔ تائی جی اگلے سال ریٹائرڈ ہو رہے تھے ابرار بھائی نے جب سے نوکری چھوڑی تھی تب سے وہ بالکل ہی فارغ ہو گئے تھے ہر قسم کے احساسِ ذمہ داری سے۔

گھر کی کمائی میں فرق آیا تھا۔ کھانے والوں میں تو کوئی کمی نہ ہوئی تھی لیکن کابجٹ تائی جی کے ہاتھوں سے نکل نکل جا رہا تھا۔ بجٹ قابو میں آجاتا تو بجلی گیس اور فون کے بل بس سے باہر ہو جاتے اور وہ سب کچھ مین مین رکھنے میں لپٹا ہو جاتے۔ اٹھتے بیٹھتے ابرار کو متاثر وہ اس کان سے سنتے دوسرے سے اڑا دیتے۔ سونے کی کان پر بیٹھ کر وہ نوالوں کو ترسنے لگی تھیں۔ پہلے ابرار بھائی آٹھ نو ہزار پہلی کی پہلی ان کی ہتھیلی پر لا دھرتے تھے اب نظریں ملانے سے بھی گئے تھے کتنے مہینوں سے انہوں نے تائی جی کو ایک روپیہ بھی نہیں دیا تھا۔ ولید کی بے کاری بڑے بیٹے کی لاپرواہی تائی جی کو بیمار کرنے کے لیے کافی تھی۔

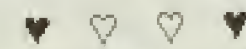
اور بے چارے ابرار بھائی کا بھی کیا تصور تھا۔ ان کے بیٹے دس لاکھ کی گاڑی ہوتی اور ذہن میں لاکھوں کے کاروباری پراجیکٹس اور پرافٹ کے کھاتے اور والٹ میں دو تین سو سے زائد کچھ نہ ہوتا تھا۔ انہیں چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا چیک کیش کروانے کے لیے نایاب کے سامن درکار ہوتے تھے اور درنایاب کسی بھی چیک کی وجہ تصرف جانے بغیر سامن نہیں کرتی تھی۔ اس محتاجی نے جیسے انہیں اندر ہی اندر سے توڑ ڈالا تھا۔ کہاں ہزاروں کی نوکری تھی اپنے ہاتھ کا راج تھا اور کہاں اب ایک ایک دھیلے کے لیے انہیں بیوی کی جنبش قلم کی طرف دیکھنا پڑتا تھا۔ اس وقت انہیں اپنا آپ بے حد چھوٹا اور ذلیل محسوس ہوتا تھا اور جب تائی جی کی نظریں ان سے سوال کرتیں تو کندھوں کے ساتھ ان کا سر مزید جھک جاتا۔ اسی شرمندگی سے بچنے کے لیے انہوں نے زیادہ تر کفیل ماموں کی طرف ہی رہنا شروع کر دیا تھا۔

ان ہی دنوں کفیل ماموں نے انہیں اپنے گھر کے ساتھ ڈیفنس کی کوٹھی کی چابیاں دی تھیں۔ جو نایاب کے نام

تھی۔ نایاب اور ماموں کے اصرار پر وہ ان دنوں اس کو ٹھی میں شفٹ ہونے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ مگر تائی جی سے بات کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ اور تائی جی کی آنکھوں میں اب ہلکے ہلکے پچھتاوے ہلکورے لینے لگے تھے انہیں اب صاف نظر آ رہا تھا کہ انہوں نے کھانے کا سودا کیا ہے۔ ہاتھ تو کچھ آتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ الثانیہ بھی ہاتھوں سے نکل گیا تھا۔ وہ دن بدن چڑچڑی ہوتی جا رہی تھیں، ان کی چڑچڑاہٹ کا شکار اینک ہی ہو رہی تھی۔ تائی جی کی وجہ سے اس نے پچھلے سال یونیورسٹی میں داخلہ نہیں لیا تھا۔ اب جو گھر کے حالات اچھے خاصے تاق کا شکار تھے۔ اس نے چپکے سے مایا جی سے کہہ کر یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا۔ تائی جی کو پتا چلا تو وہ خوب برہم ہوئیں۔ سب کا غصہ انہوں نے اس پر اتارا۔ وہ بھی چپ نہ رہی۔

یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہے میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے جو میں ڈروں۔ ڈریں وہ جو کوئی جرم کرتے ہیں یا گناہ کرتے ہیں، آپ ہر بات کا غصہ مجھ پر نہ اتارا کریں۔ میرا کوئی پوچھنے والا نہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں آپ بالکل ہی مجھے ذلیل کر کے رکھ دیں۔ جتنا کام یہاں رہنے کے بدلے میں آپ مجھ سے کروا لی ہیں۔ اتنے میں آپ کو دو تین ملازم رکھنے پڑ جائیں تو پھر پتا چلے اگر مجھے رکھ رہی ہیں یا سرپرستی کر رہی ہیں تو مجھ پر کوئی احسان نہیں کر رہیں ہونے۔

وہ زور زور سے کہتے ہوئے پیرنچ کر کمرے سے چلی گئی اور تائی جی حیرت اور غصے سے اس بے زبان اینک کو دیکھتی رہ گئی۔ جس نے کتنے سالوں بعد ان کے آگے زبان چلائی تھی اور وہ جواباً اس جتنا چیخ بھی نہ سکی تھیں نہ دوڑ کر اسے پکڑ کر دبا تھ ہی لگا سکی تھیں وقت وقت کی بات ہے جب اپنی ہی اولاد منہ کو آ رہی ہے تو یہ تو پھر؟ انہوں نے تھک کر گہرا سانس لیا۔



اس کا نام رہبرزدانی تھا وہ آنٹی نرگس کے کسی کزن کا بیٹا تھا۔ سی ایس ایس کے پیپرزدیے ادھر آیا تھا۔ تقریباً مہینہ بھر اس کا رہنے کا ارادہ تھا۔ نرگس آنٹی اور عاکف بچا اس کے آگے کچھ بچھ جا رہے تھے۔ ان سب باتوں کا پتا اسے اگلی رات کھانے کے دوران پتا چلا وہ شرفاں کے ساتھ پچن میں کام کروا رہی تھی۔ کھانا سرو کر دیا گیا تھا اس نے چپکے سے اپنا کھانا نکالا اور ٹرے میں رکھ کر اس نے شرفاں کو بتایا اور پچھلے دروازے سے باہر نکل گئی۔

یہ تو بارش شروع ہو گئی۔ آسمان بادلوں سے اٹا پڑا تھا اور دھواں دھار بارش شروع ہو چکی تھی۔ سرمای پہلی بارش تھی اس نے بھاگ کر لان عبور کیا۔ کوارٹر تک جاتے جاتے وہ مکمل طور پر بھگ چکی تھی اس کے کپڑے بارش میں شرابور ہو چکے تھے۔ اندر کو ٹھنڈی کالبل بھی فبوز تھا اس نے ٹرے چارپائی پر رکھی اور ٹرنک میں سے کپڑے نکلنے لگی۔

کپڑے بدلتے بدلتے اس کا جسم سردی سے تھر تھر کانٹنے لگا۔ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا اور لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی۔ پرانی روٹی کا بے جان سا لحاف اس کے سر و جسم کو گرم کرنے کے لیے ناکافی تھا۔ لحاف کے اندر وہ کپکپا رہی تھی۔ سردی برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔ کوارٹر کی کھڑکی بھی کھلی تھی جس میں سے شائیں شائیں ہوا آ رہی تھی اور اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اٹھ کر اسے بند ہی کرے۔

”یا اللہ کوئی آجائے۔“ اس نے کانپتے ہوئے دعا کی قبولیت کی گھڑی تھی اسی وقت کوارٹر کا دروازہ کھول کر عبدل اندر داخل ہوا اور دروازہ بند کرنا بھی بھول گئی تھی۔

”فضہ! فضہ! کراچی سے تمہارا فون آیا ہے۔“ عبدل نے اسے پکارا۔ وہ جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ وہ کچھ دیر کھڑا رہے پکارا پھر واپس جانے لگا جب اس نے ہنسی آواز دی۔

”عبدل چاچا! میں ادھر ہوں۔“

”میں کب سے تمہیں بلارہا ہوں۔ تمہارا فون آیا ہے۔“ وہ جھنجھلا کر بولا۔

”مجھ سے اٹھا نہیں جا رہا۔ مجھے سردی لگ رہی ہے۔ مجھے یہاں سے لے جاؤ۔“ اس کے دانت بچ رہے تھے۔

”تو کس پاگل نے کہا تھا۔ اس بارش میں ادھر آنے کو۔ میں شرفاں کو لے کر آتا ہوں۔ ویسے چلنا ہے تو میرے پاس چھتری ہے۔“ اس نے کچھ جواب نہ دیا تو وہ دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

جب شرفاں اسے سہارا دے کر اندر لائی فون بند ہو چکا تھا عاکف بچا اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

”کیا ہوا فضہ کیا ہوا؟“

”پتا نہیں صاحب جی! سردی سے تھر تھر کانپ رہی ہے۔ نیلی ہوئی پڑی ہے۔“ شرفاں بولی۔

”بارش میں بھیگی ہوگی۔“ وہ تشویش سے بولے۔

”گوارٹر میں جو گئی تھی۔ ابھی تو ٹھیک ٹھاک تھی۔ میرے سامنے گئی ہے۔ عبدل بلانے گیا تھا تو یہ حالت تھی۔“

”ہزار بار کہو اس کی ہے۔ ادھر نہ جایا کرو۔ وہ کوئی انسانوں کے رہنے کی جگہ ہے پر بڑی ڈھیٹ ہو۔ سنتیں نہیں۔“

چلو اسے ابھی ممی والے کمرے میں لے جاؤ۔“ وہ شرفاں سے بولے۔

عبدل ڈرائیور کے ساتھ جا کر ڈاکٹر کو لے آیا۔ تھوڑی دیر میں وہ بخار میں بے سدھ پڑی تھی۔ ڈاکٹر نے اچھی طرح چیک اپ کیا۔ دوائیں دیں انجکشن لگانے کی وجہ سے تھوڑی دیر بعد اس کا جسم کچھ نارمل ہو گیا۔ اگلے دن بخار کی وجہ سے اس کا دن سوتے جاگے گزرا۔ شام تک اس کی حالت سنبھل گئی۔ عاکف بچا وہ بار اس کا پوچھنے آئے تھے۔ ابھی شرفاں اسے سوپ پلا کر گئی تھی۔ وہ وہاں کھا کر لیٹ گئی۔

یہ وہی کمرہ ہے جہاں اس نے ممی کے ساتھ کتنے سال گزارے تھے۔ اس گھر میں آنے کے پہلے روز سے لے کر انیسویں میں شفٹ ہونے تک۔ اسے ممی یاد آنے لگیں۔ اس سے کتنی محبت کرتی تھیں۔ اس کا کتنا خیال رکھتی تھیں۔ اور اب کون ہے۔ مجھ سے محبت کرنے والا۔“ اس کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔

سامنے کی دیوار پر ممی کی جبو سا ترنصور لگی تھی۔ سفید لباس پہنے وہ وہیل چیئر پر بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔

”فضہ! آئی لو یو ڈار لنگ!“ ممی نے دھیرے سے کہا۔

”ہی ٹومی۔“ وہ آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپکے۔

اسے مری کی وہ شام یاد آنے لگی جب موسم کی پہلی برف باری ہوئی تھی اور ممی نے برف کا سفید کفن اوڑھ لیا تھا۔ انہیں سفید رنگ سے عشق تھا۔ اسے ایک دم سے لگا ممی کا سفید لباس برف سے بنا ہے برف کا سفید براق کفن۔ اسے جھرجھری سی آگئی۔ ممی آنکھیں جھپکنے لگی تھیں۔ وہ مسکرا رہی تھیں پھر ایک دم سے وہ ہنسنے لگیں۔

”فضہ جان! آجاؤ۔ ڈار لنگ میرے پاس آجاؤ۔“ وہ ہنستے ہنستے بولیں۔

اسے لگا۔ ممی کو کھانسی شروع ہو گئی ہے۔ وہ زور زور سے کھانسنے لگیں۔ ساتھ ہی خون اگلنے لگیں۔ انہیں خون کی ایکائی آئی سرخ سرخ گرم خون۔ ان کا سفید لباس جگہ جگہ سے سرخ ہو کر دکھنے لگا۔

”آؤ فضہ جان! آجاؤ میرے پاس۔ میں تمہا ہوں جان۔ ادھر بہت اندھیرا ہے۔ میرے پاس آجاؤ۔ تم تو ہمیشہ میرے پاس رہتی تھیں آج اتنے دنوں بعد اپنی ممی سے ملنے آئی ہو۔ مائی سویٹ ہارٹ آئی لو یو۔ وہ کھانسی کی پروا کیے بغیر بولتی جا رہی تھیں ایک دم سے وہ تصور گئے جو کھنے سے باہر نکل آئیں اور باہر انہیں پھیلا کر اس کی طرف بڑھیں۔

”نہیں نہیں۔“ اس نے لحاف اچھا کر ایک طرف پھینکا۔

”آجاؤ فضہ! میرے پاس تم بھی تنہا ہو میں بھی۔ آؤ ہم ایک دوسرے کی تنہائیاں بانٹ لیں۔ فضہ ڈار لنگ ڈرو نہیں۔ میں تمہیں لینے آئی ہوں۔“ وہ اب دیوار سے اتر کر قدم قدم وہیل چیئر کے بغیر اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

”نہیں نہیں۔ میں نہیں آؤں گی۔“ وہ چیخنے لے بغیر وہ باہر کی طرف بھاگی۔ اس نے پاگلوں کی طرح دروازہ کھولا۔ باہر کارڈور میں مکمل اندھیرا تھا۔ ڈر سے اس کی اور چیخ نکل گئی۔

”بچاؤ بچاؤ۔“ باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ مٹی بائیں پھیلائیں خون آلود کفن کے ساتھ مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ وہ دیوانہ وار باہر کی طرف بھاگی۔

باہر پھر بارش ہو رہی تھی وہ اندھا دھند باہر گیٹ کی طرف بھاگتی جا رہی تھی جب وہ ہاتھوں نے بڑھ کر اسے تھام لیا۔

”نہیں۔ بچاؤ میں نہیں جاؤں گی۔“ وہ زور زور سے چیخنے لگی۔
”نفسہ فضا کیا ہوا ہے؟“ بارش اور گیٹ کی ٹیالی روشنی میں اس نے بمشکل دیکھا۔ وہ رہبر روانی تھا۔ اس کے بعد اسے ہوش نہ رہا وہ اس کی بانسوں میں بے ہوش ہو چکی تھی۔

”عبیہ! کتنے بچے کالج سے آؤں گی آج تم؟“ وہ ناشتہ کر رہی تھی جب غزالہ آنٹی نے اس سے پوچھا۔
”لیٹ ہو جاؤں گی آنٹی! ایک تو بائیں کارڈیکٹیکل ہے دوسرے اس کے بعد آپ کو پتا ہے مجھے کمپیوٹر کلاس کے لیے جانا ہوتا ہے وہی چار ساڑھے چار بج جائیں گے۔“

”آج رہنے دو کمپیوٹر کلاس۔ تم کالج کے بعد سیدھی آ جانا گھر۔“ انہوں نے چائے کا کپ اس کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔ آپ کو پتا ہے پچھلے ہفتے بخاری وجہ سے میری تین چار کلاسیں مس ہو گئی تھیں۔ اب مجھے کوئی چھٹی نہیں کرنی ہے۔“ اس نے شدت سے نفی میں سر ہلایا۔
”بیٹا! کام ہے نا گھر میں۔“ وہ اس کے پاس آئیں۔

”خیریت آنٹی! ایسا کیا کام ہے جس کے لیے میرا گھر آنا ضروری ہے۔“ اس نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا کر گھونٹ بھرا اور آپ آج اسکول نہیں جا رہیں؟“

”نہیں۔ آج میں نے چھٹی لی ہے اصل میں تانیہ کو دیکھنے شام کو کچھ لوگ آ رہے ہیں۔ وہ ربیعہ کے شوہر سلیمان کے بڑے اچھے جاننے والی ہیں لڑکا کراچی اسکول مل میں انجینئر ہے۔ بس دو بسن بھائی ہیں اور ماں ہے۔ بسن کی شادی ہو چکی ہے کراچی میں ہوتے ہیں وہ لوگ اور جلدی شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔ ربیعہ مل چکی ہے ان سے۔ اسے بہت پسند آیا ہے لڑکا بھی اور فیملی بھی۔ انشاء اللہ امید تو ہے کہ ان کو تانیہ بھی پسند آجائے گی۔ تمہارے انکل بھی چاہ رہے ہیں کہ جلد سے جلد ان فرانس سے سبکدوش ہوں۔ اسی سال تو میری ریٹائرمنٹ ہو جائے گی اور اگلے سال ان کی اس دوران اگر تانیہ اور ثوبیہ کا ہو جائے تو بہتر ہے۔ آگے جو اللہ کو منظور۔“ وہ کہہ کر چپ کر گئیں۔
وہ توجہ سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

”چائے پو تم ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“ وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولیں۔
”آنٹی! اگر یہ بات ہے تو بھی میرے آنے کی بجلا کیا ضرورت ہے۔ تانیہ ہے نا گھر پر۔“ اس نے چائے کا گھونٹ بھر کر کہا۔

”وہ تو ہے لیکن ایک تو گھر کی صفائی وغیرہ ذرا اچھی طرح کرنا ہے دوسرے شام کی چائے کی تیاری بھی کرنی ہے۔ تانیہ کو خود سے تیار ہونا کہاں آتا ہے۔ یونہی سر جھاڑ پھرتی رہے گی پھر اوپر تلے کچھ ایسے عجیب سے پروڈلز آئے ہیں کہ وہ اس مسئلے سے ہی اچھی خاصی قیلاپ ہو گئی ہیں۔ میں نے ابھی اس سے کھل کر بات نہیں کی۔ یونہی بھڑک

اٹھتی۔ صرف اشارہ“ ذکر کیا تھا۔ باقی باتیں تم اس سے کر لینا تمہاری بات ذرا زیادہ سمجھتی ہے اور مان بھی لے گی۔ تمہارے جلدی آنے سے مجھے بھی سہولت رہے گی ثوبیہ کے تو ایگزٹام ہونے والے ہیں۔ اس نے تو ہر کام سے صاف جواب دے دیا ہے اور دونوں چھوٹیاں ویسے ہی لاپرواہ ہیں۔ ربیعہ کی ساس بیمار ہے ورنہ وہ آجاتی۔“ انہوں نے وضاحت کی۔

”اچھا ٹھیک ہے پھر میں کمپیوٹر کلاس نہیں لوں گی۔ جلدی آجاؤں گی۔ اب میں جاؤں مجھے کافی دیر ہو گئی ہے۔“ اچانک اس نے گھڑی پر نظر ڈالی تو کمپ ہاتھ سے رکھ کر فوراً کھڑی ہو گئی۔

”چائے تو لی جاؤ۔“

”نہیں آنٹی! پہلے ہی خاصی دیر ہو گئی ہے۔ میں جا رہی ہوں۔ خدا حافظ۔“ اس نے کرسی کی بیک سے لٹکا کالج بیک کندھے پر ڈالا اور چادر کھولتے ہوئے باہر نکل گئی۔
وہ بریکٹیکل سے فارغ ہو کر تقریباً ”تین بجے گھر پہنچی گھر آئینے کی طرح جگمگا رہا تھا اس نے گیراج سے گزر کر ایک نظر ڈرائنگ روم کے کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔ ڈرائنگ روم صاف ستھرا تھا۔ صوفیوں پر دھلے ہوئے کورز تھے۔ سینئر ٹیبل اور باقی فرنیچر بھی بالکل صاف ستھرا تھا۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر اس نے کپڑے چھینچ کیے اور باہر نکل آئی۔

غزالہ آنٹی اپنے کپڑے اٹھا کر واش روم کی طرف جا رہی تھیں۔

”السلام علیکم آنٹی! میں سمجھی آپ نماز ہی ہیں۔“ اس نے انہیں سلام کیا۔
”وعلیکم السلام میں نماز ہی جا رہی ہوں۔ تمہارا کھانا میں نے گرم کر دیا ہے۔ تم کھا کر ذرا تانیہ کی خبر لو۔ وہ سارا کام میرے ساتھ کروا کر اب مزے سے کوئی کتاب لے کر بیٹھ رہی ہے۔ ان لوگوں نے ساڑھے چار بجے تک آنا ہے۔ سو تین تو ہو چکے ہیں۔“ انہوں نے سامنے گئے کلاک گواک نظر دیکھا اور جلدی سے ہاتھ روم کی طرف بڑھ گئیں۔

”آنٹی! آپ نے اور تانیہ نے کھانا کھا لیا ہے؟“ اس نے انہیں پیچھے سے آواز دی۔

”ہاں ہم سب نے کھا لیا ہے۔ ثوبیہ اوپر پر پڑھ رہی ہے۔ اس کو چائے بنا کر بھیج دینا گریزا اور صائمہ یوشن چلی گئی ہیں۔“ وہ کہہ کر ہاتھ روم میں گم ہو گئیں۔

اس نے بچن میں جا کر جو لمبے پر چائے کا پانی ہلکی آنچ پر رکھا اور خود کھانا لے کر کھانے لگی کھانے کے بعد چائے کا ایک کپ وہ اوپر ثوبیہ کو دے آئی۔ اپنا اور تانیہ کا لے کر اندر آ گئی۔

”ہیلو کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے بظاہر کتاب میں مگن تانیہ کو خوش دلی سے پکارا حالانکہ اسے معلوم تھا کہ ایسی چوہیشن میں کوئی کم از کم کتاب نہیں پڑھ سکتا۔

”کچھ بھی نہیں۔ ویسے ہی یہ لے کر بیٹھ گئی تھی۔“ اس نے مشتاق احمد یوسفی کی ”آب گم“ بند کر دی۔
”یہ لیں چائے۔“ اس نے کپ اس کی طرف بڑھایا۔

”آج جلدی آگئیں تم۔“ اس نے چائے کا گھونٹ بھر کر پوچھا۔
”ہاں کمپیوٹر کلاس نہیں لی اس لیے آپ نے اپنے کپڑے پر لیس کر لیے۔“ اس نے اوہرا دھریو نسی نگاہ دوڑائی۔

”نہیں۔“ تانیہ نے مدھم آواز میں کہا۔
”اچھا چائے پی کر نکال دیں۔ میں کر دیتی ہوں۔ کون سے پنیں گی؟“

”میں ایسے ہی ٹھیک ہوں عبیہ وہ پلیز۔“ اس نے اپنے کپڑوں کی شکنیں ہاتھ سے مٹاتے کرتے ہوئے کہا۔

”اؤ نہ آپی! بری بات۔ ہر موقع کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ آپ تو مجھ سے زیادہ سمجھ دار ہیں۔ وہ آپ پر براؤن شیشوں کی کڑھائی والا سوٹ بڑا اچھا لگتا ہے۔ وہی پریس کر دوں؟“

”رہنے دو یہی ٹھیک ہیں نا۔“ وہ اصرار سے بولی۔

”پھر وہی بات“ آپ کو تو سب پتا ہے۔ آنٹی بے چاری صبح سے لگی ہوئی ہیں اب آپ اس طرح کریں گی تو ان کا دل برا ہو گا انہیں کی خاطر۔“

”ان ہی کی خاطر تو ہر بار خود کو اس بے ہودہ نمائش کے لیے تیار کر لیتی ہوں ورنہ۔“ وہ تلخی سے جملہ ادھورا چھوڑ کر بولی۔

”تو بس پھر بات ختم۔ ان کی خاطر آج ذرا دل سے تیار ہو جائیں کہ ان کا دل بھی خوش ہو جائے میں وہی کپڑے نکال دوں پھر۔“ وہ چائے کا خالی کپ میز پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہاں۔ وہی کر دو۔“ اس نے کہہ کر پھر سے کتاب کھول لی۔

وہ لوگ واقعی وقت کے پابند نکلے۔ ٹھیک ساڑھے چار بجے غزالہ آنٹی! انہیں اندر لا رہی تھیں۔ ایک ادھیڑ عمر کی خوش شکل عورت تھی اور دوسری شکل و صورت سے اس کی بیٹی لگ رہی تھی۔ ان دونوں کے پیچھے وائٹ شرٹ اور براؤن پینٹ میں ایک لڑکا تھا۔ انہیں اندر بٹھانے کے تھوڑی دیر بعد غزالہ آنٹی کچن میں آکر انہیں چائے لانے کا کہہ گئیں چائے کی ٹرائی تیار تھی صرف چائے دم پر رکھی تھی۔ عبیرہ نے جلدی سے کیتلی میں چائے ڈالی۔ اس کے اوپر پی کوزی رکھی۔

”چلیں۔ میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔“ وہ تانیہ سے کہہ کر ٹرائی لے کر آگے بڑھی۔

”السلام و علیکم!“ ذرا ہنگ روم میں داخل ہو کر دونوں نے آہستہ آواز میں سلام کیا باتیں کرتے وہ لوگ انہیں دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

”و علیکم السلام۔“ ادھیڑ عمر عورت نے ذرا مسکرا کر جواب دیا۔

”او بیٹا! بیٹھو۔“ اس نے دونوں کو مخاطب کر کے اپنے بالمقابل پڑے صوفے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ تانیہ آہستگی سے آگے بڑھ کر بیٹھ گئی۔ وہ ٹرائی سے پلیٹیں نکال کر سینٹر ٹیبل پر رکھنے لگی۔

”ہاں اللہ بڑی پیاری بچیاں ہیں۔ اللہ ان کے نصیب اچھے کرے دونوں آپ کی بیٹیاں ہیں۔“ انہوں نے غزالہ آنٹی سے پوچھا۔

”جی دونوں میری بیٹیاں ہیں۔“

”میں مسز حق ہوں۔ یہ میری بیٹی عاصمہ ہے اور یہ میرا داماد سہیل۔ اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ ہم لوگ کیوں آئے ہیں ہے نا۔“ وہ بے تکلف لہجے میں مسکراتے ہوئے بول رہی تھیں۔ تانیہ کا سر مزید جھک گیا۔ عبیرہ بھی چائے بناتے ہوئے مسکراتے ہوئے لگی۔

”آپ کا کیا نام ہے بیٹا؟“ انہوں نے تانیہ سے پوچھا۔

”جی تانیہ جمال۔“ تانیہ بمشکل بولی۔

”اچھا نام ہے۔ کیا تعلیم ہے آپ کی؟“

”میں ایم اے کر رہی ہوں۔“

UrduPhoto.com

UrduPhoto.com

UrduPhoto.com



۵
پانچویں قسط

”ہوں اور بیٹا! آپ کا کیا نام ہے؟“ انہوں نے کپ اپنے آگے رکھتی عبیرہ سے پوچھا تو وہ کچھ حیران سی ہو گئی۔
”عبیرہ۔“ وہ کہہ کر پلٹ گئی۔
”ماشا اللہ پیارا نام ہے۔ آپ پڑھتی ہیں۔“

”جی۔“ اس نے مختصراً کہا۔
”کون سی کلاس میں۔“
”بی ایس سی تھرڈ ایئر میں۔“
”کون سے سبجیکٹس۔“ بی بی ایس سی میں؟“ عاصمہ نے کپ تھامتے ہوئے پوچھا۔
”بائنٹی اور کیمسٹری۔“
”اور کیا مشاغل ہیں آپ کے؟“ اسے ان سوالوں سے الجھن ہونے لگی۔
”کمپیوٹر کورس کر رہی ہوں ساتھ۔“

”اچھی بات ہے ادھر ذرا میرے پاس تو آکر بیٹھیں۔“ مسز حق کی فرمائش پر اس نے سوالیہ نظروں سے غزالہ آنٹی کی طرف دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں بھی الجھن تیر رہی تھی سب دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے زبردستی مسکراتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا وہ جا کر مسز حق کے دائیں طرف بیٹھ گئی۔
”بڑی پیاری بچی ہے آپ کی مسز جمال۔“ وہ اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولیں۔
”جی! غزالہ آنٹی نے کھنکھار کر گلا صاف کیا وہ پزل سی ہو رہی تھیں۔ تانیہ سپاٹ چہرے لیے بیٹھی تھی۔
”ایک سیوڑی آنٹی! مجھے ذرا بچن میں کچھ کام ہے۔“ وہ ماحول کے کھنچاؤ سے گھبرا کر دوسرے ہی لمحے کھڑی ہو گئی اور باہر نکل گئی۔ کچھ دیر بعد تانیہ بھی باہر آگئی۔ اس کے تاثرات ہنوز سپاٹ تھے۔
”عبیرہ! اندر سے برتن لے آؤ۔ ای کہہ رہی ہیں کچھ دیر بعد۔“ وہ کہہ کر چھپاک سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

وہ خواجوا شرمندہ سی ہو گئی تھی۔
”درا اصل عبیرہ میری مرحومہ بہن کی بیٹی ہے۔ ماں باپ دونوں بچپن ہی میں ایک روڈ انہکسیڈنٹ میں فوت ہو گئے تھے اس کی دو بہنیں اور ایک بھائی لگا ہے۔ وہ اپنے دو سرے رشتہ داروں کے پاس رہتے ہیں۔ یہ بچپن سے

میرے پاس ہے۔" وہ جو برتن لینے اندر جا رہی تھی باہر ہی ٹھٹھک کر رک گئی۔
 "اوہ بڑا افسوس ہوا آپ کی بہن کے بارے میں جان کر۔" مسز حق بولیں۔
 "بہر حال ہمیں تو آپ جانتی ہی ہیں سلیمان اور ربیعہ کے توسط سے۔ میرے بچے سے بڑے اچھے تعلقات ہیں
 سلیمان کے ہمیں آپ کے گھر کا رہن سہن پسند آیا ہے۔ ہے نا عاصمہ بیٹا میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔" وہ بیٹی سے
 مخاطب ہوئیں۔

"جی امی بالکل۔ ہم جیسے لوگ چاہرے تھے آپ دیے ہی ہیں۔" عاصمہ جواب دہ ہوئی۔
 "آپ اب کب آئیں گی سہیل کو دیکھنے؟" غزالہ آنٹی سے بولیں۔
 "جب آپ کہیں۔" خوشی ان کے بچے سے عیاں تھی۔
 "میرا خیال ہے۔ اگلا جمعہ ٹھیک رہے گا۔" عاصمہ نے کہا۔
 "جی آنٹی! امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" بیٹی ضرورت سے زیادہ سعادت مند تھی۔
 "جیسا آپ مناسب سمجھیں۔"

"میرا بیٹا بھی انشا اللہ آپ کو پسند آئے گا اور میرا گھر بھی اور گھر پر تو ہم دونوں ماں بیٹا ہی ہوتے ہیں۔ عاصمہ کی
 شادی کے بعد ہو کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔ اس لیے شادی بھی ہمیں جلدی کرنی ہے اور بہن صاف بات
 ہے ہمیں نہ جینز چاہیے اور نہ دوسری فضول رسموں کی میں قائل ہوں میں اور میرے بچے سادگی پسند ہیں۔
 نمودار نمائش سے ذرا دور ہی بھاگتے ہیں۔"
 "جی یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" غزالہ آنٹی بے حد خوش لگ رہی تھیں۔

"چلیں۔ میرا خیال ہے سہیل بیٹا۔" وہ بولیں۔

"جی امی چلتے ہیں۔" وہ تینوں شاید کھڑے ہو گئے تھے۔

"لو کی کاٹھن جیہ تو اس کی اچھی تربیت اور تعلیم ہوتے ہیں جس کا آج کل فقدان ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے آپ کے
 گھرانے کی یہی بات اچھی لگی ہے۔ ربیعہ کی تعریفیں اس کے سسرال والے کرتے ہیں تو یونہی نہیں کرتے۔ ظاہر
 ہے آپ کی تربیت ہے۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے باہر آ گئے۔ عبیدہ جلدی سے کچن میں چلی گئی۔

"اچھا غزالہ بہن! اب اجازت دیں۔" وہ کچن میں آکر رک گئیں۔

"جی بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ امید ہے آپ دوبارہ بھی آئیں گی۔" غزالہ آنٹی خوش دلی سے بولیں۔

"جی کیوں نہیں انشا اللہ اب ہم ملتے رہیں گے۔ ذرا عبیدہ بیٹی کو تو بلائیں میں جاتے ہوئے اسے پیار تو کر لوں۔"
 یہ جملہ تھا یا کوڑے کا سا نسا جو دعائیں سے کچن میں کھڑی غزالہ آنٹی کچن میں برتنوں سے الجھتی عبیدہ اور کمرے کی
 گھڑکی کے پیچھے کھڑی تانبہ کی ساعوتوں پر رہا تھا۔

"جی! کتنی دیر بعد غزالہ آنٹی کی آواز نکلی۔"

"عبیدہ کو بلا میں ذرا۔" وہ پھر بولیں۔

"عبیدہ! ادھر آؤ۔" غزالہ آنٹی کی مری مری کار اسے سنائی دی وہ کچھ دیر بعد مردہ قدموں سے باہر نکلی۔

"جی! اس کا جی" وہ خود ہی سن سکی تھی۔

"بیٹا! ادھر آئیں میرے پاس۔" مسز حق دونوں کی کیفیات سے بے نیاز اسی لگاؤ سے بولیں۔ وہ گمن گمن کر قدم

بڑھاتی ان کی طرف بڑھی۔

"اچھا بیٹا! ہم پھر آئیں گے۔ میرے اللہ نے چاہا تو آپ کو لینے۔" وہ اس کا ہاتھ چوم کر محبت سے بولیں۔
 انہوں نے پرس سے ہزار کانوٹ نکال کر عبیدہ کے ہاتھ میں دینا چاہا۔ اسے جیسے کرنٹ سا لگا۔ وہ بدک کر پیچھے
 ہٹی۔

"نہیں مسز حق! یہ نہیں۔ اتنی جلدی۔" غزالہ آنٹی بھی گھبرا گئیں۔

"مسز جمال! یہ ہماری خوشی ہے بچی کو سوکھا پیار تو نہیں دے سکتی نا میں یہ لو بیٹا رکھ لو۔" انہوں نے زبردستی نوٹ
 پھر اس کی طرف بڑھایا وہ اسی طرح کھڑی رہی۔

"پھر سہی مسز حق پلیز۔ ابھی نہیں۔ میں جمال سے مشورہ تو کر لوں۔" غزالہ آنٹی ذرا حتمی لہجے میں بولیں۔

"جوڑے بے شک آسمانوں پر بنے ہیں لیکن عبیدہ میری بیٹی تو بن سکتی ہے اتنی پیاری بیٹی سے پہلی بار مل کر میں
 یونہی تو نہیں جاسکتی نا۔ رکھ لو بیٹا! ایک ماں کی طرف سے اپنی بیٹی کے لیے۔" انہوں نے اپنی محبت سے کہہ کر نوٹ
 اس کے ہاتھ میں دیا کہ وہ انکار ہی نہ کر سکی۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

وہ اسے پیار کر کے باہر کی طرف بڑھ گئیں۔ غزالہ آنٹی ان کو بھجورے گیٹ تک گئیں وہ حیرانی سے نوٹ کو دیکھنے
 لگی۔

"غزالہ آنٹی! یہ۔۔۔" جب غزالہ آنٹی دروازہ بند کر کے واپس آئیں تو اس نے نوٹ ان کی طرف بڑھایا۔ ان کا
 چہرہ بے تاثر تھا اور قدم بے حد ست!

"رکھ لو۔ تمہیں دے کر گئی ہیں۔"

وہ رکھائی سے کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں تو اسے جیسے شاگ سا لگا وہ دکھ اور حیرت سے غزالہ آنٹی کی
 طرف دیکھتی رہ گئی۔



سوتے میں اس کی بند آنکھوں کے بند پونے تھوڑی دیر بعد پھر بھڑا رہے تھے۔ باوا امی بڑی بڑی روشن آنکھیں
 جن میں ایک دنیا حسرتوں اور امیدوں کی آباد تھی۔ ان پونوں کے پیچھے بے خبر بڑی سوری تھیں ان باوا امی آنکھوں کا
 سکھار لاسٹ براؤن تیر کمان جیسے ابھڑ جن کے اوپر کشادہ روشن پیشانی (جو خوش بختی کی علامت سمجھی جاتی ہے
 یہاں صرف حسن کا ضمنی صفحہ تھی) سے نیچے جاتی چھوٹی سی جھکھی ناک اس کے چہرے کی سب سے معصوم گواہ۔
 جس کے نیچے دو خم شدہ سرخ ہونٹوں کا جوڑا ننھے سے دبانے میں سمٹا ہوا تھا۔ ابھرے ابھرے سفید رخسار اور
 کالوں کی لوہوں تک باوا امی ہلکے ہلکے بال اس خوبصورت حسین دنیا کا جیسے احاطہ کیے ہوئے تھے اور وہ صورت جیسی
 صورت نازک سی پتلی گردن پر ایستادہ تھی اور چھوٹی چھوٹی سی مخروطی انگلیوں والے سفید نازک ہاتھ سینے تک
 بوڑھے کمبل پر دھرے تھے۔ وہ حسن کی ایک مربوط کتاب تھی ان چھوٹی ان پڑھی۔ جس طرح وہ خود اپنے حسن کے
 اس انمول خزانے سے بے خبر تھی اسی طرح اس کے ارد گرد کا ماحول بھی قدرت کے اس شاہکار سے بے پروا تھا۔
 وہ برف سے حسن تلے دبے خزانے کی آج دھیرے دھیرے جیسے رہبر زوالی کو پکھلا رہی تھی اس کی انگلیاں اس
 کے کس کو محسوس کرنا چاہ رہی تھیں۔

اندرونی اضطراب سے بے قرار ہو کر اس نے اپنی انگلیوں کی پوروں کو چائے کے کپ کے کناروں پر پھیرنا شروع
 کر دیا۔ سو یا ہوا انمول شاہکار اسے عجب طرح کے کرب میں مبتلا کیے دے رہا تھا۔ وہ اپنی ہی بے خود کیفیات سے
 مجھرا کر کھڑا ہو گیا اور جا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ رات جب وہ اس کی بانہوں میں بے ہوش ہوئی تھی تو اسے

بریشانی کی وجہ سے اور کچھ نہ سوجھا وہ اسے انیکسی میں لے آیا تھا اور بستر پر لٹا کر کوسھی کی طرف دوڑا وہاں سے شریفان اور بتول کو بلا کر لایا۔ عاکف انکل تو گھر پر نہیں تھے نرس آئی سوچکی تھیں اس نے ڈرامیور کو بھیج کر ڈاکٹر کو بلا لیا جس نے بڑی اچھی طرح اس کا چیک اپ کیا تھا۔

”یہ کسی چیز سے خوفزدہ ہو گئی تھیں دہشت سے بے ہوش ہو گئی ہیں۔ میں نے انجکشن لگا دیا ہے ابھی کچھ دیر میں ہوش آجائے گا تو انہیں گرم دودھ کے ساتھ یہ دوائیں دے دیں۔ انشا اللہ صبح تک ٹھیک ہو جائیں گی۔“ ڈاکٹر نے نسخہ لکھ کر اس کی طرف بڑھایا رات اس کے پاس بتول سوئی تھی خود وہ اندر کوسھی میں جا کر سو گیا تھا اور اب صبح اس کا پتا کرنے آیا تھا۔ وہ ہوش و خرد سے بے گانہ سو رہی تھی جب وہ اس کے خدو خال کو حرف حرف پڑھنے بیٹھ گیا تھا اور یہ صرف اس کی آنکھوں کے رستے دل پر نقش ہو گئے تھے۔ ان نقوش کا اثر کتنا دیر پا ہے اسے معلوم نہیں تھا لیکن اس وقت اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وقت ختم جائے اور وہ اس کے سامنے اسی طرح بے خبر لیٹی رہے اور وہ ان حروف کو اپنی بصارتوں میں سمواتا رہے۔

اس نے ذرا سا کراہ کر کروتلی اور آنکھیں کھول دیں۔ وہ اپنی بے خود حالت سے جیسے باہر آکر متوجہ ہوا وہ آنکھیں جھپک جھپک کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے اس کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ دوسرے لمحے جیسے پہچان کے لمحے اس کی آنکھوں میں آکر ٹھہر گئے۔ وہ گھبرا کر اٹھنے لگی۔

”ارے لیٹی رہو آرام سے۔ ڈاکٹر نے تمہیں آرام کرنے کو کہا ہے۔“ وہ جلدی سے آگے بڑھ کر بولا۔ وہ ان سنی کر کے اٹھ بیٹھی۔ اپنے ہاتھوں سے بکھرے بالوں کو سنوارنے لگی۔

”میں کہاں ہوں؟“ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ ”انیکسی میں۔“ وہ جیسے خود ہی حیران ہو گئی۔

”میں یہاں کیسے آئی؟“

”اڑ کر۔“ وہ اس کے پاس کرسی پر بیٹھتے ہوئے آرام سے بولا۔

”کیا مطلب؟“ بہنور اسی آنکھیں الجھ کر بولیں۔

”تمہیں نہیں پتا۔ تم یہاں کیسے آئیں؟“ وہ اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”کیسے؟“ وہ مدھم لہجے میں جیسے خود سے بولی اور کچھ سوچنے لگی۔ اسے گزشتہ رات کا منظر یاد آنے لگا جب می تصویر سے نکل کر اس کا تعاقب کرنے لگی تھیں۔

”اوہو!“ اس کے منہ سے اس منظر کا خیال ہی سے سسکی سی نکل گئی۔

”میں ڈر گئی تھی۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”اتنی بڑی ہو کر بھی ڈرتی ہو تم؟“ پتا نہیں کیسے وہ خود بخود ”تم“ پر آگیا تھا۔

”کیوں کیا بڑے ہو کر نہیں ڈرتے۔“ وہ ناگواری سے بولی۔

”تمہارا خیال ہے تم بڑی ہو چکی ہو۔“ وہ اس کے مہین سے سراپے کو نظروں میں تولتے ہوئے بولا۔

”مجھے یہاں کون لایا تھا؟“ وہ اس کا سوال اور نظرس نظر انداز کر کے بولی۔

”یاد کرو ہوش کا آخری منظر۔“ وہ جیسے سوچ میں پڑ گئی۔ وہ کن آنکھوں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔

”اوہ! میں بے ہوش ہو گئی تھی آپ۔“ اس نے زبان دانتوں تلے دبائی ”میں رات سے یہاں ہوں۔“ اس کی

نہان لکھڑائی

”ظاہر ہے۔“ وہ اس کی حالت کا مزہ لے رہا تھا۔

”رینلی! اس نے آنکھیں پھیلائیں۔“ اور آپ؟“

”میں بھی۔“ وہ مسکراتے ہوئے ڈھٹائی سے بولا۔

”وہاں! وہ حیرت سے چلائی ”نہیں“ وہ بستر سے اترنے لگی۔

”کیا ہوا ہے کہاں جا رہی ہو۔“ وہ اس کا ارادہ بھانپ کر بولا۔

”نہیں نہیں۔“ وہ کھل ہٹا کر ٹانگیں بچھے اترتے ہوئے بولی۔

”بھئی۔ میں تو اندر سویا تھا کوٹھی میں اور تمہارے پاس یہاں بتول سوئی تھی وہ اب تمہارا ناشتہ لینے گئی ہے۔ میں تو ابھی آیا ہوں۔“ وہ جلدی سے بولا مبادا وہ اٹھ کر نہ چل پڑے۔

”آپ صحیح کہہ رہے ہیں؟“ وہ مشکوک لہجے میں بولی۔

”میں جھوٹ کیوں بولوں گا۔ تم ابھی بتول آتی ہے۔ اس سے پوچھ لینا۔“

”عاکف بچا کو پتا نہیں چلا۔“ وہ پست لہجے میں بولی۔

”وہ رات کو شاید لیٹ آئے تھے اور صبح جلدی چلے گئے۔ ویسے کیا واقعی وہ تمہارے سکے انکل ہیں؟“

”کیوں آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔“ وہ ابرو اچکا کر بولی۔

”لگتے تو نہیں۔ اچھے خاصے غیر غیر سے لگتے ہیں۔ اس دن ڈنر پر انہوں نے تمہیں کھانے کے لیے بلایا ہی نہیں۔“ وہ اسے جتا کر بولا۔

”یہ ایسے ہی ہیں۔ کبھی مہمان کبھی اجنبی۔ وہ کیا ہیں شاید انہیں خود بھی پتا نہیں۔“ وہ شاید اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔

”ڈیری ٹاکس۔ شاعرانہ لب و لہجہ۔ کون سی کلاس میں پڑھتی ہو؟“

”کسی میں بھی نہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”میسٹرک کارائیوٹ امتحان پاس کیا ہے اور بس تعلیمی بیک گراؤنڈ تو یہی ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔“

”رینلی اس زمانے میں اور ایڈوانس فیملی کی ممبر ہو کر تمہاری اکیڈمک پرفارمنس اتنی بوگس ہے۔“ وہ حیرت سے بولا۔

”کسی بھی فرد کی قسمت اس کو کچھ بھی بنانے میں زیادہ اہمیت رکھتی ہے نہ کہ ماحول اور فیملی۔“

”یہ کیا دقیانوسی باتیں کر رہی ہو۔ اکیسویں صدی میں قسمت فرد ہے وہ خود ہی اپنی قسمت بناتا ہے بڑوں اور ناکارہ لوگ یہ قسمت اور نصیب جیسے ایشو کو لے کر بیٹھتے رہتے ہیں۔“

”آپ کہہ سکتے ہیں ایسی بات۔ جس تن لاگے وہ تن جائے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں۔ جس تن لاگے وہ تن جائے۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا اس کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا کہ وہ اندر تک پھل گئی۔ گھبرا کر جانے کو مڑی۔

”نفسہ!“ اس نے دھیمی آواز میں اسے پکارا وہ کوشش کے باوجود کچھ نہ بول سکی۔

”میں اب چلتی ہوں۔“ وہ بوتلے خاموش لمحوں سے گھبرا کر جیسے خود سے بولی۔

”نفسہ! مجھ سے دوستی کر دو۔ رہبرزدانی سے۔“ وہ ایک دم سے اس کے سامنے آکر اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا

ساتھ دیتے اور تائی جی جو پہلے ہکا بکا ان کی شکل دیکھ رہی تھیں۔ ان کے جاتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔
 ”ای! آپ کیوں روتی ہیں؟ میں نے سمجھایا تھا نا آپ کو کہ کیا کرنے جا رہی ہیں۔ مگر آپ تو کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہ رہی تھیں، اب رونے دھونے سے کیا فائدہ؟“ ولید بتا نہیں کب ان کے پاس آ بیٹھا تھا۔ افسردگی سے کہنے لگا۔

”نیکھا آپ نے بھائی کو۔ کیا حال ہو گیا ہے ان کا۔ ای! آپ نے ان کے ساتھ اچھا نہیں کیا، بالکل بھی اچھا نہیں کیا۔ کوئی ماں اپنی اولاد کو بھی بیچا کرتی ہے۔“

”ہاں ہاں، تم بھی پتھر اٹھا کر میرے سر پر مارو۔ جاؤ باہر جا کر دو چار کو اور بلا لاؤ۔ سارے مجھے پتھر مارو، میں ظالم ہوں، قاتل ہوں، اپنے بیٹے کی تمہاری تم سب کی۔ مجھے سارے مارو۔ مجھے مورد الزام ٹھہراؤ کیا برا سوچا تھا میں نے اس کا۔ اس کی بہتری چاہی تھی، خوبصورت حسین لکھتی بیوی لا کر دی اسے۔ یہ تو — نہیں کہا تھا کہ اس کا زر خرید بن جانا، آنکھیں بند کر کے اس کے اشاروں پر ناچنا، ارے اسے خود چسکا پڑ گیا ہے یہ عالیشان زندگی گزارنے کا۔“

اب وہ ہمیں اپنی اس شاندار زندگی سے نکال دینا چاہتا ہے، میں نہیں مانتی اس کی باتوں کو، وہ اب ہم سے الگ ہونا چاہتا ہے۔ یہ سب ڈرامہ کر رہا ہے وہ یہاں سے جانے کا۔ ارے کون سا شوہر ہے دنیا کا، جو خود پر بیوی کو اس درجہ حاوی ہونے دے گا، شوہر چھوٹ نہ دے تو بیوی کی کیا مجال کہ دم بھی مار سکے۔ انتہائی تنگ ہے اس آسائشوں بھری زندگی سے تو لات مار دے ان کو۔ پھر دیکھتی ہوں کون باندھتا ہے اسے اس کا خود دل نہیں چاہتا سب کچھ چھوڑنے کو۔ جاو کر دیا ہے اس حسین چیل نے اس پر۔ اب وہ ویسے ہی ہم سے دامن چھڑانا چاہتا ہے، ہمارے

ڈھونڈ رہا ہے اس کی بہتری چاہنے والی اسے یہ حسین زندگی دینے والی اب اس کی دشمن ہو گئی۔ دیکھا تم نے، یہ ہوتا ہے اولاد کی محبت میں خوار ہونے والے ماں باپ کا انجام۔“ وہ حسب عادت ہابا کار بچا کر اپنی بات کا پلڑا اونچا کر رہی تھیں۔

”وہ دامن چھڑالیں ان سے، لات مار آئیں اس سلطنت کو آپ نے امی! پندرہ لاکھ کا جو حق مر لکھ دیا تھا کون ادا کرے گا وہ۔ یہ گھر ہے پندرہ لاکھ کا۔ سارا کیا دھرا آپ کا ہے، ہاتھ پاؤں کاٹ دیے ہیں آپ نے ان کے۔ اب کیوں روتی ہیں، آپ جیسے نانا قبت اندیش والدین پہلے اولاد کی تباہی کا سامان کرتے ہیں پھر سارا الزام اولاد کے سر ہی لگاتے ہیں کہ اس نے آنکھیں پھیر لی ہیں۔ اب وہ جیسی زندگی گزار رہے ہیں، گزارنے دیں انہیں۔ مت ان کا پیچھا کریں، اس سے سوائے اپنا خون جلانے کے اور کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ یہ مان لیں کہ آپ سب کچھ کھو چکی ہیں اپنے ہاتھوں سے۔“ وہ تیز تیز بولتا ان پر افسوس بھری نظر ڈال کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اور تائی جی واقعی اپنی دونوں ہتھیلیاں کھول کر انہیں غور سے دیکھنے لگیں، جیسے ہاتھوں کی لکیروں میں اپنے نقصان کا ازالہ ڈھونڈ رہی ہوں۔

”ہیلو!“ وہ ہونٹوں سے آنٹی کی نظر بچا کر چپکے دروازے سے دے پاؤں باہر نکل رہی تھی، رہبر زوانی کی اچانک ”ہیلو“ پر اچھل بی پڑی۔ اپنے زور زور سے جھکے دل پر ہاتھ رکھ کر اس نے خائف نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
 ”یہ تم جو رول کی طرح دے پاؤں کہاں فرار ہو رہی تھیں؟“ وہ دلچسپی سے اس کے چہرے کا اڑاڑا سا رنگ دیکھ کر بولا۔

”یہ کوئی طریقہ ہوتا ہے کسی کو بلانے کا۔ اگر میرا پارٹ فیل ہو جاتا تو۔“ وہ خفگی سے کہہ کر آگے بڑھی۔
 ”محترمہ! اگر صرف ہیلو کہنے سے کسی کا پارٹ فیل ہو سکتا ہے تو دن میں لاکھوں کروڑوں ٹیلی فون اٹینڈ کرنے والے لوگوں کو مرجانا چاہیے۔“ وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔

”آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے، میں فون اٹینڈ نہیں کر رہی تھی، اپنے دھیان میں جا رہی تھی۔“ وہ چڑ کر بولی۔

”اپنے دھیان میں یا کسی اور کے دھیان میں۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا، ”کیونکہ اپنے دھیان میں انسان اس قدر گم ہو کر نہیں چل سکتا۔“

”گم ہونے کے لیے کسی کے دھیان کی ضرورت نہیں، انسان چلتے چلتے اپنے اندر بھی گم ہو سکتا ہے۔“
 ”اچھی بات کی تم نے گڈ ویسے تم اتنے دنوں سے ہو کہاں؟“ وہ بڑی بے تکلفی سے بولا۔

”یہیں بھی میں کہاں جا سکتی ہوں۔“ وہ دونوں آگے پیچھے لان میں داخل ہوئے۔ ”یہاں کہاں مجھے تو نظر نہیں آتیں حالانکہ میں رات کو روزانہ ڈرائیو ڈاکٹنگ ہال ہی میں کرتا رہا ہوں۔ تم تو وہاں نہیں ہوتی تھیں۔“ اس کی خواہ مخواہ کی جرح اسے چڑا گئی۔

”کیوں آپ کو کوئی کام تھا مجھ سے؟“ وہ ابرو اچکا کر بولی۔

”کیوں اگر صرف کام ہو تو کوئی کسی کو ڈھونڈتا ہے۔“ اس نے انسا سوال جزا۔

”اس کے علاوہ میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں بننا کیونکہ ادھر میری یاد کسی کو اسی وقت آتی ہے جب کسی کو کوئی کام ہوتا ہے۔“ وہ سبز گھاس پر نظریں جما کر چل رہی تھی۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں، دنیا تمہارے زور بازو پر نہیں چل رہی۔“

”یہ میں نے کب کہا۔“ وہ ایک دم سے اداس ہو کر بولی۔

”اچھا چھوڑو۔ فضا تم ادھر کب سے ہو، میرا مطلب ہے اپنے انکل کے پاس۔“

”بچپن سے۔“ وہ اسی اداس ٹون میں بولی۔

”تمہارے والدین۔“ وہ کچھ جھجک کر بولا۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔

لان کے اس حصے میں کوئی پیر کوئی درخت نہیں تھا۔ جہاں سے سرونٹ کو انرز کی حد شروع ہوتی تھی۔ اسے الگ کرنے کے لیے سفیدے کے درختوں کی ایک قطاری بھی اور ان سے ذرا آگے ایک ہی نیم کا درخت تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس درخت کے پاس جا کر کھڑی ہوئی، وہ اسی طرح اس کے پیچھے آ رہا تھا۔

”تمہارے پیر تیس فٹ؟“ اس نے اپنا سوال دہرایا۔

”جب وہ دونوں روڈ الیکسیمنٹ میں فوت ہوئے تو عاکف پیچھا مجھے یہاں لے آئے تھے۔“ وہ درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

”تمہارا اور کوئی بہن بھائی نہیں۔“ اس کے اس سوال پر ترتب کر اسے دیکھا۔

”ہم تین بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔“ اس کی آنکھیں بھیکنے لگیں، حالانکہ اب تو اس نے ان تینوں کو دانستہ یاد کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

”اچھا واقعی، وہ کہاں ہیں؟“ وہ دلچسپی سے بولا۔

”کیا کریں گے بوجھ کر۔“ وہ لاہروالی سے درخت کے تنے کو ناخن سے کھرچنے لگی۔

”چلو نہ بتاؤ،“ او کہیں گھومنے چلتے ہیں۔“ وہ ایک دم سے موضوع بدل گیا اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”کیا مطلب؟“

”میں نے کوئی مشکل جملہ بولا ہے۔ میں نے کہا ہے، ”اؤ کہیں گھومنے چلتے ہیں۔ دیکھو نا موسم کتنا اچھا ہو رہا ہے“
 بادل گھر گھر کر آرہے ہیں۔“ اس نے آسمان پر تیرتے بادلوں کو دیکھ کر کہا۔
 ”نہیں مجھے نہیں جانا۔“ وہ سر ہلا کر بولی۔

”کیوں بھی اس میں کیا برائی ہے“ انکل تو گھر پر نہیں ہیں، اگر ہوتے بھی تو میں ان سے پوچھ لیتا۔ اس میں کیا ہے چلو تم۔“

”میں کہیں نہیں جاتی نا۔ میں نہیں جاؤں گی۔“
 ”یہ عجیب منطق ہے جو کام پہلے نہیں کیا، کیا وہ کبھی بھی نہیں کرنا۔ چلو تم گاڑی کی چابی ہے میرے پاس۔ میں باہر ہی جا رہا تھا۔“ اس نے پیٹ کی جیب میں چابی ٹٹولی وہ سوچ میں پڑ گئی۔
 ”چلو نا۔“ وہ اصرار سے بولا۔

”میں نہیں جاؤں گی پلینز۔ آپ چلے جائیں۔“ وہ درخت سے ذرا ہٹ کر بولی۔
 ”میرا اکیلے جانے کا موڈ نہیں تم آؤ نا۔ اب کیا اٹھا کر لے جاؤں تمہیں۔ اؤ بھی۔“ اس نے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تو وہ اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ وہ تو کبھی بھی باہر نہیں گئی تھی، شاید تین یا چار دفعہ بہت سال پہلے نرس آئی اسے لے کر گئی تھیں۔ بازار میں شاپنگ بیگزا اٹھانے کے لیے ان کی ملازمہ اس دن چھٹی پر تھی۔
 ”اوہو آ بھی جاؤ اب اور کتنی منتیں کرواؤ گی۔“ وہ زچ آ کر بولا۔

”ہاں تو اس میں حرج کیا ہے، جب کسی کو میری پروا نہیں تو میں کیوں پروا کروں۔“ اس کے دل نے راہ دکھائی
 اس نے ایک نظر اپنے براؤن شکنوں بھرے کاشن کے سوٹ پر ڈالی۔
 ”کپڑے ٹھیک ہیں تمہارے، آج کل کاشن پر شکنوں کا فیشن ہے ڈونٹ وری۔ چلو اب۔“ وہ اس کی نظروں کا مفہوم بڑھ کر بولا۔

”چلیں۔“ وہ ذرا اعتماد سے قدم آگے بڑھا کر بولی۔
 ”تم نے تو لاہور کی سیر کی ہوئی ہو گی، اتنے برسوں سے یہاں ہو۔“ گاڑی سڑک پر لا کر اس نے پہلی بات اس سے کی وہ چپ رہی۔

”کیا کیا دیکھا ہوا ہے۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ وہ پھر چپ رہی۔
 ”فور ٹریس چلتے ہیں ویسے بھی میں کئی سالوں بعد لاہور آیا ہوں۔ خیر رستے تو مجھے سارے ازبر ہیں، بچپن لڑکپن ادھر گزرا ہے۔ تمہیں بھوک تو نہیں لگی۔“ اس نے اچانک پوچھا۔
 ”نہیں۔“

”اچھا میں سمجھا تم بھوک کی وجہ سے چپ ہو۔ یا ر کوئی بات کرو نا اس طرح گم صم بیٹھی ہو جیسے میں تمہیں زبردستی لایا ہوں۔“ وہ جھنجھلا کر بولا۔
 ”یہ آپ کو مجھے لانے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا، میں بہت نہیں بولتی ہوں۔“ وہ کہہ کر دلچسپی سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ لاہور کی کشادہ سڑکوں پر رواں دواں ٹریفک کا اثر دھام اس کی توجہ اپنی طرف کھینچنے لگا۔
 ”شکر ہے تم بہت نہیں بولتیں ورنہ مجھے مشکل ہو جاتی۔“

”یہاں کی مجھے ”کون“ بہت پسند ہے۔“ فور ٹریس پہنچ کر پارکنگ میں گاڑی پارک کرتے ہوئے اس نے کہا۔
 ”کون ہاتھوں میں لیے وہ دونوں یونہی گھومنے لگے، اسے اتنا عجیب لگ رہا تھا جیسے مدتوں بعد کسی پرندے نے آسمان دیکھا ہو۔
 ”جلدی کھاؤ بھی کون کھل رہی ہے۔“ وہ ایسے کھوئے دیکھ کر بولا۔

”یہاں بوتھکس میں بڑی ورائٹی ہوتی ہے لیکن میٹرل اتنا اچھا نہیں ہوتا۔“ ونڈی میں خوبصورت ڈریسز زیب تن کیے اسٹیجوز کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا، ”وہ جیب رہی اسے تو سارا کچھ ہی بے حد قیمتی اور انوکھا لگ رہا تھا۔“

”لوہو چلو کوئی بات نہیں یہ لو اس سے صاف کرلو۔“ اس نے پیٹ کی جیب سے ٹشو نکال کر اسے دیا۔
”نفسہ! تمہاری برتھ ڈے کب ہوتی ہے۔“ وہ اپنے دھیان میں قیص صاف کر رہی تھی جب اس نے پوچھا۔
”میں اکتوبر کو۔“ اس نے ایک لمحے کو ہاتھ روک کر جواب دیا۔

”میں اکتوبر تو برسوں ہے۔“
”ہاں۔“ وہ آگے چل پڑی۔

”پلو PACE چلتے ہیں میں ابھی تک وہاں نہیں گیا۔“ وہ ایک دم سے آگے بڑھ کر بولا وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی، ”وہ خود ہی جلدی جلدی پروگرام بنالیتا تھا۔“

”اوہو چلو نا۔ ابھی جاو یا ر! تم بہت سست ہو۔“ وہ اس سے یوں بے تکلف تھا جیسے صدیوں کی جان پہچان ہو۔
PACE نے جیسے اس کی آنکھیں کھول دیں وہ حیرت سے ایک ایک چیز کو رک رک کر دیکھ رہی تھی۔
”مجھے ڈریسز کا جنون ہے“ اچھے اور قیمتی ڈریسز۔ آؤ وہاں وارڈ روب کی طرف چلتے ہیں۔“ وہ سیکنڈ فلوئر پر پہنچ کر بولا۔

”اتنے خوبصورت اور قیمتی ملبوسات جن کی قیمتیں ہی چار چار پانچ پانچ ہزار سے اسٹارٹ ہوتی تھیں۔ ایک ایک لباس اس کی توجہ کھینچ رہا تھا۔“

”نفسہ! یہ دیکھو یہ کیسا ہے؟“ دور کھڑے رہہرے اسے آواز دی۔

بائل گرین پرسنل بوتھوں کا کام تھا، سلک ٹائپ کا کپڑا تھا، انتہائی نازک اور مہین۔ اس پر اتنا ہی نازک اور فینسی کام اس نے یونہی ٹیک سمجھا کر پڑھا پانچ ہزار قیمت تھی اس کی۔
”کیسا ہے؟“ وہ تو صیغی نظروں سے سوٹ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”اچھا ہے۔“

”صرف اچھا ہے۔“ وہ مایوسی سے بولا۔

”نہیں بہت اچھا ہے اور قیمتی بھی“ وہ سوٹ کو نظروں میں تولتے ہوئے بولی۔
”اس کا خوبصورت ہونا ہی اس کی قیمت ہے، چلو چلتے ہیں۔ مجھے تو بھوک لگ رہی ہے، ریستورانٹ سے کچھ کھاتے ہیں۔“ وہ بے تکلفی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھتے ہوئے بولا اور وہ جھجک کر رک گئی۔

”چلو نا، جی ہاں، تو پکڑا ہے تو کیا ہوا ہم دونوں دوست بھی تو ہیں نا۔“

وہ اس کے رکنے کی وجہ سمجھ کر فوراً بولا، ”وہ زبردستی ہاتھ چھڑانے لگی۔“

”تم ایسے نہیں چلو گی۔ یہ لو۔“ اس نے ہاتھ چھوڑ دیا۔

”اب چلو مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ وہ اس کے ساتھ چل پڑی۔

”یہ عبیرہ کہاں سے اس وقت آگئی۔ اس کا تو نام چار یا پانچ بجے کا ہے۔“ انکل جمال کا لہجہ خفگی لیے ہوئے تھا۔

”کل وہ کپیوٹر کالج نہیں لگی تھی میں نے ہی اسے منع کیا تھا کہ کالج سے سیدھی گھر آجائے۔ مہمانوں کو آنا

ہے تانیہ کو دیکھئے۔“ غزالہ آنٹی کا لہجہ شرمندہ شرمندہ سا تھا۔

”یہ مہمان تانیہ کو دیکھنے آرہے تھے یا اسے جو تم نے اسے اتنے اہتمام سے گھر بلا لیا۔ غزالہ! تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے۔“ انکل جمال کا بدلا ہوا لہجہ عبیرہ کو بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

”یہ تانیہ جو نہیں مانتی تھی، صحیح طریقے سے مہمانوں کو اینڈ کرنے کے لیے منہ پھلائے اندر باہر پھر رہی تھی۔ جو تین چار اوٹ پٹانگ پروپوز آئے تھے ان کی وجہ سے۔ میں نے کہا وہ عبیرہ کی بات مانتی ہے وہ ذرا جلدی گھر آکر اسے ڈھنگ سے تیار کر دے گی۔ میں نے تو بھلا ہی چاہا تھا اب مجھے کیا پتا تھا۔“ ان کا شرمندہ لہجہ ہنوز برقرار تھا۔

”تمہیں ان سے کہنا تھا کہ عبیرہ سے بڑی ابھی دو بیٹھی ہیں ان کے ہوتے ہوئے ہم چھوٹی کو کیسے بیاہ سکتے ہیں۔“ انکل جمال ناگواری سے بولے۔

”میں نے یہی کہا تھا کہ عبیرہ تو ابھی بڑھ رہی ہے اتنی جلدی اس کا کرنا ہمارے لیے تو ممکن نہیں اور نہ ہی بڑی بہنوں کی موجودگی میں یہ اچھا لگتا ہے، ہر کام وقت پر اچھا لگتا ہے۔“

”کہنے لگیں، چلیں ہم کچھ انتظار کر لیں گے سال ڈیڑھ سال۔ عبیرہ کا گریجویشن مکمل ہو جائے گا اور اس دوران آپ اپنی دونوں بیٹیوں کا کہیں کر لیں اللہ ان کا سبب لگا دے گا“ آپ ابھی بی الحال منگنی کر دیں۔“

”منگنی کر دیں۔“ انکل جمال بڑبڑائے۔ ”اتنی اوپر کی کمائی آ رہی ہے نا ہماری، یا ہم نے بینک کالے کے ہوئے حرام کے پیسوں سے جو منگنیاں کرتے پھریں۔ یہاں فرائض کے لالے پڑے ہوئے ہیں، انہیں منگنیوں کی سوجھ رہی ہے۔ کہنا تھا بی بی ہم اتنے رئیس لوگ نہیں ہیں۔“ انکل جمال پر یہ انداز، یہ لہجہ بالکل سوٹ نہیں کر رہا تھا،

انتار دھا لکھا، عبیدہ محفل مند استاد اور اتنا پست لہجہ۔ اس کا دل گھبرانے لگا۔
”دعیں نے بھی یہی کہا تھا یہ تو بعد میں رعبہ کو میں نے فون کیا تھا۔“

”ہاں رعبہ کیا کہتی ہے؟“ وہ جلدی سے ان کی بات کاٹ کر بولے۔
”وہی تو بتا رہی ہوں، وہ بھی اسی بات پر خفا ہو رہی تھی کہ آپ نے عبیرہ کو تانیہ کے ساتھ کیوں بھیجا، اب کوئی آنکھ کا اندھا بھی ہو گا تو بھی عبیرہ کے ہوتے ہوئے تانیہ کو بھلا کیسے پسند کرے گا۔ میں نے اسے بھی یہی بتایا کہ

تانیہ کی وجہ سے مجھے ایسا کرنا پڑا تھا۔ وہ کہنے لگی کہ اب مسز حق کسی اور بات پر نہیں مان رہیں وہ عبیرہ کے لیے مصروف ہیں، منگنی کرنا چاہتی ہیں ان کا ایک ہی بیٹا ہے۔ رعبہ کہتی ہے میں نے ان سے بات کی تھی کہ آنٹی ہم یہ انگیجمنٹ وغیرہ فورڈ نہیں کر سکتے، ہمارے والدین کو ابھی چار بیٹیوں کو اور بھی دیکھنا ہے تو وہ کہنے لگیں کہ آپ لوگ کچھ نہ کریں، میں صرف اپنی فیملی کے چند قریبی لوگوں کو لاؤں گی صرف چائے بر اور لڑکی کو حسب توفیق انگوٹھی وغیرہ پنا جاؤں گی میری بس اتنی خواہش ہے اور میں تو اپنے بیٹے کا اب عبیرہ کے سوا اور کہیں سوچ بھی نہیں سکتی۔“

”انہوں نے تو چائے کا کہہ کر فارغ کر دیا، ہم اتنے بے حیا ہیں کہ خالی گرم پانی پر مہمانوں کی تواضع کریں گے۔ کم از کم دس پندرہ ادھر سے ہوئے تو کیا ادھر سے اتنے نہیں ہوں گے۔ اس کے چچا تایا پیچھے رہیں گے کیا تو ان سب کی خاطر تواضع پر کم از کم چار پانچ ہزار اٹھ جائیں گے۔ وہ لڑکی کو دے دلا کر جائیں تو ہم لڑکے کو ایک انگوٹھی بھی نہ ڈالیں۔ اس کے پچھلے ہمیں معاف کر دیں گے بھلا۔ طرح طرح کی باتیں نہ بنائیں گے کہ ہم اتنا بھی نہ کر کے اپنی بیٹی ہوتی تو پھر دیکھتے۔ غزالہ بیگم! یہ تو کانٹوں بھرا رستہ ہے عبیرہ کا معاملہ پھونک پھونک کر قدم ر نہیں گے تو بھی لوگ باتیں بنانے سے باز نہیں آئیں گے، بہتر ہے ان فضول رسموں میں پڑیں ہی نا۔ تم صاف ان سے

کہہ دو ہمیں ابھی عبیدہ کا کرنا ہی نہیں چار پانچ سال تک۔ اگر وہ اتنا انتظار کر سکتے ہیں تو کر لیں ورنہ ہمیں کوئی شوق نہیں ہے ان سے رشتہ داری جوڑنے کا۔" ان کا لہجہ مزید تلخ ہو گیا، آج کل تو وہ ویسے بھی چیزے ہو رہے تھے۔

"اب یوں منہ کھول کر بھی جواب نہیں دے سکتی، ربیعہ بھی کہتی ہے امی! بہت اچھا رشتہ ہے اسے یوں نہ گنوا کیں۔" غزالہ آنٹی ذرا پست لہجے میں بولیں۔

"تو کر دو تم اور ربیعہ مل کر میرے توانے بچے نہیں ہے کہ میں یہ چونچلے اٹھاتا پھروں۔ جب تک تانیہ اور ثویہ کا کہیں نہیں ہو جاتا میں عبیدہ کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا اب آگے تمہاری مرضی۔ پہلے مجھ پر ان دونوں کا حق ہے اس کے بعد عبیدہ کا، جہاں تک اس کی بہتر پرورش کا سوال تھا وہ ہم نے کی ہے اعلیٰ تعلیم بھی دلوا دیتے ہیں نے اپنی چادر اپنی اوقات سے بڑھ کر اس کے لیے کیا ہے اب میں اس کی خاطر اپنی بچیوں کے اربانوں کے گلے تو نہیں گھونٹ سکتا۔ تم خود سوچو۔ عبیدہ کی معافی ہو گئی تو تانیہ مزید احساس کمتری کا شکار ہو جائے گی۔ اسے ایم اے کے تیسرا سال ہے کچھ سال اور گزرے وہ اور رائج ہو جائے گی پھر کہاں اس کے لیے رشتے ڈھونڈتے پھریں گے اس سال ثویہ کا کریکیشن بھی مکمل ہو جائے گا مجھے ان دونوں کی پہلے فکر ہے اور یہ حق بات بھی ہے۔

عبیدہ کا ہم نہ بھی کر سکے تو اس کے کرنے والے بہترے ہیں کروڑ بیتی چچا ہے اس کا۔ اب جو تانیا نے ابرار کی شادی کر کے لاکھوں کا ایم کھیلا ہے وہ آج چاہے تو عبیدہ جیسی دس لڑکیوں کو آسانی سے بیاہ سکتا ہے اور وہ ان کی باہر والی پھوپھی کو کس چیز کی کمی ہے سونے کی کان پر بیٹھی ہے۔ عبیدہ کو بیٹا نا ان لوگوں کے لیے کیا دشوار ہو گا۔ عبیدہ کے تو بہت ہیں کرنے والے کل کو بھائی بھی جوان ہو جائے گا کمانے لگے گا۔ میری بچیوں کا کون ہے کرنے والا ایک صرف میں آج خدا نخواستہ میری آنکھیں بند ہو جائیں ان کے سروں پر چادر دینے والا کون ہے کون سا ماما چاچا بیٹھا ہے ان کو سہارا دینے والا۔ کون سا ان کا کوئی بھائی ہے جو سرپرستی کرے گا ان کی۔ ان کا تو خدا کے بعد میں ہی آسرا ہوں نا۔ عبیدہ کے بڑے وارث ہیں تم اس کی فکر نہ کرو۔ اس کا خود ہی وقت آنے پر ہو جائے گا۔ اس وقت سوال تانیہ کا ہے کہ وہ ان حالات کی وجہ سے دن بدن چڑچڑی ہو رہی ہے۔ اوپر سے نوکری کوئی ڈھنگ کی نہیں مل رہی۔ مٹی بھی تو وہی اسکول بچہ ہی اس میں کیا رکھا ہے ساری عمریں گنوا کر بھی ہم اس قابل نہیں ہیں کہ اپنی اولاد کو آسودگی کے چند دن ہی دے سکیں گھٹ گھٹ کر ہم نے زندگی گزار دی اور سسک سسک کر وہ گزار دیں یہ کہاں دکھا ہے؟ آج وہ نوکری کر لے لوگ فوراً نوکری پیشہ لڑکیوں کو بڑی عمر میں شمار کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہم ساری فکریں چھوڑ دو تانیہ کا سوچو۔ عبیدہ تو ماشاء اللہ خوش شکل ہے اور ابھی پڑھ رہی ہے کمپیوٹر کورس کر لے گی بی ایس سی کرے گی تو بڑی اچھی جاب مل جائے گی اسے۔ اصل فکر تو مجھے اپنی بیٹیوں کی ہے نہ شکل و صورت میں خود صوبے کے چاند اور نہ تعلیم بہت اعلیٰ اور قابل عرفیت سیرت کو کون پوچھتا ہے آج کل اور باپ کا کون سا ایسا سٹینڈ ہے کہ اس کی وجہ سے رشتوں کی لائیں لگ جائیں۔" انکل جمال کا سانس پھولنے لگا۔

"صحیح کہہ رہے ہیں آپ۔ وہ میری کو لیک ہے سہمی اس نے ایک رشتہ بتایا ہے کل شام کو وہ لوگ آئیں گے۔ ان کا اگر بکریٹ ہے ٹاپ کا موٹر گاڑی ہوگی کا شور مچا رہے ہوں گا۔ ابھی کام بھی کرتا ہے اور کسی دفتر میں جاب بھی کرتا ہے۔ اچھے کھاتے پیتے لوگ ہیں زیادہ بڑی چوڑی فیملی بھی نہیں ہے۔ دو بہنیں شادی شدہ ہیں ایک بہن اور ایک بھائی

ہے اس سے چھوٹا۔ اللہ کرے انہیں تانیہ سے مل جائے۔" انکل جمال نے ایک رشتہ بتایا ہے کل شام کو وہ لوگ آئیں گے۔ ان کا اگر بکریٹ ہے ٹاپ کا موٹر گاڑی ہوگی کا شور مچا رہے ہوں گا۔ ابھی کام بھی کرتا ہے اور کسی دفتر میں جاب بھی کرتا ہے۔ اچھے کھاتے پیتے لوگ ہیں زیادہ بڑی چوڑی فیملی بھی نہیں ہے۔ دو بہنیں شادی شدہ ہیں ایک بہن اور ایک بھائی

ہے اس سے چھوٹا۔ اللہ کرے انہیں تانیہ سے مل جائے۔" انکل جمال نے ایک رشتہ بتایا ہے کل شام کو وہ لوگ آئیں گے۔ ان کا اگر بکریٹ ہے ٹاپ کا موٹر گاڑی ہوگی کا شور مچا رہے ہوں گا۔ ابھی کام بھی کرتا ہے اور کسی دفتر میں جاب بھی کرتا ہے۔ اچھے کھاتے پیتے لوگ ہیں زیادہ بڑی چوڑی فیملی بھی نہیں ہے۔ دو بہنیں شادی شدہ ہیں ایک بہن اور ایک بھائی

"ہاں میں بھی یہی سوچ رہی ہوں یوں بیٹیوں کے سلسلے میں نکاحا جواب دینا اچھا نہیں ہوتا وقت کب سدا ایک سار رہتا ہے عبیدہ کا بھی خیال تو ہم ہی نے کرنا ہے۔" غزالہ آنٹی کو ابھی بھی عبیدہ کا خیال تھا۔

"ہاں اچھی بات ہے بس دعا کرو کل کام بن جائے اور کل تم عبیدہ کو نہ بھیج دنا تانیہ کے ساتھ۔ کل انہیں کس وقت آنا ہے؟"

"یہی چار پانچ بجے۔"

"ہاں ٹھیک ہے اب تم ذرا خیال رکھنا میں عبیدہ کا دشمن نہیں ہوں۔ لیکن سارے حالات تمہارے سامنے ہیں اور اپنی بیٹیوں کو ترجیح دینا بہر حال میری مجبوری ہے۔ تم جانتی ہو نا۔"

"ہاں مجھے پتا ہے اچھا میں دیکھوں بچیاں ابھی تک آئیں نہیں مندی سے۔" غزالہ آنٹی اٹھتے ہوئے بولیں تو وہ خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ آئی۔

کچلے میں کسی لڑکی کی مندی بھی انہوں نے بہت اصرار کیا تھا وہ سب تیار ہو کر گئی تھیں۔ عبیدہ کے سر میں شدید درد تھا وہ تھوڑی دیر بعد معذرت کر کے آگئی۔ درد اڑھ کھٹا ہوا تھا غزالہ آنٹی اور انکل جمال کی باتوں کی آواز باہر تک آرہی تھی اور پھر گھر کون سا بڑا تھا جو دو بندے اونچی آواز میں باتیں کریں اور تیسرے کو سنائی نہ دے سب کچھ سن کر اس کے سر کا درد اور بڑھ گیا۔

"عبیدہ! یہ میرے ٹیلر سے آتے وقت کپڑے لیتی آتا مجھے کل مسز شوکت کے گھر میلاد پر پن کر جانے ہیں۔" صبح غزالہ آنٹی نے اسے رسید پکڑاتے ہوئے کہا۔

"غزالہ آنٹی! ٹیلر کی شاپ تو میرے کالج سے خاصی دور پڑتی ہے۔ مجھے دو بلیس بدلنی پڑیں گی، آکر لے آؤں گی گڑیا کو ساتھ لے جاؤں گی۔" اس نے رسید پکڑ لی۔

"آکر تم اس قدر تھکی ہوئی ہوتی ہو پھر شام زیادہ ہو جائے گی۔ تم آج ہی لے آنا۔" انہوں نے رسید اس کے ہاتھ میں تھمائی۔

"آئی! مجھے شام ہو جائے گی راستے میں۔ آپ کوئی اور کپڑے پن جائیے گا۔ پرسوں میری کمپیوٹر کلاس آف ہے پرسوں لے آؤں گی۔"

"نہیں نا بیٹا! مجھے کل یہی پہننے ہیں اور سارے کپڑے تو میں بیسیوں بار اسکول پن کر جا چکی ہوں۔ تم لے آنا پلیز۔" وہ ذرا نرمی سے بولیں۔

"آپ کو اسکول نہیں جانا۔" وہ انہیں گھر کے پیلے میں پھرتے دیکھ کر بولی۔

"ہاں جاؤں گی ابھی ذرا ٹھہر کر۔" وہ نظریں چرا کر آگے بڑھ گئیں۔

تو ایک دم اسے رات کی بات یاد آئی کہ آج تو مہمانوں کو آنا ہے۔ اسی لیے آنٹی اسکول سے چھٹی کر رہی تھی اور اسی لیے اسے کپڑے لینے بھیج رہی ہیں ماما وہ شام گئے گھر لوٹے اس کے کچلے میں جیسے کچھ پھنسنے لگا وہ کالج بیک اٹھا کر باہر نکل گئی۔

"اپنی مامی کیوں مرجاتی ہیں اگر انہوں نے بچوں کی خوشیاں دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہنا ہوتا تو بچوں کو بھی مرجانا چاہیے۔ نہیں تو بعد میں وہ روز مرتے ہیں دن میں کئی بار۔ ماما آپ کے بغیر خوشیاں بھی شرمندگی بن گئی ہیں۔ ماما آپ کیوں مرجائیں۔" بس کا انتظار کرتے ہوئے وہ آنکھیں جھپک جھپک کر آنسو اندر اتارتی رہی۔

بھی بالکل خاموشی اختیار کر لو گھر تانیہ کا ہو گیا تو ہم مسرت کو تین چار سال کا کہہ کر ہاں کر دیں گے۔ اگر انہیں زیادہ لگن ہوئی تو ہاں جائیں گی۔

خوشبو کا کوئی گھر نہیں رخصانہ نگار

اس کے سوتے ہوئے چہرے پہ تھی ایسی مسکان
کوئی خواب آنکھ نے دیکھا ہو جیسے نیا نیا سا
خزاں تو یوں بھی گزر ہی جاتی تھی
موسم بہار بھی اب کے لگتا ہے جیسے نیا نیا سا

”جب بھی میں اپنے بچپن کی وہ بھیا تک شام یاد کرنا چاہتی ہوں خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔
ماں پاپا دونوں میں سے ایک ہی بچ جاتا تو ہم یوں درپردہ ہوتے وہ ہمیں اپنے پروں میں سمیٹ لیتے۔ اب گزشتہ دس
سالوں سے میں نے اپنے بہن بھائی کی شکلیں نہیں دیکھیں۔ ایک آبی اور عبیدہ آبی تو ایک دوسرے سے مل جاتی
ہیں اور میں۔۔۔؟“ اس نے پھر گہرا سانس لے کر اپنے ہاتھوں کو دیکھنا شروع کر دیا، ”تم نکلیں جھپک جھپک کر باہر
آنے کو بے تاب آنسوؤں کو اندر اتارنے لگی۔

رہبر دلچسپی سے اس کے خوبصورت نقوش سے مزین اداس چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھتا رہا۔ رہبر نے اسے
وہی گرین والا سوٹ گفٹ کیا تھا۔ اس کے حسین و جود پر جگمگاتے ہوئے سوٹ جیسے اپنی قیمت پوری کر گیا تھا وہ دونوں شام کو
ہی باہر آگئے تھے۔ ایبیسٹر میں اس نے نیبل ریزرو کرار رکھی تھی کب کا تھے ہی وہ بے حد اداس ہو گئی تھی۔
دھیرے دھیرے بولتے ہوئے وہ اتنے برسوں کا اندر دبا ہوا غبار بارہا نکالنے لگی۔
”وہی ہے تمہارے رشتہ داروں کو یوں نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تم لوگوں کو اس طرح ایک دوسرے سے دور دور۔“

وہ کچھ دیر بعد بولا تو وہ گیلی آنکھوں سے محض اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

”چھاپھوڑو! اللہ کے ہر کام میں کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ زخموں کو جتنا کرایہ دے دو اور دیر بھتا ہے اب میں ہوں
تمہارے ساتھ۔“ اس کے کبھے کا یقین اس کی آنکھوں سے ہویدا تھا۔ وہ ملائمت سے مسکرا رہا تھا فضا بھی سرہلا
کر دھیرے سے مسکرائی۔

”گڈ فضا! یہ گفٹ میری طرف سے تمہارے ہونے پر۔ تم اپنے ہونے پر ابھی افسوس ظاہر کر رہی تھیں اور
میں اپنی قسمت پر نازاں ہوں کہ تم ہو اور میرے لیے ہو پلینز۔“ کوٹ کی جیب سے بلیک منگلیس ڈسپے نکال کر رہبر
نے اس کی طرف بڑھائی اسے جیسے کسی بچھوٹے کاٹ لیا وہ تڑپ کر کرسی پر پیچھے ہٹ گئی۔
”اس میں کیا ہے۔ یہ میں نہیں لوں گی۔“ وہ انک انک کر بولی اس کا چہرہ تن سا گیا تھا۔

”اس میں کوئی سانپ یا بچھو نہیں ہے جو تم یوں کانپنے لگی ہو۔ یہ وہی ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔“ وہ دھم تو اڑا
بولا۔ ”ہاں فضا! میں تم سے دل سے محبت کرنے لگا ہوں“ آج سے نہیں اس لمحے سے جب میں نے تمہیں پہلی بار
ڑے ہاتھ میں لیے اپنے سامنے کھڑے دیکھا تھا۔

فضا! میں کوئی بہت رونا نہ تھا۔ شخص نہیں ہوں لیکن اس بل میرا دل کیونکہ کے نشانے سے گھائل ہو گیا تھا۔
میں نے خود کو کنٹرول کرنے کی اس خیال کو جھٹانے کی بہت کوشش کی مگر سچ یہی ہے کہ مجھے اس سچائی کو مان لینا
پڑا کہ تم نامعلوم کیسے کہیں خفیہ دوست سے میرے دل میں آن بسی ہو اب دوری بہت محال ہے فضا! آئی لوں۔
ریلی آئی ایکسپریس ریلی کوئی۔۔۔ بلیوئی۔“ وہ ایک لمحے کو چپ ہوا جیسے خود پر قابو پارہا تھا۔ ”میرے دونوں ہاتھ زہرے
ہیں میں ایک دو ہفتوں بعد واپس جاؤں گا تو اپنی مٹی پاپا کو ساتھ لاؤں گا۔ ویسے پاپا چند روز میں آنے والے ہیں وہ
میری پسند سے مل کر واقعی بہت خوش ہوں گے ان دونوں نے زندگی کے ہر معاملے میں ہمیشہ میری پسند کو ترجیح دی

ہے اور یہ معاملہ تو میری زندگی کا اہم ترین ایٹم ہے۔ ہر حال چند دنوں تک میں اپنے اس فیصلے کو سب کے سامنے
سیلیبرٹ کر دوں گا فی الحال اسے میرے دل کی خوشی سمجھ کر۔ ابھی قبول کر لیا میری محبت کا ٹوکھن سمجھ کر۔ وہ
یونہی ذرا سانس کر بولا وہ خاموشی سے اسے تکتے گئی۔
”پلینز۔“ اس نے ڈب سے اس کی طرف بڑھائی وہ بے حس بیٹھی رہی۔

”اچھا چلو میں خود ہی کھول کر پسناتا ہوں۔“ اس نے خود ہی ڈبیا کھول کر اس میں سے انگوٹھی نکالی ”دیکھو کیسی
ہے؟“ چھوٹے چھوٹے ہیروں سے مزین خوبصورت دل کی شکل کی نازک سی انگوٹھی اس کے تصور سے بڑھ کر
تھی۔

”پلینز۔“ اس نے انگوٹھی آگے بڑھا کر اس کی انگلی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔
”تمہیں کوئی اعتراض ہے تو کہو یا میری محبت پر شک ہے۔“ وہ اس کی مسلسل خاموشی پر بولا۔
”یہ ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ کافی دیر بعد دھم آواز میں بولی۔
”کیا ٹھیک نہیں ہے اس طرح یہ خفیہ انگیجمنٹ کرنا میں تمہیں بتا چکا ہوں نا یقین کرو یہ صرف چند دنوں

کی بات ہے اور انگیجمنٹ سے کیا ہوتا ہے جو تم ڈر رہی ہو۔ یہ بات تو صرف ہم دونوں کے درمیان ہے میرے
نزدیک۔ مقدس ترین قسم سے بھی زیادہ مضبوط ہے۔ تمہیں میرا یقین نہیں؟“

”مگنی کی اگر کوئی حیثیت نہیں تو پھر اس کی ضرورت کیا ہے میں نے آپ کی سب باتوں پر یقین کر لیا۔ اس
رنگ کے نہ ہونے پر بھی۔ جب آپ کے پیرس آئیں گے تب۔“ وہ جھجک کر چپ کر گئی۔

”تب بھی سب کچھ ہو گا لیکن یہ تو تحفہ ہے تمہاری سالگرہ کا۔ میں نے بہت محبت بہت محنت اور بہت شوق
سے خریدا ہے اگر تم اس کو قبول کر لو گی تو تمہیں نہیں معلوم مجھے کس قدر خوشی ہو گی۔“ لفظ نہیں بدلتے جذبے
بھی نہیں بدلتے بس محسوس کرنے کا انداز اپنا اپنا ہوتا ہے۔ وہ اسی طرح ہاتھ پر ہاتھ دھیرے بیٹھی رہی۔

”فضا! یہاں لاہور ہی میں میرا سارا بچپن گزرا ہے زسری سے لے کر کلاس سیونٹھ تک میری ایک کلاس فیلو
تھی پریمیاں۔ اگر میں نے تمہارا بچپن یا تم نے اس کا بچپن دیکھا ہوتا تو تم دونوں کے جڑواں ہونے میں کوئی شک نہ
رہتا۔“ جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تو یہ بات میرے دماغ میں بار بار چبھتی رہی کہ میں نے تمہیں پہلے کہاں
دیکھا ہے۔ دوسری ملاقات میں مجھے یاد آگیا کہ پریمیاں جسے میں پری کہا کرتا تھا وہ تمہارا ہی عکس تھی بالکل اسی
طرح معصوم اور حسین۔ ہم دونوں کا آٹھ سالوں کا ساتھ تھا ہم دونوں میں بے تحاشا دوستی تھی اور ہم اپنی دوستی
کے درمیان کسی تیسرے کا وجود برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ہم ہر بات ایک دوسرے سے شیئر کیا کرتے تھے وہ
تھے ہر چیز ہر شے سے بڑھ کر عزیز تھی اور میں اسے۔ میری دیوانگی کو دیکھ دیکھ کر وہ اکثر مجھے چھیڑا کرتی تھی۔
”رہبر! تمہیں بتا ہے نا پریمیاں اس زمین پر نہیں رہیں وہ تو دور پہاڑوں کے اس پار فری لینڈ میں رہتی ہیں تم

لکنا ایک دن میں بھی وہیں چلی جاؤں گی پھر تم کیا کرو گے۔“ تو میں اس کی بات پر بری طرح خفا ہو جایا کرتا تھا وہ
میں کبھی مجھے منٹوں میں منالیا کرتی تھی۔ لاٹا لڑکی ہونے کے باوجود ہم ایک دوسرے کے ہلیل مزے سے شیئر
یا کرتے تھے۔ وہ کرکٹ اتنی دلچسپی سے کھیلتی جتنی دلچسپی سے میں اس کی گزروں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔
پھر ایک دن واقعی وہ ہو گیا پری اپنے دس چلی گئی اور کتنی عجیب بات ہے کہ وہ شام بھی اس کی سالگرہ کی شام

نہ بازار سے اپنے پاپا کے ساتھ اپنے شو رینے گئی تھی کہ روز ایک سیڈنٹ میں۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”اور
نہ اسے کہا کرتا تھا کہ میں رہبر ہوں تمہیں واپسی کا صحیح راستہ دکھا کر واپس لے آؤں گا۔ کچھ بھی نہ کر سکا اس
ناہوت کی وحشت میرے سر سے کئی ماہ تک نہیں اتری میرا تعلیمی سال ضائع ہو گیا ہر چیز سے میرا دل اٹھ گیا۔
مگر کمرے سے میں اس کی ساری گزریاں اٹھا لیا تھا بستر پر لیٹا ان کو تکتا رہتا۔ پاپا امریکہ شفٹ ہو گئے۔ وہاں کی

تیز رفتار زندگی نے آہستہ آہستہ مجھے بھی جکڑ لیا اگرچہ میں اسے بھولا تو نہیں ہاں اس کی یاد کی شدت کو میں نے مصروف زندگی میں گم کر دیا اور جب تمہیں پہلی بار دیکھا تو بے ساختہ بچپن کی وہ پہلی وابستگی یاد آگئی۔ جیسے اسنے سالوں بعد وہ اتنا حسین روپ لے کر میرے سامنے مجسم ہو گئی ہو اور میں کوشش کے باوجود تمہیں پری کبھی نہیں کہہ سکا کہ کیس پھر تم مجھ سے کچھ نہ جاؤ اور چاہنے کے باوجود یہ بھی نہیں جتا سکا کہ دیکھا تمہارا بھی فٹیوری لینڈ میں میرے بغیر دل نہیں لگا اس لیے تم لوٹ آئی ہو۔

”فصہ! کہو مجھ سے کبھی دور نہیں جاؤ گی وعدہ کرو فطہ۔“ وہ ایک دم سے اس کے سامنے ہاتھ پھیلا کر بولا۔
”فصہ! وعدہ کرو ہمیشہ میرے ساتھ رہو گی میں ہمیشہ تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا وعدہ۔“ جذبات کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”وعدہ!“ اس نے اپنا منہ سنا ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھ میں دے دیا اس نے ہولے سے منہ بند کر لی۔
”میں بھی وعدہ کرتا ہوں“ تمہیں تنہا چھوڑ کر کیس نہیں جاؤں گا تمہارے علاوہ اب میری زندگی میں محبت بن کر کوئی نہیں آئے گا بس ایک بار مئی کو منا کر لے آؤں پھر ہم ہمیشہ اکٹھے رہیں گے۔“ اس نے آہستگی سے منہ کھول کر انگوٹھی اس کے ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہنا دی۔

”فصہ! یہ انگوٹھی تمہیں میرے بیان کی ہمیشہ یاد دلاتی رہے گی اسے کبھی خود سے جدا نہ کرنا“ یہ ہمارے مضبوط تعلق کی پہلی گواہ ہے اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“ وہ خاموشی سے جگر جگر کرتے ہیروں سے پھوٹی شعاعوں میں محبت کی ان قسموں کا عکس تلاش کرتی رہی۔



اور کفیل ماموں کے بارٹ انیک نے جیسے اس سارے قصے میں فیصلہ کن کیل ٹھونک دی اس دن کی لڑائی کے بعد ابراہیم بھائی نے گھر آنا بہت کم کر دیا تھا، تقریباً نہ ہونے کے برابر۔ آتے بھی تو چند گھڑی کھڑے کھڑے آیا جی کے کمرے میں کچھ دیر بیٹھتے، ادھر ادھر کی لالچیں سی باتیں کرتے جو چند منٹوں میں ختم ہو جاتیں۔ دونوں خاموش گونجتے سناتے میں اجنبیت کی سزا بھگتتے لگتے۔ تایا جی نے تو اب ویسے ہی چپ کی چادر اوڑھ لی تھی، اگلے مادہ ریٹائرڈ ہو رہے تھے۔ انہوں نے خود کو اپنے کمرے تک محدود کر لیا تھا۔ شاید وہ تایا جی کی پریشان کن سوال کرتی لگا ہوں سے گھبراتے تھے یا پھر وہ انہیں مزید شرمندگی سے بچانا چاہتے تھے اور ویسے بھی اب سمجھانے یا تارڑنے کا کیا فائدہ تھا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا تھا یہی وہ جوتیشن تھی جو وہ پہلے تایا جی کو سمجھانا چاہ رہے تھے جو وہ سمجھنا نہیں چاہ رہی تھیں اب سمجھ چکی تھیں تو اس سمجھ کو سہارا نہ مل رہا تھا۔

ابراہیم بھائی کا رشتہ تایا جی سے اب محض ”اسلام و علیکم امی“ کا رہ گیا تھا۔ تایا جی کے ساتھ ملاقات میں خاموشی طویل ہو جاتی تو وہ خود ہی اٹھ کر باہر آ جاتے۔ دروازے کی دہلیز پر کھڑے ہو کر یوں ہی ادھر ادھر دیکھتے بھائیں بھائیں کرتا گھر جیسے آوازوں سے خائف تھا وہ بے آواز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ جاتے۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھتے یا لیٹ جاتے۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ تایا جی کے کمرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر ”چھا امی میں جا رہا ہوں خدا حافظ“ کہتے اور باہر نکل جاتے۔ چند ہی لمحوں میں ان کی گاڑی کے ٹائر چر چراتے اور پھر باہر بھی سناٹا چھا جاتا۔

تایا جی دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھیں، غم اندر ہی اندر کھانے لگا تھا۔ وہ گھر سے بھی خاصی لاپرواہ ہوتی جا رہی تھیں۔ ان کے جوڑوں کا دروازہ کھلا تھا، تایا جی بھی تو انہیں کسی قسم کی کمپنی نہ دیتے تھے۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ جیسے تنہا ہو کر رہ گئے تھے اور ایمن کو ان دونوں پر خواہواہی ترس آئے لگا تھا۔ ان کے شروع کے سخت رویوں

اور اس ظالمانہ فیصلے کی وجہ سے وہ اب تک دل میں ان سے خائف تھی۔ مگر اب جیسے یہ کدورت ہمدردی میں ڈھلنا شروع ہو گئی تھی۔ دونوں ہی کھانے پینے کے بے حد شوقین تھے اور اب جیسے دونوں ہی کو کھانے پینے کی پروا نہ رہی تھی۔

وہ خود ہی تینوں ٹائم ان کے کھانے کا خیال رکھتی، اصرار کر کر کے انہیں کھانا کھلاتی۔ چائے منٹوں میں بنا کر لے جاتی، انہیں باتوں میں لگانے کی کوشش کرتی۔ کمرے سے باہر آنے کو کہتی یونیورسٹی سے آکر وہ ہر ممکن طور پر ان کا خیال رکھنے کی کوشش کرتی، اتنے برسوں کے ساتھ نے عجیب سی انسیت پیدا کر دی تھی۔ وہ دونوں بھی اس کے بے حد عادی ہو گئے تھے۔

ولید کو ابھی تک کوشش کے باوجود نوکری نہیں مل رہی تھی اور یہ ہی وہ گھر کا واحد فرد تھا جس سے ایمن ابھی تک خار کھاتی تھی۔ بہت کم مخاطب ہوتی تھی اس کے آنے پر ادھر ادھر کھسک جایا کرتی تھی۔ حالانکہ اب تو اس کا رویہ خاصا بدل گیا تھا خاص طور پر ایمن کے ساتھ وہ بہت نرم لہجے میں بات کرتا تھا اور اس کا یہی نرم لہجہ ایمن کو جھلسا جاتا۔ سارے زخم جیسے ہرے ہونے لگتے، ولید نے اسے کتنا زچ کیا تھا شروع شروع میں۔ بچپن میں تایا جب بچن گھر سے باہر جاتیں تو وہ ہر چیز کو تالا لگا کر جاتیں۔ لیکن کو تالا فریج کو تالا، ٹیلی فون کو تالا، لاونگ کو تالا، غرض گھر کی ہر ہر چیز کو وہ جیسے نظربند کر جاتیں اور ایمن پر آمد کی سیڑھیوں میں بیٹھی بھوک کو نالنے کے جتن کرتی رہتی اور ولید کے پاس تایا جی کے ہر تالے کی دوسری چابی موجود ہوتی تھی۔ وہ تایا جی کی غیر موجودگی میں گھر آتا لیکن کھول کر فریج کا ہر مزیدار آئٹم اس کے سامنے مزے لے لے کر کھاتا، فریج میں کوئی فروٹ نہ چھوڑتا۔ ٹیلی فون کا تالا کھول کر ادھر ادھر فضول کالز کرتا، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ عیاشی کر کے سب چیزوں کو اسی طرح لاک لگا دیتا اور گھر سے چلا جاتا اور جب تایا جی گھر آتیں تو ساتھ ایک بھونچال آ جاتا۔ وہ ان کی آمد کے تھوڑی دیر بعد گھر میں داخل ہوتا اور وہ نو قسمیں کھا کھا کرتی جی کو یقین دلارہی ہوتی تھی کہ اس نے کسی تالے کو بھی ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ آکر جلتی پر تیل کا کام کرتا، تایا جی کو بھڑکاتا، اسے جھوٹی اور مکار کہہ کہہ کر تایا جی سے خوب پوچھتا۔ اس کے اسکول بیگ سے ہوم ورک کی کاپیاں غائب کرنا اس کا معمول تھا۔ اس کے کمرے میں رات کو اچانک پلانٹک کا سانپ چھپکی چھوڑ دینا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔

ایک بار وہ تایا جی کے تالوں کو کھولتا تایا جی کے ہاتھوں پکڑا گیا۔ انہوں نے پھر جو اس کی پٹائی کی ایمن کے سارے زخموں کو جیسے مرہم مل گیا، اس کے بعد تایا جی نے باہر آنا جانا خاصا کم کر دیا پھر ولید نے کان میں ایڈمیشن لے لیا۔ اس کی توجہ ایمن سے ہٹ گئی۔ اب وہ گھر ہی خاصا لیٹ آتا تھا ایمن نے شکر ادا کیا پھر چوں چوں وقت گزر رہا تھا گھر اور خاص طور پر لیکن کی ذمہ داری ایمن کے سر آگئی اب اگر وہ اس سے کوئی ”پنگا“ لینا بھی چاہتا تو تایا جی اسے جھاڑ کر رکھ دیتیں اور اب تو بے روزگاری نے اسے جیسے چپ سا کر دیا تھا پھر ابراہیم بھائی کا قصہ۔ گھر کا احوال جیسے سکڑ گیا تھا۔

تایا جی کفیل ماموں کی عیادت کو روز جاتیں پھر آہستہ آہستہ وہ ٹھیک ہو گئے، ان کا رویہ تایا جی کے ساتھ پہلے جیسا تھا محبت بھرا۔ تایا جی کے دل نے پھر سے آسوں اور امیدوں کے محل کھڑے کرنے شروع کر دیے۔ ابھی اس محل کو ایستادہ ہوئے چند روز بھی نہ گزرے تھے کہ درنایاب آگئی۔ وہ بہت مدت کے بعد ادھر آئی تھی اس روز وہ رات بھی ادھر ہی رہی۔ ابراہیم بھائی تو ناشتہ کر کے اگلے روز آفس چلے گئے وہ تایا جی کے پاس آگئی۔

”آئی جی! میں آپ سے یہ کہنے آئی تھی کہ اب ہم دونوں یعنی میں اور ابراہیم گھر میں شفٹ ہو رہے ہیں۔ گھر کی فنشنگ کا کچھ کام باقی تھا، وہ مکمل ہو گیا ہے اور ویسے بھی اب پایا کو میری ضرورت ہے۔ وہ ٹھیک نہیں ہیں آپ کو تو معلوم ہی ہے نا اور آنٹی جب انسان اولاد کی تمنا کرتا ہے تو وہ اسی دن کے لیے کرتا ہے کہ برصا پے میں اس

کے کام آئے اور اس وقت تو وہ بلا تخصیص بیٹا یا بیٹی کے لیے نہیں صرف اولاد کی دعا کرتا ہے اب جبکہ میرے والدین کو میری ضرورت ہے مجھے ان کے پاس ہونا چاہیے۔ اوھر سے کچھ سامان شام کو ملازم آکر ٹرک میں لوڈ کروا کر لے جائیں گے۔ امید ہے آپ میری بات سمجھ گئی ہوں گی۔" وہ جیسے نیوز لیٹین پڑھ رہی تھی آخری بات کر کے پر سکون ہو کر کھڑی ہو گئی۔

"تو کیا میں نے ابرار کی اسی دن کے لیے پرورش کی تھی کہ وہ اس بڑھاپے میں جیون کی اس کڑی دہری میں ہمیں چھوڑ کر کسی اور کے والدین کی خدمت کو چل پڑے۔ میں ابرار کو ہرگز نہیں جانے دوں گی۔" تائی جی نے اپنے جلال کے ڈولتے سنگھاسن کو جمانا چاہا۔

"وہ تو خیر میرے ساتھ ہی جائیں گے، آپ کی بے جا ضد اور ہٹ دھرمی انہیں روک نہیں سکے گی۔ کس کی اولاد کس کے ساتھ کیا سلوک کرنی ہے۔ اس کا الزام اسے دوسروں کو نہیں بلکہ اپنی ناقص تربیت کو دینا چاہیے۔ اس میں ہر حال میرا کوئی قصور نہیں، آپ کو معلوم ہے اور ابرار کے جانے سے آپ کو کچھ فرق بھی نہیں پڑے گا۔ آپ کے پاس آپ کا دوسرا بیٹا موجود ہے اور کوشش کیجیے گا کہ وہ آپ کو چھوڑ کر نہ جائے۔ اپنے انداز تربیت کا ایک نظر جائزہ لیجیے گا۔ اچھا میں اب چلتی ہوں، باہر ڈرائیور انتظار کر رہا ہے۔ شام کو سامان لینے ملازم آئیں گے خدا حافظ۔"

وائٹ فیمٹی نیٹ کے سوٹ میں کسی مغرور شہزادی کی طرح تائی جی کے جذبات کو اپنے نازک پیروں تلے کچلتی وہ جس طرح اس گھر میں آئی تھی۔ اسی ناز و انداز کے ساتھ گیٹ پار کر گئی اور تائی جی اسے روک بھی سکیں۔ شام کو جب ملازم دریا ب کا سامان اس کی ملازمہ زینت کی زیر ہدایت ٹرک میں لوڈ کر رہے تھے تو تائی جی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں اس قدر وحشت تھی کہ ایمن کو لگا وہ ابھی پاگل ہو جائیں گی یا کسی دیوار سے سروے ماریں گی۔

"تائی جی! اندر آجائیں اٹھ کر اوھر شور ہے۔" اس نے نرمی سے انہیں کندھوں سے پکڑ کر اٹھانا چاہا۔ انہوں نے بے حد سختی سے اس کے دونوں ہاتھ جھٹک دیے اور سامان کے ڈبے اٹھائے آتے جاتے ملازموں کو پوری توجہ سے دیکھنے لگیں وہ شاید اپنے ضبط کی آخری حد کو چھوٹا چاہ رہی تھیں۔



سارہ، زگرس آنٹی، عاکف چچا اور رہبر زوانی باہر لان میں کرسیاں ڈالے شام کی چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ شام بہت خوشگوار تھی، ہلکے ہلکے ہوائے جھونکوں سے ملنے درختوں کے نیچے اور آسمان پر تیرتے سرمئی بادل اس کو اور دل فریب بنا رہے تھے۔ چاروں کے درمیان لگتا تھا کوئی دلچسپ گفتگو چل رہی تھی۔ چاروں باتیں کرتے ہوئے مسکراتے تھے، ہنس رہے تھے اگرچہ کوارٹر کی کھڑکی سے ان کے فریش چہرے اور مزاجوں کا تو پتا چل رہا تھا، لیکن نہ تو ان کی ہنسی کی آواز سنائی دے رہی تھی نہ مسکراہٹ کی وجہ لیکن اس کے باوجود اسے لگ رہا تھا کہ وہ اس کے پاس ہی بیٹھے ہنس رہے ہیں۔ شاید اس کی بے بسی اور بے چارگی کا سمسراؤ اسے ہیں، حالانکہ یہ منظر تو اس کی آنکھوں نے بار بار دیکھا تھا کہ اس خوبصورت گھر کے مکین اکثر و بیشتر ایک دوسرے سے ملاقات کرنے کے لیے کھانے کی میز پر یا شام کی چائے پر اوھر کر بیٹھ جاتے۔ خوش گلیاں چلاتی باتیں، خوب تھقے لگائے جاتے ہیں اور وہ یہ منظر دیکھ کر آرام سے کھڑکی بند کر کے اپنی کوٹھڑی میں بے حس بن کر بیٹھ جایا کرتی تھی۔ تو آج بھلا کیا خاص بات ہے جو جب سے اس نے یہ منظر دیکھا تھا پھر چلتی چلی کی طرح اسے چین نہیں آ رہا تھا۔ کبھی کبھے کے دوسرے کوٹھڑی میں جاتی تو دوسرے بل پھر بے قراری سے کھڑکی سے آتی۔ رہبر زوانی ہاں یہی توجہ ہے اس کی بے قراری

واضطراب کی۔ اسے پہلے تو اس منظر نے بھی بے چین نہیں کیا تھا آج محض رہبر کے ان کے ساتھ بیٹھنے سے جیسے اس کے دل کا چین سکون غارت ہو چلا تھا ایک ایک بل جیسے اس کی تڑپ کو بڑھا رہا تھا۔

"یا اللہ میں کیا کروں۔" اس نے بے بسی سے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ رگڑا لالا اور ہاتھ میں پسینی ہوئی انگلی تھی اس کی ناک سے ٹکرائی وہ اسے غور سے دیکھنے لگی۔

"رہبر! میرے علاوہ کسی اور کے بارے میں نہیں سوچ سکتے یہ انگلی گواہ ہے۔" اس نے انگلی تھکی کے ہیروں کو چھو کر خود سے کہا۔

"ارے یہ تو امیر زادوں کا اسٹائل ہوتا ہے۔ اس طرح کے تحائف دے کر لوڑ کلاس میں عشق و محبت بگھارنا اور شادی اپنے اسٹیٹس کے مطابق کرنا اگر وہ اتنی سی چیز کی وجہ سے اپنے جذبات گروی رکھنے لگیں تو محبت کی دنیا میں ان کی بے وفائیوں اور کج ادائیگیوں کے قصے درج نہ ہوتے۔" ہیروں سے پھوٹی شعاعیں ہنس کر بولیں۔

"نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، وہ میرے ساتھ دھوکا کیوں کریں گے میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔" وہ تڑپ کر کھڑکی میں آکھڑی ہوئی اور اپنی بصارتوں کی تمام توانائیاں یکجا کر کے رہبر کے چہرہ چہرے کو دیکھنے لگی اتنی دور سے اسے اس کی آنکھوں میں کوئی کھوٹ کوئی ریا نظر نہیں آ رہی تھی۔

"چلو دل کے بھلانے کو یہ خیال اچھا ہے۔" ہیروں نے پھر اسے چھیڑا۔

"اگر ایسا ہوتا تو میں یہ انگلی اتار کر ان کے منہ پر دے مار دوں گی۔" وہ جواباً "چکر بولی۔"

"تم ایسا ہرگز نہیں کر سکو گی بھلا کر سکو گی۔" رہبر نے انتہائی شرارتی تھے اس کے جذباتوں کی گہرائی ناچنا چاہ رہے تھے۔

"محبت صرف انگلیوں کی محتاج تو نہیں ہوتی یہ اگر میری انگلی سے اتر بھی گئی تو کیا دل سے محبت نکل جائے گی۔" اس نے خود سے سوال کیا۔

"نہیں" فوراً "جواب آیا "اس اٹھارہ انیس سالہ زندگی میں پہلی بار تو محبت کی بے چکھی ہے، جن کو یہ ہر گھڑی ملا کرتی ہے ان کو تو شاید اس کی قدر نہ ہو، لیکن میری تو تمام حیات کا سرمایہ ہے یہ چند گھونٹ محبت۔ اب رہبر مجھ سے منہ پھیر بھی لیں مگر میں واپس نہیں پلٹ سکتی۔ اس کی چند روزہ رفاقت نے پچھلی زندگی کے سارے عذاب گلاب کر دیے ہیں۔ اب رہبر کے سوانہ کچھ بھائی دیتا ہے نہ سنائی دیتا ہے تو پھر میں کیسے پلٹ سکتی ہوں۔"

رہبر اور سارہ ایک ساتھ اٹھ کر کھڑے ہوئے اور ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پورچ کی طرف بڑھے۔ رہبر نے سارہ کے لیے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا چند ہی لمحوں میں ان کی گاڑی گیٹ سے باہر جا رہی تھی ان کے جانے کے بعد زگرس آنٹی اور عاکف چچا بھی اٹھ کر اندر چلے گئے۔

سارا منظر جیسے سناٹوں کی زد میں آ گیا۔ وہ بے جان قدموں سے چلتی ہوئی باہر آ گئی۔ نیم کے درخت سے ٹیک لگا کر وہ ٹھنکی باندھے اس کرسی کو گھورنے لگی، جہاں کچھ دیر پہلے رہبر زوانی بیٹھا ہنس رہا تھا۔ کتنے ہی لمحے بے آواز گزر گئے وہ گیٹ کھلنے کی آواز پر جیسے ہوش کی دنیا میں واپس آ گئی۔ اس کا سارا چہرہ اور قیص کا گریبان بھگا ہوا تھا۔ وہ اتنی دیر سے رو رہی تھی اور اسے خبر بھی نہیں تھی۔ رہبر نے گاڑی پورچ میں کھڑکی کی اور اس کی طرف بڑھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے رگڑ کر چہرہ اور آنکھیں صاف کر لیں۔

"ہیلو فضا! یاد تم کہاں ہو، میں کتنی دیر سے بور ہو رہا تھا پھر سوچا تمہارے حجرے سے تمہیں نکال کر لاتا ہوں تو اٹھ اور آنٹی باہر آکر بیٹھ گئے، تم ٹھیک تو ہونا۔" بے تکلفی سے بولتے ہوئے قریب آکر اس نے فضا کے تے ہوئے چہرے اور روئی روئی آنکھوں کو دیکھ کر پوچھا۔ وہ خاموش رہی۔

"میں کیا پوچھ رہا ہوں۔ آریو آل رائٹ؟" وہ اس کا ہاتھ نرمی سے تھام کر بولا۔ اس کے لمس نے جیسے اس کے

اندر کرٹ دوڑا دیا اس نے ذرا سختی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

”کیا ہوا“ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی۔“ وہ اس کے سخت رویے سے خائف ہو کر بولا۔

”نہیں، وہ تو مجھ سے ہوئی اپنی اوقات سے بڑھ کر خواب جو دیکھنے لگی ہوں۔“ اس کی آواز اجنبی سی تھی۔

”فضہ! ایسی باتیں کر رہی ہو۔“ وہ ذرا خوف کی سی بولا۔ ”کیا تمہیں میرا یقین نہیں، میرا تو ایک ایک بل اب

تمہاری ہم راہی کے خواب دیکھتے ہوئے گزرتا ہے، میری زندگی میں اب تمہارے سوا کوئی نہیں آسکتا یقین کرو۔“

وہ اس کے ذرا قریب ہو کر دم لہجے میں محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا اس کی نظروں کی آنکھ اسے

پگھلانے لگی۔ ”تمہیں کوئی شک ہے کہ تمہارے سوا کوئی اور بھی ہے یا ہو گا۔“ فضی! وہ دن میری زندگی میں نہیں

آئے گا، تمہارے جنون نے مجھے دیوانہ کر دیا ہے اور یہ دیوانگی اب تمہیں بائیں بغیر حتم نہیں ہوگی۔ جس کی کہو قسم

کھانے کو تیار ہوں۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں بے انداز بے حد۔ یقین کرو۔“ رہبر کا ہاتھ اب اس کے کندھے

پر تھا اس کے مضبوط ہاتھ تلے جیسے اس کا بدن نیچے ہی نیچے جھکنے لگا۔

”تو پھر ابھی سارے۔“ وہ آنکھیں جھپک کر بس اتنا ہی کہہ سکی۔

”او فوٹش گرل! یار ڈرائیو ر کسی کام سے گیا ہوا تھا اسے اپنی کسی دوست کی طرف جانا تھا بس اسے ڈراپ کرنے

گیا تھا۔ اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔“ فضہ! کیا تم مجھے ایسا سمجھتی ہو کہ میں تمہیں دھوکا دوں گا۔“ کندھے پر دباؤ

بڑھ گیا تھا اس کا سانس رکنے لگا۔ اس کے چوڑے شانوں کے پیچھے جیسے ساری دنیا چھپ گئی تھی۔ اس نے نفی میں

سر ہلایا۔

”تو پھر۔“ شکوک کیسے۔ تم نہیں تو کوئی بھی نہیں، یہ رہبر کا تم سے وعدہ ہے ٹھیک ہے۔“ وہ ذرا سا جھک کر اس کی

آنکھوں میں جھانک کر بولا تو وہ ہلکے سے مسکرا دی۔

”وٹس گڈ۔“ چلو اب کہیں چلتے ہیں اتنا اچھا موسم ہو رہا ہے۔ لمبی ڈرائیو پر چلیں گے، تم چینیج کر لو ہر وقت

ماسیوں کے جیلے میں پھرتی رہتی ہو۔“ فضہ! میں تمہیں ہمیشہ فریش دیکھنا چاہتا ہوں۔ کسی کھلے گلاب کی طرح۔ وہ

ہنس کر ہلکے ہلکے موڑ میں بولا تو وہ سر ہلا کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔

”میرا خیال ہے چند ایک روز میں پایا آئیں گے۔ ان کاراٹ کو فون آیا تھا ابھی بات ہو رہی تھی کہ لائن ڈراپ

ہو گئی۔“ گاڑی سڑک پر ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔

”موسم کتنا اچھا ہو رہا ہے۔“ وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولی۔

”ہیلے کا تو چاہئیں لیکن اب واقعی بہت حسین ہو رہا ہے، ایمان خراب کر دینے کی حد تک۔“ وہ اس کے

سر پرے کو نظروں میں اتارتے ہوئے شوخی سے بولا۔

”لوں ہوں اگر آپ نے ایسی باتیں کرنی ہیں تو مجھے واپس چھوڑ آئیں۔“ اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔

”اچھا بھئی“ اب میں تمہیں دینیات کا سبق تو پڑھانے سے رہا۔ ہمارے درمیان تو اسی قسم کی باتیں ہو سکتی

ہیں۔“ فضہ! اگر بیلا میرا پر پوزل تمہارے لیے دیں تو وہ عائف انگل سے بات کریں گے۔“ وہ ایک دم سے بولا تو اس

کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

”ہے نا۔ ان ہی سے بات کرنی پڑے گی۔“ وہ اس کی خاموشی پر پھر بولا تو اس نے خفیف سا سر ہلا دیا۔

”دعا کرو سب کچھ خیر خیر سے ہو جائے۔ ظالم سلج ہمارے درمیان نہ آئے۔ اور بچ جو س پیٹے ہیں۔“ بات

کرتے کرتے ایک ڈرنگ کار نو کے پاس اس نے گاڑی روک کر دی۔ وہ اسی طرح سب پر وگرام فوراً ”ارج“ چکر لیتا تھا

وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

”لو اس چلتے ہیں۔“ بوس کی گراس نے نیا پروگرام بنا ڈالا۔

وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

”میں ایک بار لراچی جانا چاہتی ہوں، آپ مجھے لے کر جائیں گے نا۔“ وہ سرمئی ڈھلتی شام کو انجوائے کر رہی

تھی۔

”ہاں کیوں نہیں، مگر شادی کے بعد جائیں گے۔“

”نہیں پہلے۔“ وہ زور سے سر ہلا کر بولی۔

”کس سے پہلے۔“ وہ شرارت سے اسے تکتے ہوئے بولا۔

”مجھے نہیں پتا۔“ وہ اس کی بات سمجھ کر کھسیا گئی۔

”اچھا کو شش کروں گا، ویسے بھی شادی میں تمہاری سسٹرز کا ہونا بہت ضروری ہے، تمہارے پاس ان کا

ایڈریس ہے۔“

”نہیں۔“

”چلو میں عائف انگل سے لے لوں گا۔“ اس نے جیسے اس کا بوجھ سر کایا۔ گاڑی پارک کر کے وہ باغ کے اندر

چلے گئے۔

خوبصورت شام باغ کے اندر اور بھی رومانٹک لگ رہی تھی۔

”فضہ! اس طرح ساتھ ساتھ چلنا کس قدر اچھا لگتا ہے، ہے نا۔“ کچھ دیر خاموش چلنے کے بعد اس نے کہا۔

”ہوں۔ رہبر! یہ درخت کتنے عجیب سے ہیں پر اسرار سے۔ بیت ناک سے جیسے جیسے۔“ اسے کچھ سمجھ میں

نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان اونچے اونچے دیو قامت درختوں کو کیا نام دے جو سڑک کے دونوں طرف بڑی شان سے سر

اٹھائے کھڑے تھے۔ درختوں کے تنوں سے لگی اسماء الحسنی کی تختیاں ان کی بڑائی کو جیسے اور بڑھا رہی تھیں۔ شام

ڈھل رہی تھی، پرندے اپنے گھروں کو لوٹنے کے لیے شور مچا رہے تھے اور درخت جیسے اس سارے شور و غل سے

بے نیاز اپنے وجود میں گمن تھے۔

”آپ کو کچھ فیل نہیں ہو رہا۔ یہ بہت پرانے ہیں نا۔“ وہ مسلسل نظریں جمائے سر اٹھا کر ان درختوں کو دیکھ

رہی تھی جو اسے عام درختوں سے بہت مختلف لگ رہے تھے۔

”ہاں لگ تو یہی رہا ہے، باغ بھی تو قیام پاکستان سے پہلے کا ہے ظاہر ہے ان درختوں کی عمریں بھی خاصی طویل

ہوں گی۔ واقعی ان کی وجہ سے ماحول خاصا پر اسرار سا لگ رہا ہے۔“ رہبر بھی ان درختوں کی خاموشی کو محسوس

کرتے ہوئے بولا۔

”مجھے یہاں آنا بہت اچھا لگا ہے، جیسے ان درختوں سے میری پرانی شناسائی ہے مگر یہ بہت چپ لگ رہے ہیں

نا۔“

”اچھا چھوڑو یار ہم کیا ان درختوں پر ریسرچ کرنے آئے ہیں، تم تو پیچھے پڑ گئی ہو ان بے چارے عمر رسیدہ

بوڑھوں کے۔ ویسے بھی جسے ان کے بارے میں معلومات لینی ہوں وہ ان کے ساتھ لگی تختیوں سے مدد لے سکتا

ہے جن پر ان کے نام وغیرہ لکھے ہیں۔ یہ باغ روماس کرنے کے لیے سب سے بہترین اسپاٹ ہے لاہور میں اور تم

فضہ چار درویش کھول کر بیٹھ گئی ہو۔“ رہبر اس کی گفتگو سے اکتا کر بولا۔

”مجھے تو جو محسوس ہوا وہ۔“ اسے ایک دم سے کھانسی آنے لگی، وہ رک کر کھانسنے لگی۔ رہبر بھی رک گیا، اس

کا حلق ایک دم سے خشک ہو گیا تھا۔ کانٹے جھپٹے لگے تھے پانی کی طلب میں کھانسی اور شدید ہو گئی۔

”اوہو، تمہیں تو بہت کھانسی آرہی ہے، چلو واپس چلتے ہیں۔“ وہ فکر مندی سے بولا۔

”پانی!“ وہ ذرا رک کر بولی۔ ساتھ ہی شدت کی کھانسی آئی کہ اس کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں۔

پانی!

پانی!

پانی!

”اوہو، چلو تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں۔ پر سوں بھی تم اسی طرح کھائیں رہی تھیں۔ پتا نہیں کیا اوٹ ٹانگ کھاتی رہتی ہو۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ”یہ لو نشو سے آنکھیں صاف کر لو۔“ پینٹ کی جیب سے نشو نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”وہ جو کھانا کھانا میرا گلا گل سے دکھ رہا ہے اس لیے۔“ وہ آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی، گلے میں ابھی تک خراش پڑ رہی تھی وہ دونوں پارکنگ کی طرف بڑھے۔

”اوہ، یاد آیا یہاں قریب ہی پیپا کے دوست ڈاکٹر نرئی ہیں ان کے کلینک چلتے ہیں۔“ اس نے گاڑی بائیں طرف موڑتے ہوئے کہا۔

”رہنے دیں اب تو ٹھیک ہے۔“ وہ تھوک سے گلے کو تر کرتے ہوئے بولی۔

”نہیں ایسے لا پرواہی نہیں کرنی چاہیے۔ مجھے تو تمہارے انکل پر حیرت ہے انہیں تمہاری کچھ پرواہی نہیں۔ خیر اب تم فکر نہ کرو میں جو ہوں۔“ وہ خود ہی بولا۔ کلینک واقعی قریب ہی تھا۔

”ڈاکٹر صاحب موجود ہیں۔“ بیون کے بتانے پر وہ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔

”السلام و علیکم انکل!“ رہبر اندر داخل ہو کر ڈاکٹر کی نشست پر بیٹھے ادھیڑ عمر سوبر سے شخص سے بولا، کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔

”وہ علیکم السلام!“ ڈاکٹر نے کھڑے ہو کر اس کے مصافحے کے لیے بڑھے ہاتھ کو تھامتے ہوئے کہا شاید وہ رہبر کو پہچان رہا تھا۔

”آہا تم رہبر ہونا۔ رہبر زندانی! جیب کے بیٹے میں نے صحیح پہچانا۔“ دوسرے لمحے ڈاکٹر صاحب چمک کر بولے۔

”لیس، آپ نے صحیح پہچانا انکل اور پھر تین سال پہلے تو ملے تھے ہم اور سنائیں کیسے ہیں آپ؟“ رہبر نے بیٹھے ہوئے کہا۔

”بالکل ٹھیک، تم سناؤ کیسے ہو، جیب ٹھیک ہے۔“ ڈاکٹر صاحب خوشدلی سے بولے۔

”جی سب ٹھیک ہے یہ میری کزن ہیں فاضل ان کا چیک اپ کروانا تھا۔“ اس نے فاضل کو اپنے ساتھ والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے تعارف کرایا۔

”ہاں ابھی ایک ڈاکٹر کی یاد صرف کسی مریض کا چیک اپ کروانے کے لیے ہی آسکتی ہے۔ کب آئے تم پاکستان۔“ وہ ہنستے ہوئے بولے۔

”تقریباً، مہینہ ہو چلا ہے، چند ایک روز میں پیپا بھی آئیں گے۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ پچھلے مہینے فون آیا تھا اس کا۔ ہاں تو مینا جی کیا مسئلہ ہے آپ کو۔“ وہ فاضل کو دیکھ کر بولے ”ادھر آکر بیٹھو۔“ انہوں نے اپنے پاس پڑی چیئر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ اٹھ کر ان کے پاس آ بیٹھی۔

”گلا دکھ رہا ہے اور کھانسی بھی ہو رہی ہے۔“ وہ بیٹھے ہوئے بولی۔

”ہوں!“ انہوں نے اشارہ کر کے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس نے منہ کھول دیا وہ تاراج کے ذریعے توجہ سے چیک کرنے لگے۔“

”بچھے بیک کی طرف سے۔“ وہ مڑ گئی۔

”زور سے سانس لیں۔“ اس نے جیسے ہی زور سے سانس لیا ایک دم سے پھر کھانسی شروع ہو گئی۔ ڈاکٹر

صاحب اس کی کھانسی کے رکنے کا انتظار کرنے لگے۔

”ایسے ہی ڈاکٹر صاحب کھانسی شروع ہو جاتی ہے۔ اسے تو پھر کتنی دیر نہیں رکتی۔“ رہبر تشویش سے بولا۔

”ہوں۔ بیٹا! یہ بائیں لے لو اندر دروازہ روم ہے کھانسی کے بعد جو تھوک نکلے وہ اس میں ڈال کر لے آؤ۔“ وہ

کھانسی سے بے حال ہو رہی تھی، جب ڈاکٹر نے پارکنگ کی ایک کھلے منہ والی شیشی اس کی طرف بڑھائی۔ وہ

شیشی لے کر دروازہ روم کی طرف بڑھی اندر جا کر اسے زور سے کھانسی کا آخری جھٹکا سالگا۔ اس نے شیشی میں

تھوک دیا سفید لعاب میں سرخی گھلی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔

”بس بیٹا! یہ شیشی ایسے ہی رستے دو تم باہر آ جاؤ۔“ ڈاکٹر صاحب نے پیچھے سے آکر اسے کہا اور ہاتھ میں پکڑا پانی

کا گلاس سے تھمایا۔ اس نے دو چار گھونٹ پی کر گلاس انہیں واپس کر دیا اور ہاتھ روم میں پڑے نشو سے آنکھیں

صاف کرنے لگی۔

”یہ کچھ دوائیں ہیں، یہ استعمال کریں تقریباً تین روز تک یہ میں کچھ ٹیسٹ کرواؤں گا، باہر میرا اسٹنٹ ابھی

تمہارا خون لے گا پھر آکر تین دن کے بعد دوبارہ چیک اپ کرواؤ اور رپورٹس بھی لے جانا۔“ ڈاکٹر صاحب

نے نسخہ لکھ کر اس کے ہاتھ میں دیا۔ دونوں ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کر کے باہر نکل آئے۔

”خون دیتے وقت تکلیف تو نہیں ہوئی۔“ وہ گاڑی میں بیٹھ کر بولا۔

”نہیں کچھ خاص نہیں۔“ اس نے کالانی کی ابھری ہوئی رگ کو دیکھا جہاں سے ابھی خون لیا گیا تھا۔

”پھر روکیوں رہی تھیں؟“

”تکلیف کی وجہ سے۔“ وہ ہنس دیا۔

”یہ پیپا کے بہت اچھے دوست ہیں، پرسوں دوبارہ آکر چیک اپ کروالیں گے۔ ابھی راستے سے یہ میڈیسن لیتے

ہیں اب تو ٹھیک ہونا۔“

”ہوں۔“ اس نے سر ہلادیا۔

”دوسرے کا سر ہلادیتی ہو، چھٹانک بھری زبان نہیں بلا سکتی۔“ وہ اس کے سر ہلانے پر بولا تو وہ مسکرا دی۔ اس نے

گاڑی کی اسپینڈ بڑھا دی۔

♥ ♥ ♥ ♥

کلج سے باہر نکل کر اس نے پوائنٹ کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ گاڑیوں کے رش سے ذرا ہٹ کر وہ باہر

سڑک کی طرف نکلی کہ ایک گاڑی آہستگی سے سرکتی ہوئی اس کے پاس آکر رک گئی۔ اس نے توجہ نہ دی اس کی

نظریں تو پوائنٹ کو ڈھونڈ رہی تھیں، آج اس کا کمپیوٹر کلاس لینے کا منوڈ نہیں تھا۔

”عبیرو! عبیرو بیٹا!“ کسی نے اسے گاڑی میں سے پکارا اس نے چونک کر دیکھا، آف وہاٹ سوٹ میں ہم

رنگ دوپٹے اوڑھے مسرت حق اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ کچھ جھجک سی گئی ان کے دوبارہ پکارنے

پر اس نے آگے بڑھ کر ذرا سا جھک کر سلام کر دیا۔

”بیٹا! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔ پلیز کچھ دیر کے لیے میرے ساتھ آئیں گی۔“ ان کا لہجہ اس دن کی

طرح شائستہ اور مہذب تھا، وہ کوشش کے باوجود فوراً انکار نہیں کر سکی۔

”آئی! مجھے دیر ہو جائے گی گھر سے، آپ پلیز گھر آکر بات کر لیجیے گا۔“

”نہیں بس میں تھوڑا سا آپ کا وقت لوں گی، دس پندرہ منٹ اندر آ جاؤ، جانا کہیں نہیں ہے یہیں بات کرنی

ہے۔“ انہوں نے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر کہا۔

وہ انکار کر رہی نہیں سکی اور — جھجکتی ہوئی، ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔

(باقی آئندہ)

(261)

(260)



۶
چھٹی قسط

عبیرہ کالج سے نکل کر پوائنٹ کی تلاش میں کھڑی تھی۔

”عبیرہ! عبیرہ! بیٹا“ کسی نے اسے گاڑی میں سے پکارا تو اس نے چونک کر دیکھا۔ آف وہاٹ سوٹ میں ہم رنگ دوپٹہ اوڑھے مسز حق اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ کچھ جھجک سی گئی۔ ”بیٹا مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔ پلیز کچھ دیر کے لیے میرے ساتھ آئیں گی۔“ ان کا لہجہ ان کی طرح شائستہ اور مہذب تھا۔ انکار نہیں کر سکی۔ ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

”یہاں تو بڑا رش ہے ڈرائیور گاڑی آگے لے جاؤ۔“ وہ ڈرائیور سے بولیں۔

”بس یہیں سائیڈ پر روک دو۔“ کالج کی باؤنڈری وال ختم ہوتے ہی وہ دوسری تیسری کوٹھی کے درمیان گاڑی روک کر بولیں۔ ڈرائیور گاڑی روک کر دروازہ کھول کر باہر چلا گیا اور کچھ دور درخت کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا۔

”بیٹا! یہ تو آپ جانتی ہی ہیں کہ میں آپ میں کیوں انٹرسٹڈ ہوں۔“ انہوں نے تمہید باندھی۔ ”اگر اس معاملے میں میں تمہاری رائے پوچھوں تو تم کیا کہو گی۔“

”وہی جو غزالہ آنٹی آپ سے کہیں گی۔“ وہ فوراً بولی۔

”ہوں اچھی بات ہے، اچھی اور نیک بیٹیاں ایسے ہی کہتی ہیں۔ خیر یہ تو آپ کو بھی معلوم ہے کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔ وہ مان نہیں رہیں اس رشتے پر۔ میری ہزار کوشش کے باوجود مجھے آپ سے صرف یہ پوچھنا تھا کہ اگر آپ کے تسلسلے میں بات کرنی ہو تو آپ کی غزالہ آنٹی کے علاوہ اور کس سے بات کی جاسکتی ہے؟“

”ان ہی سے۔“ وہ اسی لہجے میں بولی۔

”پھر بھی بیٹا! ان کے علاوہ کوئی اور بڑا۔۔۔ آپ کی دوسری سسٹرز اور بھائی کس کے پاس رہتے ہیں؟“

”میری بڑی سسٹر میرے تایا جان کے پاس کراچی میں رہتی ہیں۔“

”آپ مجھے ان کا ایڈریس دیں گی۔“

”یہ اچھا نہیں لگتا۔ غزالہ آنٹی کیا سوچیں گی۔“ وہ انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔

”میں آپ کا نام بیچ میں نہیں آنے دوں گی۔ بس آپ مجھے ان کا ایڈریس دے دیں بیٹا! میں کوئی غلط کام نہیں کرنا چاہتی ایک نیک کام جائز اور باعزت طریقے سے کرنا چاہ رہی ہوں اور یہ میرا حق بھی ہے۔ اس پر اپنے تایا کا ایڈریس

لکھ دو۔ انہوں نے ہینڈ بیک سے ڈائری اور پین نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

”پلیز آئی! مجھے اچھا نہیں لگ رہا، آپ غزالہ آئی سے پوچھ لیں۔“

وہ کچھ دیر اس کی طرف دیکھتی رہیں۔

”مچلو ٹھیک ہے، میں ان ہی سے پوچھ لوں گی۔“ انہوں نے پین اور ڈائری واپس رکھ دی۔

”تمہارے تایا کا نام کیا ہے؟“ انہوں نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

”میرے بھائی بھی کراچی میں ہوتے ہیں، آپ کے تایا کس سائڈ پر ہیں وہ تو کلفٹن کی طرف رہتے ہیں۔“

”وہ ناظم آباد میں ہیں۔“ انہوں نے سرسری انداز میں آگے کا پتا بھی اس سے پوچھ لیا۔ بتا کر اسے اپنی غلطی کا

احساس ہوا۔

”میں آپ کو ڈراپ کر دوں گھر۔“ وہ محبت سے بولیں۔

”نہیں ٹھیک ہو، میں چلی جاؤں گی۔ وہ میرا پوائنٹ آگیا ہے۔“

وہ دروازہ کھول کر اترتے ہوئے بولی ”چھا آئی خدا حافظ!“ وہ کہہ کر جلدی سے پوائنٹ کی طرف بڑھی۔

گھر آکر وہ سوچتی رہی کہ غزالہ آئی سے اس کا ذکر کرے کہ نہ کرے۔ شام کو وہ رہ نہ سکی غزالہ آئی پین میں کھانا بنا رہی تھیں جب اس نے انہیں ساری بات بتادی تو جیسے اس کے ضمیر سے سارا بوجھ اتر گیا۔

”ہوں تو بات یہاں تک پہنچ گئی۔“ غزالہ آئی نے جیسے خود سے کہا۔

”جی آئی! کیا کہا آپ نے؟“ وہ سن نہ سکی تھی۔

”کچھ نہیں بیٹا! اتم اب جاؤ۔“ وہ بولیں۔

”اگر وہ اتنی چاہت دکھا رہی ہیں تو کیا میں خود غرضی نہیں دکھا رہی؟ اگر وہ دو تین سالوں کا کہہ رہی ہیں تو اس میں

کوئی حرج تو نہیں، اپنے سارے حالات انہیں بتا کر اپنی مجبوری کا اظہار کر سکتی ہوں۔ مگر یوں اس طرح محض اپنی

بینیوں کی خاطر مجھے عبیدہ کے اچھے مستقبل کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ پہلا اچھا رشتہ تو خدا کی بڑی نعمت ہوتا

ہے۔ یہی رشتہ اگر تانیہ یا ثویبہ کا آیا ہوتا تو میں ایک منٹ کی دیر نہ لگاتی۔ نہیں مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ اب

چاہے کچھ ہو جائے، میں آج جمال سے بات کر کے کل مسز حق کو ضرور فون کروں گی، میرے اللہ اس نیک کام کو انجام

دینے میں میری مدد فرما۔“

انہوں نے چولہا جلاتے ہوئے دعا کی۔



رہبر کے پایا عاکف چچا کی مکمل تصویر تھی۔ وہی مصروف مصروف سا انداز، رہبر کے خصوصی تعارف کرانے پر

بھی ان کا رویہ فخر کے ساتھ سرسری سا تھا۔ وہ اچانک آئے تھے پاکستان صرف دو دن کے لیے رہبر کی محی کی

طبیعت ٹھیک نہیں تھی ورنہ وہ بھی ساتھ آتیں۔

”مہی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، مجھے یہ سنا ہے کہ ساتھ ہی جانا بڑے گالیکن تم فکر نہ کرنا، مجھے پندرہ بیس دن

نہیں تو مہینہ لگے گا۔ میں مہی پایا کو ساتھ لاؤں گا۔“ مہی کی تو ضرورت نہیں۔ اب ڈائریکٹ شادی کے لیے مہی کو تیار

کر کے لاؤں گا، مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں، لیکن اس کے اظہار میں ہمیشہ مجبوسی سے کام لیتے ہیں۔ البتہ مہی

میری خاطر سب کچھ کر کے رہنمائی میں تیار ہو جاتی ہیں۔ اس لیے تم کوئی واہے یا وسوسے نہ دل میں پال لیتا۔ اب

تمہارے دنوں کی بات ہے۔ پھر میں ہوں گا تمہارے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ نا، اس نے حسب عادت تانید

کے لیے اپنا ہاتھ اس کے آگے پھیلا دیا، اس نے ڈاکسی مسکراہٹ یوں پر لا کر اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا۔

”اگر آپ کی مہی نہ مانیں تو؟“ ہزاروں خدشے سوال کی صورت ابھرے۔

”ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔“

وہ پورے وثوق سے بولا ”پھر بھی اگر تمہیں وہم ہے کہ ایسا ہو جائے گا تو اور بہت سے رستے ہیں۔ تم کورٹ میں ج کے لیے راضی ہو جاؤ گی تاکہ کیونکہ میں تو یہ بھی کر گزرنے کو تیار ہوں۔“

اس کا نازک ہاتھ ابھی تک اس کی گرفت میں تھا۔ اس گرفت کی تپش سے اس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے ابھر آئے تھے۔

”یہ اچھی بات نہیں۔“ اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کمزور آواز میں کہا۔

”محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔ میں اسی پر یقین رکھتا ہوں فضا! یہ ہماری زندگی ہے اور زندگی بار بار

نہیں ملے گی۔ اسی ایک زندگی سے ہر خوشی کو کشید کرنا ہے۔ اگر دو سروں کی رائے پر چلنے لگے تو ہماری یہ زندگی جہنم

بن جائے گی اور میں جیتے جی ایسا نہیں ہونے دوں گا۔“

وہ اپنے اردوں سے زیادہ مضبوط لگ رہا تھا۔

”سچ میں اتنے سارے دن ہیں، یہاں تو لوگ ایک پل میں بدل جاتے ہیں۔ یہ واسے اسے ایک پل کی خوشی دینے

پر بھی تیار نہیں تھے۔“

”تم مجھے لوگوں میں شمار کر رہی ہو۔؟ نہیں فضا! محبت صرف ایک بار کی جاتی ہے۔ یہ کوئی سودا نہیں جو بار بار کیا

جائے یہ یا تو ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔ تیسرا کوئی رستہ نہیں اور راہ بدلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم مجھ پر بھروسہ

رکھو اور خدا سے دعا کرنا کہ میں تمہارے بھروسے کو تا عمر قائم رکھ سکوں۔“ فضا کے ہاتھ پر اس کی گرفت اور مضبوط

ہو گئی۔

”مجھے ڈر لگتا ہے۔“ اس کی تسلیوں کے باوجود دل سما جا رہا تھا۔

”اب میں اور کسے یقین دلاؤں تمہیں؟“ وہ بے بسی سے بولا۔ ”تمہیں یقین نہیں ہے مجھ پر، اسی لیے ان

دوسروں کے ہاتھوں کھلو نا بنی ہوئی ہو۔ اپنے دل کا رخ میری طرف کرلو پھر سارے دوسو سے منہ پھیر لیں گے۔ تم نے

دوایں آج ڈاکٹر نقوی کی طرف بھی چلیں گے۔ اب تو بہتر ہے نا تمہاری طبیعت؟“

”ہوں۔“ وہ بے دلی سے بولی۔

”میرے بعد دوا باقاعدگی سے لیتی رہنا۔ یہ موسم بدلنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اپنا بہت خیال رکھنا میرے لیے،

میری خاطر ٹھیک ہے نا۔؟“

اس نے اس کی براؤن آنکھوں میں جھانکا، جن میں نمکین پانی تیر رہا تھا۔ رہبر نے اس کے ہاتھ پر اپنے ہونٹ رکھ

دیئے ایک کرنٹ سا اس کے رگ و پے میں دوڑ گیا۔

”آئی لوو فضا! بیلولی آئی ریلی لوو۔“ کہہ کر اس نے فضا کے ہاتھ چھوڑ دیا، اس کا ہاتھ جیسے برف میں ڈھل گیا تھا،

اور پورے جسم میں جیسے آگ کی چنگاریاں سی پھوٹنے لگی تھیں۔

”میں اب چلتا ہوں، پیلا میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اپنا خیال رکھنا، شام کو ڈاکٹر کی طرف چلیں گے تم تیار رہنا،

اوکے خدا حافظ۔“

”خدا حافظ!“ اس کے لب دھیرے سے کپکپائے۔ وہ اسے دیکھتا ہوا پلٹ گیا۔ وہ کتنی دیر تک درخت کے تنے

سے ٹیک لگائے، اس کے نقش پا کو دل میں اتار لی رہی۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔

آج سورج نہیں نکلا تھا۔ فک ہوا چل رہی تھی آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے شام تک بادل گہرے ہو گئے اور پھر بارش شروع ہو گئی پہلے ہلکی پھر تیز شام ڈھل گئی مگر بارش نہ رکی۔
”رات کو ڈاکٹر کی طرف چلیں گے ذرا بارش سہم جائے۔“ وہ کچن میں کام کر رہی تھی جب رہبر اس سے کہہ کر گیا۔

رات تک بارش واقعی مدھم ہو گئی۔ اس نے ٹائم دیکھا۔ ”ابھی تو صرف ساڑھے سات ہوئے ہیں۔“ اس نے جلدی جلدی کپڑے نکال کر تبدیل کیے اور کوارٹر کا دروازہ بند کر کے انیکسی کی طرف چل پڑی۔
انیکسی کا دروازہ کھلا ہوا تھا رہبر کے کمرے سے اس کے پیچ کی آواز آرہی تھی۔ پہلے اس کا جی چاہا کہ واپس پلٹ جائے مگر پھر بونٹی دروازے کی طرف بڑھ آئی۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہاں آکر تمہارا دماغ یوں پلٹے گا۔ میں نے تمہیں کس مقصد کے لیے ادھر بھیجا تھا۔ اور تم کن خرافات میں پڑ گئے۔ کس قدر شرمندہ کروایا تم نے آج نرس کے سامنے مجھے۔“ وہ گرج رہے تھے۔
”کیوں؟ آپ کیوں شرمندہ ہوئے نرس آنی کے سامنے؟“ رہبر کی آواز سننے لگی۔
”میں نے سارے کے لیے بات کی تو وہ کہنے لگی ”پہلے اپنے بیٹے سے تو پوچھ لو کہ وہ تو اس سچ ذات کے پیچھے خوار ہو رہا ہے اور میری بیٹی کوئی فالتو نہیں ہے۔“

”ان کی اپنی ذات کیا آسمانوں سے اتری ہے اور مجھے اس میں کوئی شرمندگی نہیں کہ میں فضا سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور میں آپ سے یہی بات کرنا چاہتا تھا! اچھا ہوا آپ نے خود ہی یہ ذکر چھیڑ دیا۔“
رہبر کا لہجہ اطمینان بھرا تھا۔

”اور تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہاری اس احمقانہ بات پر لبیک کہوں گا۔ تم ایک بات کان کھول کر سن لو تمہاری شادی صرف اور صرف سارے ہوگی۔ یہ بات آج سے نہیں برسوں پہلے سے طے ہے۔ میں امریکہ جانے سے پہلے نرس سے وعدہ کر کے گیا تھا۔ یہ وعدہ صرف میں نے نہیں تمہاری مٹی نے بھی کیا تھا۔ وہ اسی لیے پاکستان آنا چاہ رہی تھیں کہ آکر منگنی کی رسم ادا کر دیں۔ چار ماہ بعد ہمارا شادی کا ارادہ ہے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ تم کسی اور ہی کھیل میں پڑ گئے ہو۔“

ان کا لہجہ حد درجے غصیلانہ تھا۔
”یہاں کھیل ہو گا یہ آپ کے لیے نہیں سیریس ہوں اور آپ بھی یہ بات سن لیں کہ میں فضا کے علاوہ اور کسی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا اور وہ سارے ٹک چڑھی۔ مغرور اور دولت مند لڑکی وہ تو کبھی بھی نہیں۔ اور وعدہ آپ نے اور مٹی نے مجھ سے پوچھ کر نہیں کیا تھا۔ میں بالغ ہوں۔ سمجھدار ہوں اپنے فیصلے خود کرنا جانتا ہوں اور اس معاملے میں کسی کی رائے نہیں سنوں گا۔ چاہے جو مرضی ہو جائے۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں بولا۔
”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اس لڑکی میں ہے کیا نہ اس کا آگاہ پیچھا خدا جانے کون ہے۔ کون نہیں۔ ہمیں اپنی نسل خراب نہیں کرنی۔“ ان کا لہجہ تو ہن آمیز تھا۔

”یہاں آپ کو کسی کے بارے میں ایسے عجیب و غریب خیال رکھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ جو کچھ بھی ہے میرے لیے سب سے بڑھ کر ہے۔“ اس کی آواز بہت بلند تھی۔
”میرے بچے! تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں اور تمہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ جس کے لیے تم مرے جا رہے ہو اس کی خود زندگی کا کچھ مجھ کو سنا نہیں۔ تم ڈاکٹر نقوی کے پاس گئے تھے اسے لے کر اور غالباً ”ٹیسٹ رپورٹس“ لانا بھول گئے جو آج آتے ہوئے اس نے مجھے تمہاری۔“

”فضہ کا دل ان کی بات پر زور زور سے دھڑکنے لگا۔

”ہاں مجھے جانا تھا رپورٹس لینے۔“ اندر سے کسی لفافے کے کھولنے کی آواز آئی۔

”ان کو کھولو اور غور سے پڑھو۔ اس لڑکی کوئی بی بی ہے۔ بہت پرانی اور اس سے بھی زیادہ ملک بلڈ کینسر ہے۔ اب بولو کیا اب بھی تم اس سے شادی کرو گے۔“

ان کی آواز نے جیسے اس کے نزدیک ہی کہیں بم پھوڑے۔ وہ خوف سے لرزنے لگی۔ کتنی دیر گزر گئی۔ رہبر کی کوئی آواز نہ آئی شاید وہ رپورٹس پڑھ رہا تھا اس کے کان اس کی آواز سننے کے لیے شدت سے منتظر تھے۔

”یہاں! میں سونا چاہتا ہوں مجھے نیند آرہی ہے۔“ اس کے ان دو جملوں نے اس کے بدن سے جیسے ساری جان کھینچ لی۔

”نچک ہے۔ تم آرام کرو صبح بات ہوگی۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

وہ خود کو گھسیٹتی ہوئی کوارٹر تک آئی باہر بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر بے رحم آسمان کی طرف دیکھا۔

”کیا میرے لیے کہیں بھی دو گھونٹ دو قطرے دو بوندیں خوشی کی نہیں۔؟“

چھما چھم برستی بوندوں میں بجھتے ہوئے اس نے بے حد افسردگی سے سوچا۔

”نہیں۔“ کوئی بادلوں کی اوٹ سے بولا۔

وہ کتنی دیر کھڑی بارش میں بھیگتی اس ”نہیں“ کا جواز دھونڈتی رہی۔ لیکن تقدیر کے لکھے کا کوئی جواز کوئی سبب نہیں ہوا کرتا یہ تو بس لکھا ہوتا ہے جو پورا ہونا ہوتا ہے۔

تو پھر یہ خواب یہ سراب کیوں؟ بارشیں برسا کر اندر صحرا کیوں بھڑکائے جاتے ہیں۔ ان صحراؤں کی پیاس کس

بارش سے بجھے گی۔ شاید کسی سے بھی نہیں۔ مجھے اسی صحرا میں جھلس کر ختم ہو جانا ہے ہاں یہی کھا ہے میرے

کاتب تقدیر نے جسے کوئی بارش کوئی پانی مٹا نہیں سکتا۔

اور جو تقدیر سے صلح کر لیتا ہے پھر وہ کسی سے نہیں لڑتا۔ نہ زندگی سے نہ زندگی دینے والے سے نہ لینے والے سے۔

”ہاں مجھے بھی تقدیر سے صلح کر لینی چاہیے کہ اب لڑائی کا کچھ فائدہ نہیں۔ میں ہر محاذ پر پسپا ہو چکی ہوں۔

مزاہمت کا کچھ فائدہ نہیں جان تو اب دینی ہی ہے۔ ہتھیار اٹھائے رہنے سے فائدہ۔“

وہ ٹوٹے ہوئے قدموں سے کوارٹر کا دروازہ کھول کر اس قبر جیسی پناہ گاہ میں داخل ہوئی اور گیلے کپڑوں سمیت

چارپائی پر لیٹ گئی۔



ولید کو کسی پرائیویٹ ادارے میں ملازمت مل گئی تھی۔ اس کے بلند وبالا خوابوں کے برعکس صرف پانچ ہزار ماہانہ پر اس کے سارے خواب جیسے منہ کے بل آگے تھے۔ مگر گھر کے حالات دیکھتے ہوئے اسے یہ سب بھی غنیمت لگا تھا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا تھا ابراہیم بھائی کے جانے کے بعد گھر جیسے قبرستان بن گیا تھا۔ گھر کے چاروں افراد ایک دو سرے سے نظریں چرائے پھرتے تھے۔ تایا جی رشتا زو ہو چکے تھے۔ تائی جی کے گھٹنوں کا درد بے حد بڑھ گیا تھا۔ انہوں نے بستر سنبھال لیا تھا۔ گھر کی پوری ذمہ داری ایمین کے سر آرہی تھی۔ وہ روز جو زکوٰۃ کر کے کبھی دال پکا لیتی تو کبھی بھجیا اور اب تو صرف تایا جی کی سیشن کا آسرا تھا۔ وہ اپنے گریجویٹ فنڈ میں سے بہت سی رقم ابراہیم بھائی کی

شادی پر نکلوا چکے تھے۔ اب جو برائے نام رقم ملی تھی وہ انہوں نے بینک میں رکھوا دی تھی۔ گھر کی گاڑی تو جیسے تیسے چل ہی رہی تھی۔ مائی جی کی داؤدوں کا خرچ نہیں نکل رہا تھا۔ ایمین کا فاسٹل کا ایڈمیشن جانا تھا اور اس کے پاس داخلہ فیس کے پیسے نہیں تھے۔ پہلے تو مائی جی سب کچھ کسی نہ کسی طرح کر رہی تھیں اب وہ کس سے کتنی ولید سے تو بات کرنے کو اس کا جی نہ چاہتا تھا۔

”یہ کچھ پیسے رکھ لو گھر کے خرچ کے لیے اور امی کی داؤدوں کا نسخہ مجھے دے دو۔ میں لے آتا ہوں۔ دو امیں۔“ وہ ان ہی سوچوں میں پریشان بھیجے ہوئے چولہے کے پاس کھڑی سوچ رہی تھی۔ جب ولید نے پانچ پانچ سو کے چار نوٹ اس کے آگے سلیب پر رکھے وہ پیسے وہیں چھوڑ کر نسخہ لینے اندر چلی گئی۔

”داخلہ فیس جمع کرانے میں صرف چار دن ہیں۔ میں کس سے کہوں۔“ وہ رات اسی پریشانی نے اس کی جان بھائی ہوئی تھی۔ کاش میں داخلہ ہی نہ لیتی۔ اس نے بار بار سوچا۔ ”مایا جی! وہ آپ سے ایک بات کرنی تھی۔“ رات کو انہیں کھانا دیتے ہوئے اس نے جھجک کر کہا۔

”ہاں کہو۔“ انہوں نے سرسری لہجے میں کہا۔
”وہ میرا ایم اے کا ایڈمیشن جانا تھا۔ اس کے لیے فیس نہیں ہے۔“ وہ اٹک اٹک کر بولی۔
”تمہیں کون سے حلیم نے کہا تھا کہ ایم اے میں داخلہ لو۔ اپنی ہماری ملیں چل رہی ہیں تاکہ یہ عیاشیاں کرتے پھریں۔ اس کلاس میں ایم اے کرنا عیاشی کے برابر ہے۔ تم نے کون سا ایم اے کر کے مجسٹریٹ لگ جانا ہے۔ سارے حالات نظر بھی آرہے ہیں پھر بھی جلتی پر تیل گرا رہی ہو۔ یہاں کھانے پینے کے لالے پڑے ہیں نواب زادی کو فیصوں کی سوجھ رہی ہے۔“
برسوں بعد بھی ان کا رویہ اس کے ساتھ اتنا کڑوا تھا کہ اس کا دل چاہا کہ زمین بھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔

وہ دھواں دھواں چہرے لیے باہر آگئی۔

”کیا ہوا ایمین؟“ دروازے میں ہی اسے ولید ٹکرا گیا۔

”کچھ نہیں ہوا تم اپنے کام سے کام رکھا کرو۔“ وہ چیخ کر بولی۔

وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ دوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”ایم اے کا داخلہ بھیجنا ہے۔ فیس مانگ رہی تھی میں نے کہا میں کون سے قارون کے خزانہ بلے بیٹھا ہوں کہاں سے دوں۔“ مایا جی نے ولید کو دیکھ کر ایمین کے چیخنے کی وجہ بتائی۔ ”ابھی تک اس کا بچپنا نہیں گیا۔ ذرا سی بات پر چیخنے لگتی تھی۔“ وہ بوڑھا ہے۔

”اوہ۔“ وہ سوچتا ہوا باہر نکل گیا۔

”دونوں بعد اس نے فیس کے لیے اس کے آگے رکھ دیے وہ روٹیاں پکا رہی تھی۔

”یہ پیسے ہیں تمہاری فیس کے تم فیس جمع کرواؤ۔“ وہ کہتے ہوئے مڑنے لگا۔

”میں ان پیسوں کو آگ میں جھونک دوں گی۔ اٹھا لو اپنی یہ خیرات یہاں سے۔ مجھے نہیں داخلہ بھیجنا۔“ وہ ایک دم مشتعل ہو کر بولی۔

”ناگل ہوئی ہو۔ دو سال ضائع کر دی اپنے۔“ ولید کا انداز صلح جو تھا۔

”ناگل میں یا گل ہوئی ہوئی اس ناگل خانے میں جو گھر میرے چاہے دو سال ضائع ہوں یا دس سال تمہیں اس

سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ مجھے تم سب سے نفرت ہے مطلبی لوگوں سے پکڑو اپنے پیسے۔“

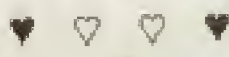
اس نے غصے سے پیسے اٹھا کر اس کے قدموں میں پھینک دیئے۔

”ہاں غراب ہو گیا ہے تمہارا۔ احسان فراموش لڑکی! انہیں لینے تو مت لو۔ فالٹو نہیں ہیں۔“

اسے بھی غصہ آگیا۔ وہ پیسے اٹھا کر باہر نکل گیا۔

اور اس کا دل چاہ رہا تھا اس سارے گھر کو آگ لگا دے یا خود کہیں بھاگ جائے۔

”آخر یہ سزا ختم کیوں نہیں ہوتی۔“ وہ سلیب پر سر رکھ کر زور زور سے رونے لگی۔



ہاتھ	میں	کیسے	تھام	لیتی	خوشی	کا
میرا	درد	سے	رشتہ	بڑا	ہوا	تھا
محبت	اسی	روز	بے	اعتبار	ہوئی	تھا
اس	کا	لہجہ	معنی	سے	کٹا	تھا
جگنو	کہاں	تک	دکھاتے	رستہ	مجھے	تھا
تیرے	جذبے	کا	شعلہ	بجھا	ہوا	تھا
تمام	عمر	سائے	کی	ہمراہی	میں	سفر
میرے	شہر	کا	سوچ	بجھا	ہوا	تھا

رہبر اس سے ملے بغیر حبیب زواری کے ساتھ چلا گیا تھا۔ اگرچہ اس رات ان کی گفتگو سننے کے بعد اس نے شعوری طور پر فیصلہ کیا تھا کہ اب اپنی زندگی سے اس طرح کی ہر خوشی کو نکال پھینکے گی۔ لیکن پھر بھی نامعلوم دل کے کس کونے میں یہ جھوٹی آس چھپ کر بیٹھی ہوئی تھی کہ رہبر اس سے مل کر اپنے وعدوں کی تجدید کر کے جائے گا۔ اس کی اپنی خراب میڈیکل رپورٹس کے باوجود اس سے آکر کے گا۔

”نفسہ! دیکھنا کچھ بھی نہیں ہو گا۔ میں تمہیں اپنے ساتھ امریکہ لے جاؤں گا، وہاں جا کر تمہارا علاج کرواؤں گا۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اب میں تمہیں دوسری بار کھونے نہیں دوں گا۔ میں جو ہوں تم فکر کیوں کرتی ہو۔“

مشقۂ عمود کا منتخب کے حروف
کھانا ہلکے کی مزیدار
ترکیبوں کے
رنگارنگ کتاب
نصف سکہ : ۲۷۰ نصف سکہ کا پی



شائع ہوئی

لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا، اس رات کے لیے کپڑے کام کر گئے۔ وہ اگلا سارا دن بخار میں مدھوش اپنے کونے پر پڑی رہی، ہر اسی شام کی فلائیٹ سے چلا گیا۔ اسے مدھوشی کی حالت میں چھوڑ کر شاید کبھی نہ آنے کے لیے دو دن بعد جب بخار کا زور ٹوٹا تو اسے لگا۔ اس کی خالی اور ویران زندگی اب مزید ویران ہو گئی ہے۔ زندگی میں اس کے آنے سے جو رنگ آئے تھے وہ اس کے جاتے ہی بھک سے اڑ گئے۔ اور اب اس بے رنگ، بے کیف زندگی میں کچھ بھی ایسا نہیں جس کے لیے جینے کی تمنا کی جائے۔ بس خواب، سراب بن گئے تھے، سب آس، امیدیں اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ایک کر کے مر گئی تھیں اور انسان کی تو زندگی ہی عبارت امید سے ہے۔ جب امید اور زندگی ہی نہ رہے تو زندگی کس بات کی۔

اس نے ساری دواؤں کی شیشیاں دیوار پر مار کر توڑ دیں۔ ڈاکٹر کا نسخہ پھاڑ کر پھینک دیا۔ ساری کتابیں اٹھا کر بچے کے نیچے پھینک دیں اور ان کے آگے باہر سے لا کر اینٹوں اور پتھروں کی دیوار سی بنادی۔ رہبر کا دیا ہوا سوٹ موبیل سیٹ لوہے کے رنگ میں سب سے نیچے پھینک کر اوپر پرانے اور بوسیدہ کپڑے رکھ دیئے۔ کئی دنوں سے اس معمول بن گیا تھا۔ صبح اٹھ کر لان سے گلاب کے پھول توڑ کر لاتی اور انہیں اپنی کتابوں کے درمیان پڑے شیشے کے گلدان میں سجا دیتی۔ اس نے وہ گلدان بھی دیوار پر مار کر توڑ دیا۔ کرچیوں، کانڈز کے برزوں سے کوٹھڑی کا سارا زخا گندا ہو گیا۔ کچھ دیر کھڑی وہ اس کھنڈر سے کمرے کو دیکھتی رہی۔ پھر دھڑام سے بستر پر گر پڑی۔
”اگر موت اس طرح سے مل سکتی تو اب تک میں ہزار بار مر چکی ہوتی۔ کاش مجھے کہیں سے زہر مل جائے۔“
اس نے تلخی سے سوچا۔ ایک دم اس کی نظر ہاتھ میں پڑی انگوٹھی پر پڑی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اسے اتار کر پھینکنا چاہا۔

”فرضہ! یہ ہماری محبت کی پہلی گواہ ہے جب تک یہ تمہاری انگلی میں موجود رہے گی۔ تمہیں میری وفا کا یقین دہانے کے لیے رہے گی۔ تم کبھی کسی حال میں مجھ سے بدگمان نہ ہونا، اگر تم نے اسے اتار کر پھینک دیا تو میرے دل سے تمہارا دل کا رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ میری تم سے درخواست ہے کہ کبھی اس رشتے کو نہ توڑنا وعدہ کرو فرضہ!“
اس کی سانس تیز تیز جلنے لگی اور وہ کوشش کے باوجود انگلی سے محبت کی اس جھولی گواہی کو اتار کر نہ پھینک سکی۔
”رہبر! یہ تم نے کیا کیا مجھے کیوں جھوٹے خواب دکھائے، میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ زندگی میں نے تمہارے بگاڑا ہے۔ میری سزا ختم کیوں نہیں ہوتی۔“ وہ روتے روتے چیخنے لگی۔ اس کا گلا خشک ہو گیا۔ ساتھ ہی کھانسی شدید دورہ اٹھا کھانسی اتنی شدید تھی کہ اس کا پورا وجود ہل کر رہ گیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں باہر کو لگیں۔ وہ سینہ پکڑے کھانسی چلی گئی۔ کتنی ہی دیر گزر گئی، اتنی دیر تک کھانسی اسے کبھی نہیں آئی تھی۔ اس پر چکرانے لگا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ کھانستے کھانستے بے حال ہو کر اس نے زمین پر تھوک دیا۔ تھوک کے ساتھ سرخ سرخ خون حلق سے نکلا تھا۔

خون دیکھ کر پانی بھری آنکھوں کے ساتھ اسے عجیب سی خوشی ہوئی۔
”دیکھا، اس زندگی میں مٹی سے بڑھ کر مجھ سے کوئی پیار نہیں کرتا تھا۔ اب جب زندگی کا ہر دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اور موت بھی دور کھڑی ہنس رہی ہے۔ مٹی کا یہ تحفہ مجھے موت سے قریب لے جائے گا۔ اب مجھے زہر کی ضرورت نہیں بس چند ماہ اور۔“

وہ خوشی سے ہنسنے لگی اور پھر ہنسنے چلی گئی۔ ہنسنے ہنسنے اسے پھر کھانسی شروع ہو گئی۔
”اے موت! جلدی! اب میرا زندگی سے کوئی معاملہ باقی نہیں کہ جس کو بچانا ہو بس تیرا انتظار ہے۔ دیکھ کر یہ انتظار کو طویل نہ کرنا۔“
اب میری اس طلب کو تو بس یہ بتانا چاہی کہ جلدی آنا جلدی نہ آنا۔
کھانستے کھانستے خود سے کہنے لگی۔

سادہ سی رسم تھی منگنی کی۔ عبیدہ اور نچ کلر کے کاہنی سوٹ میں بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ مسز حق نے پیشانی چوم کر اس کے ہاتھ میں ڈائمنڈ کی رنگ پرنائی تھی غزالہ آنٹی کی بیٹیاں اور اس کی کچھ دوستیں اسے گھیرے بیٹھی تھیں۔

ایمن تھوڑی دیر پہلے تائی جی کے ساتھ پہنچی تھی۔ مگر اجنبی مہمانوں کی طرح دور بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی اجنبیت اور بیگانگی پر عبیدہ کا دل کٹ رہا تھا۔ اس کی وجہ سے وہ اسے آواز بھی نہیں دے سکتی تھی۔ میڈیکل میں داخلہ نہ لینے کی وجہ سے وہ ابھی تک اس سے خفا تھی اس دن کے بعد وہ آج آئی تھی۔ اس کا فون سن کر انڈینڈ نہ کرتی وہ غزالہ آنٹی کے ساتھ ملنے گئی وہ کمرہ بند کر کے بیٹھ گئی۔ عبیدہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی ناراضی کیسے دور کرے۔

اس نے کئی بار ایمن کو فون کیا کہ اس منگنی کا ایمن سے تذکرہ کرے مگر وہ ہر بار اس کی آواز سن کر فون رکھ دیتی اور آج بھی اسے امید نہیں تھی کہ وہ آئے گی۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے اہم موقع تھا۔ اتنے لوگ پاس تھے مگر جن سے دل کے رشتے جڑے تھے ان میں سے کوئی بھی پاس نہیں تھا۔ اوپر سے سنجیدہ چہرہ بنائے اندر سے اس کا دل درد رہا تھا۔

غزالہ آنٹی نے آگے بڑھ کر اسے پیار کیا تو تائی جی بھی اٹھ کر آئیں وہ سنگدل اسی طرح بے حس بیٹھی رہی۔
 ”ایمی! اٹھو، بسن کے پاس آؤ دیکھو تو کتنی پیاری لگ رہی ہے عبیدہ۔“ غزالہ آنٹی نے اسے پکارا۔
 ”آئی! میں نہیں ٹھیک ہوں۔“ ان کے دوسری دفعہ پکارنے پر وہ بیزار رہی۔
 ”ہوں بری بات، بسن کا دل برا ہو گا۔ اتنی بڑی خوشی ہے اس کی زندگی کی۔ مبارکباد نہیں دو گی اسے۔ بڑی بسن ہو، پیار نہیں کرو گی ماما بایا کی جگہ اسے۔“

غزالہ آنٹی نے پاس آکر اسے گلے سے لگا کر سمجھایا تو اس نے ایک نظر اٹھا کر سر جھکائے بیٹی عبیدہ کو دیکھا۔
 ”دیکھو وہ تمہاری ناراضی پر کتنی افسردہ ہے۔ اس طرح اس کا دل برا نہیں ہو گا، تم تو سمجھدار ہو نا۔ زندگی کی ہر خوشی ملنے کی دعا دو۔ بڑی بسن تو چھوٹوں کی خوشی میں خوش ہوتی ہے اور تم بہت اچھی بڑی بسن ہو، اگر تم اسے پیار نہیں کرو گی تو سوچو تمہارے ماما بایا کیا سوچیں گے۔ آج تو وہ بھی بہت خوش ہوں گے۔ اٹھو میری جان! عبیدہ کے پاس چلتے ہیں۔ آؤ تمہیں عبیدہ کی ساس سے ملو اور بہت اچھی خاتون ہیں۔ تم ان سے ملو گی تو جانو گی۔ خدا انہوں کا بدل کس طرح دیتا ہے۔“

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر عبیدہ کے پاس لے آئیں وہ اس کے پاس کھڑی اسے دیکھتی رہی۔
 ”جھک کر پیار کرو نا، بسن کو۔“ انہوں نے اسے گھر کا۔
 ”عبیدہ!“ وہ ذرا سی جھکی عبیدہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔
 ”ایمی!“ اس کے لب کھپکپائے۔

”رونا نہیں عبیدہ! دیکھو آج خوشی کا موقع ہے رونا نہیں۔“
 اس نے اس کے کان میں سرگوشی کی اور اس سے پمٹ کر اسے مبارکباد دینے لگی۔
 ”ایمی ایسے کرتے ہیں۔“ وہ ہنسی ہنسی آواز میں بولی۔

”بس اب اور کچھ نہیں کہنا۔ عبیدہ! تم بہت پیاری لگ رہی ہو بہت پیاری اللہ نظر دے سے بچائے۔“
 اس نے عبیدہ کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی چوم لی۔
 ”ابھی پیاری کیوں نہیں لگتی میری بیٹی ہے پیاری۔“ مسز حق آگے بڑھ کر بولیں۔

”بیگم حق! یہ ایکی ہے عبیدہ کی بڑی بسن، گراچی میں ہوتی ہے تایا کے پاس، میں نے بتایا تھا نا آپ کو۔“ غزالہ آنٹی نے آگے بڑھ کر تعارف کرایا۔

”ماشاء اللہ بہت پیاری بچی ہے، بسن کی طرح۔ میرے دو بیٹے ہوتے تو میں اسے بھی لے جاتی۔“ وہ ہنس کر اسے پیار کرتے ہوئے بولیں۔

”ہم ابھی زندہ ہیں بیگم صاحبہ! عبیدہ کی طرح ایمن میری بیٹی ہے بالکل ویسی، جیسی آپ کی عبیدہ۔“ تائی جی نے آگے بڑھ کر کہا سب جیسے حیران رہ گئے۔

”اچھا واقعی، یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ دونوں بہنیں ایک ہی شہر میں رہیں گی میری طرف سے پیشگی مبارکباد، کب بلارہی ہیں ہمیں دعوت پر۔“ وہ بھی ہنس کر بولیں۔

”بہت جلد، بس بیٹے کی نوکری کا انتظار تھا۔ وہ بھی ختم ہوا آپ سے پہلے دعوت دوں گی آپ کو۔ انشاء اللہ وہ بھی ڈائریکٹ شادی کی۔“

تائی جی بتائیں کس دھن میں تھیں عبیدہ اور باقی لوگ ایمن کو مسکراتی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور اس کی حالت پتلی ہو رہی تھی۔ تائی جی کے اس انکشاف نے اسے حیران کر دیا تھا۔ کچھ کچھ غصہ بھی آ رہا تھا، دل چاہ رہا تھا انہیں سنائے کہ آپ کے بیٹے کے لیے یتیم خانہ کی بیٹی رہ گئی ہے۔ آپ کے ٹکڑوں پر ملنے والی۔

مگر اس وقت موقع نہیں تھا دوسرے تائی جی اب حالات کے ہاتھوں اتنی ضرورتیں گھاچکی تھیں کہ وہ خود بھی ان کا دل دکھانا نہیں چاہتی تھی۔

”بس ابھی اب عبیدہ آپ لوگوں کے پاس ممان ہے۔ ایک دو سالوں کی۔ پھر میں اپنی بیٹی کو اپنے گھر لے جاؤں گی۔“ مسز حق عبیدہ کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے بولیں۔

”کیوں نہیں بسن! یہ آپ ہی کی امانت ہے۔“

غزالہ آنٹی نے کہا تو ایمن نے عبیدہ کے شرماے شرماے روپ کو آنکھوں میں سموتے ہوئے اس کے خوبصورت مستقبل کی دعا کی۔

♥ ♥ ♥ ♥
 در قفس سے پرے جب صبا گزرتی ہے
 کسے خبر کہ اسیروں پہ کیا گزرتی ہے
 یہ اہل ہجر کی بستی ہے احتیاط سے چل
 مقصبتوں کی یہاں اتنا گزرتی ہے
 بھنور سے بچ تو گئیں کشتیاں مگر اب نے
 دلوں کی خیر کہ موج بلا گزرتی ہے
 نہ پوچھ اپنی اتنا کی بغاوتیں محسن
 در قبول سے بچ کر دعا گزرتی ہے

اس کی صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی، مئی کی طرح اب اسے کھانسی ساری ساری رات نہ سونے دیتی جب کھانسی کے شدید دورے کا اختتام سرخ لہو کی صورت ہوتا تو اسے عجیب سی طمانیت محسوس ہوتی۔ اس نے کوئی نئی کمرہ بنانا بالکل ترک کر دیا تھا۔ کھانے پینے کی خواہش دل سے مر گئی تھی۔ زیادہ سے زیادہ کہیں دن میں اٹھ کر باہر نیم کے درخت تلے جا کر کھڑی ہو جاتی۔ وہ جگہ اس کی تکلیف کو اور برعکاس دیتی۔ یادیں اسے ڈسنے لگتیں۔ وہاں کی خاموش فضا میں یکدم بولنے لگتیں۔ جھوٹے وعدے، جھوٹی قسمیں اس کی رگوں کو چیرنے لگتیں۔ جب شورنا قاتل

برداشت ہو جاتا۔ وہ واپس کو اتر میں بھاگ آتی۔

اور اب تو کئی دنوں سے کمزوری کی وجہ سے اس سے چند قدم چلنا دشوار ہو گیا تھا وہ کو اتر کی سیڑھیوں میں جا کر بیٹھ جاتی۔ سر اٹھا کر اوپر تے بے حس آسمان کو سپاٹ نظروں سے لگتی رہتی۔ جیسے اسے کسی اشارے کی تلاش ہو۔
کا انتظار تھا۔ اب تو یہ انتظار اس کی آنکھوں میں وحشت بن کر ناپنے لگا تھا۔ کئی کئی روز گزر جاتے اسے کسی ذی روح سے ہم کلام ہوئے شریفانِ دن میں ایک بار آکر کھانا دے جاتی۔ وہ دو چار لمبے کھا کر باقی وہیں بڑا رہنے دیتی۔ کبھی کبھار عبدل چاچا اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا کہتا وہ چپ چاپ بیٹھی رہتی اس کا جسم ہڈیوں کا بیجر بن جاتا جا رہا تھا۔ براؤن کشادہ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بن گئے تھے۔ بال سارے اترتے جا رہے تھے۔ ہاتھ جھریوں سے بھر گئے تھے اور رنگ زرد اور سیاہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے کئی مہینوں سے آئینہ نہیں دیکھا تھا۔ اس روز جنون میں اس نے گلدان اٹھا کر دیوار سے لگے آئینے پر ہی دے مارا تھا۔ کئی دن بعد اگر شریفان نے کو اتر کی صفائی کی تھی اس دوران کالج کے کٹڑوں پر چل کر اس نے دو تین بار اپنے پاؤں زخم کیے تھے۔ خود اترتی میں جیسے اسے مزہ آ رہا تھا۔ عاکف پچا کی شکل دیکھے اسے مہینے گزر گئے تھے۔ شروع میں وہ اکثر آجاتے تھے۔ ایک آدھ دفعہ زبردستی ڈاکٹر سے دوا بھی منگوا کر دی اسے اندر چل کر رہنے کو کہتے۔ وہ بے توجہی سے ان کی باتیں سنتی رہتی۔ پھر انہوں نے بھی آنا چھوڑ دیا۔ دو تین دفعہ اسے زنگس آئی نے بلوا بھیجا۔ وہ نہ گئی اور اب تو اسے کسی کو بھی دیکھنے سننے کا ارمان نہ رہا تھا۔ سب کچھ رفتہ رفتہ اسے بھوتا جا رہا تھا۔ کراچی، ممبایا، آبی، عبیدہ آبی، مومن اسے کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔

موسم ایک بار پھر بدلتا شروع ہو گیا تھا۔ گرمیوں کے طویل دن گھٹنا شروع ہو گئے تھے۔ برسات کا موسم اپنے عروج پر تھا اور اس سال تو خوب زوریوں کی بارشیں ہو رہی تھیں۔ وہ کھڑکی میں کھڑی ہو کر ان بارشوں کو تڑپ تڑپ کر برستے دیکھتی پھر تھک کر چارپائی پر آگرتی اور باہر پرستی بوندوں کی آوازیں سنتی رہتی۔
اندر کو بھی میں آج کل جیسے بہار اتری ہوئی تھی۔ شریفان نے بتایا تھا اسے کہ "سارہ بی بی کا پچھلے ہفتے فون پر امریکہ میں رہ رہی زبانی سے نکاح ہو گیا ہے۔ اور اب نومبر دسمبر میں امریکہ جا کر ہی رخصتی ہوگی یا پھر ہو سکتا ہے وہ لوگ ادھر آجائیں۔ آج کل بیگم صاحبہ اور چھوٹی بی بی دھڑا دھڑا شاپنگ کر رہی ہیں، کبھی سنگا پور تو کبھی یاگک گانگ ایسی ایسی غصب کی چیزیں خرید کر لا رہی ہیں کہ آنکھوں پر یقین نہیں آتا کہ یہ چیزیں اس زمین سے تعلق رکھتی ہیں۔"

وہ پتھر بنی سب کچھ سنتی رہی۔ اس رات اس کا جنون جیسے پھر تازہ ہوا تھا اس نے بیچی کبھی چیزیں اٹھا اٹھا کر دیواروں پر ماری تھیں۔ میز کے نیچے کتابوں کے آگے چنی اینٹوں اور پتھروں کی دیوار کو اکھاڑ کر پتھر دیواروں پر زور زور سے مارے تھے۔ کھانے کے برتن توڑ دئے تھے۔ کوٹھڑی میں جتنا اکلوتا سا ٹھہ والٹ کا بلب پتھر مار کر توڑ دیا تھا اور پھر گھپ اندھیرے میں نیچے زمین پر بیٹھ کر وہ صبح تک روتی رہی تھی۔

اس جنون کی قیمت اسے کئی دن بستر بخار کی صورت میں پھنک کر ادا کرنا پڑی تھی۔ خون اگل اگل کر اس کا دم منہ کو آنے لگا تھا۔ اب تو شریفان بھی صرف خوفِ خدا کی وجہ سے منہ پر کپڑا باندھ کر صفائی کرنے یا اسے کھانا دینے آتی تھی۔
اکتوبر گزر گیا۔ بارشوں کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ اب تو بس بادل آتے گرجتے اور ہوا کے ساتھ اڑ جاتے۔ رات کو ہوا میں خنکی آگئی تھی۔ دنوں کی طوالت سڑک گزرات میں سلنے لگی تھی۔ اس میں اب کھڑکی میں کھڑے ہونے کی بھی طاقت نہیں رہی تھی۔ بس بستر پر کھڑے کھڑکی سے باہر اڑتے بادلوں اور دھوپ کے تعاقب کو پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتی رہتی۔

"اگلے مہینے سارہ بی بی کی رخصتی ہے۔ رہبر میاں اور ان کے ای ابا ادھر آرہے ہیں۔ یہیں سے رخصتی ہوگی۔ امریکہ جائیں گے وہ بی بی کو لے کر اب تو جی مجھے ادھر آنے کا بھی وقت نہیں ملتا۔ کام ہی اتنا بڑھ گیا ہے ایک مہینے کی تو تارخ پڑتی ہے۔ دن ہی کتنے ہیں۔" وہ خود ہی خود بولتی جا رہی تھی۔
سارے پتے پہلے زرد ہو کر درختوں سے گرنے لگے تھے ٹنڈ منڈ سے درخت اور سرسئی فضا اس کے اندر غبار سا پیدا کر دیتے۔

"میرے اللہ اس دن سے پہلے میری سن لینا۔ مجھے اپنے پاس بلا لینا۔ اس دن سے پہلے کوئی تو میری بھی خواہش پوری کر دینا۔" ذوقی ابھرتی دھڑکنوں نے دعا کی۔

ولید کا رویہ اس کے ساتھ بہت اچھا ہو گیا تھا۔ اس نے پارٹ ٹائم جاب بھی کر لی تھی۔ اس نے بعد میں دوبارہ ایمین سے اصرار کیا کہ وہ داخلہ بجھوائے مگر اس نے سختی سے انکار کر دیا۔ اس کے باوجود اس کی نظر کرم ایمین پر بڑھتی جا رہی تھی۔ حالانکہ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن ایمین کی چھٹی جس اسے ان نظروں کا مفہوم سمجھا چکی تھی وہ اب ولید سے بدکنے لگی تھی۔ جیسے ہی اس کے آفس سے آنے کا ٹائم ہوتا۔ وہ کہیں نہ کہیں روپوش ہو جاتی۔ نماز کی نیت باندھ کر کھڑی ہو جاتی و اش روم میں بند ہو جاتی۔

اس گھر میں اس نے اپنی زندگی کے اٹھارہ سال گزارے تھے۔ لیکن یہاں کے رویے اس کی سمجھ میں نہیں آئے تھے۔ جب بچپن میں اس کا دل چاہتا کہ ولید اس کے ساتھ کھیلے۔ اس کے دکھ بانٹے تو وہ اس کا مسخر اڑاتا تھا۔ اس پر طر کے تیر چلا آتا تھا۔ تائی جی اور مایا جی سے اس کی شکایتیں لگا کر اس کی پٹائی کروا آتا تھا اور اب جب اسے خود سنگ جینے کی عادت ہو چلی تھی۔ وہ اس کی اس سنگت کو توڑنے چلا آیا تھا اسے اس کی موجودگی سے گھبراہٹ ہونے لگتی۔
"ایمین! میں کب سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔ پتا نہیں تم کہاں غائب ہو جاتی ہو۔" وہ پچھلے صحن میں تائی جی کے کپڑوں کو دانہ ڈال کر میڑھیوں میں بیٹھی اسی کے متعلق سوچ رہی تھی۔ جب وہ اچانک اس کے سامنے آکر بولا تو وہ اچھل بی پڑی۔

"ک۔۔ کیوں مجھ سے کیا کام تھا؟" وہ پھلکا گئی۔
"ظاہر ہے کوئی کام ہی تھا تو ڈھونڈ رہا تھا۔" وہ کچھ اکتا کر بولا۔ "میرے سر میں بہت درد ہے۔ ایک کپ چائے تو پلاؤ۔"

"اچھا! وہ فوراً مڑنے لگی اس نے ایک دم اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"ایمین! میری بات سنو۔" ایمین کو شدید شاک لگا تھا۔
اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ جھڑ لیا۔ "یہ کیا حرکت ہے۔" وہ غصے سے بولی۔
"تم مجھ سے کترانے کیوں لگی ہو یہاں جاتا ہوں وہاں سے بھاگ جاتی ہو۔"
وہ اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔
"ایسی تو کوئی بات نہیں میں بھلا کیوں بھاگنے لگی۔" وہ نظریں چرا کر بولی۔
"تم نہ مانو بہر حال یہی بات ہے۔ اچھا ذرا بیٹھ کر میری بات سنو۔" وہ پھر ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھانے لگا وہ بدک کر بیٹھ گئی۔

"ایمین! میں کوئی رویہ منک بند نہیں ہوں ذرا پریکٹیکل قسم کا اور تھوڑا سا بد لحاظ ہوں۔ تم تو مجھے سمجھتی ہو نا؟"
اس نے اچھ کر اسے دیکھا۔
"گھر کی حالت تمہارے سامنے ہے اس گھر کو اب صرف تم سنبھال دے سکتی ہو۔ تم سمجھ رہی ہو نا؟" وہ روتی روتی

بولا اس نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔

”مجھے بہت باتیں نہیں آتیں۔ بس مجھے تم سے اتنا کہنا ہے کہ اس گھر کو سہارا دینے میں میرا ساتھ دو مجھے تمہارے ساتھ کی ضرورت ہے۔“

اب اس کی بات اس قدر مبہم بھی نہ تھی کہ بالکل اس کے سر کے اوپر سے گزر جاتی۔

”میں نے امی ابو سے بھی بات کر لی ہے ان دونوں کی بھی یہی خواہش ہے۔“ وہ اس کی خاموشی کو شاید رضامندی سمجھ رہا تھا۔

”مسٹر ولید! آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ کو معلوم نہیں شاید کہ میں ایک یتیم ویسیر بے مایہ سی لڑکی ہوں اور یہ اس گھر کی روایت نہیں کہ یتیموں کو اٹھا کر سرداری دے دی جائے اور اگر ایسا ہوتا تو بھی میں آپ کا ساتھ قبول نہ کرتی۔ تمہارے دیے ہوئے زخم میرے دل میں ابھی بھی تازہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں نا کہ تلوار کا زخم بھر جاتا ہے مگر زبان کے زخم نہیں بھرتے میں تمہارا ہتک آمیز رویہ تمام عمر نہیں بھول سکوں گی اور جس کو انسان بھول نہ سکے اس معاملے میں پھر اسے کوئی بھول نہیں کرنا چاہیے۔“

اس کا لہجہ سخت اور بے لچک تھا۔

”۲۰! پہلی بات تو یہ کہ وہ میری نا سمجھی کا دور تھا جس پر میں شرمندہ ہوں۔ اور مجھے میرے ان رویوں پر کسی نے ٹوکا بھی نہیں۔ یہ کام تو والدین کا ہوتا ہے اور سمجھ آنے کے بعد سے اب تک اگر تم چاہو تو اپنے ان رویوں کی میں تم سے معافی بھی مانگ سکتا ہوں اور اس وقت میرا دل کرتا تھا کہ تم میرے ان ناروا رویوں پر مجھ سے لڑو تم ناروا شروع کر دیتیں۔ میں اور چڑ جاتا۔ بہر حال بچوں کی کیا سائیکس ہوتی ہے۔ پھر بھی میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔“

وہ گئی یتیم ویسیر ہونے کی بات اور بے مایہ ہونے کی تو تم یوں کہو کہ میں کون سا صاحب ثروت مالدار ہوں۔ ہاں! تمہارے معیار پر میں اس لحاظ سے پورا نہیں اترتا کہ میں تمہیں آئندہ کوئی بہت حسین لکڑی زندگی نہیں دے سکتا۔ یہی گھر ہے اور اس کے مسائل ہیں۔ یہی افراد ہیں جس کے ساتھ شاید تم رہنا پسند نہ کرو۔ بہر حال یہ تمہاری اپنی مرضی ہے۔ میں نے تمہارے سامنے ایک تجویز رکھی ہے۔ جو میرے دل کی خوشی اور خواہش بھی ہے۔ اگر تمہیں پسند ہو تو مان لیتا۔ ورنہ کوئی زبردستی نہیں۔ چائے امی کے کمرے میں لے آنا۔ میں وہیں ہوں۔“

وہ کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا واپس مڑ گیا۔ وہ شش و پنج میں کھڑی اسے جاتا دیکھتی رہی۔

”خیر!“ اس تجویز پر غور کرنے کا اس کا بہر حال کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ سر جھٹک کر چائے بنانے چل دی۔

ان ہی دنوں تائی جی کے بھانجے کی لاہور میں شادی آگئی۔ تائی جی کو جوڑوں کے درد نے عاجز کر رکھا تھا اور جگہ ایسی بھی نہیں تھی کہ چھوڑی جاسکتی آخر ان کی بہن کے بیٹے کا معاملہ تھا۔ انہوں نے تیاری شروع کر دی۔

”تائی جی! مجھے بھی جانا ہے؟“ ان کا صندوق کھولتے ہوئے اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”ہاں تو تمہارے بغیر میں جاسکتی ہوں۔ اٹھا بیٹھا مجھ سے نہیں جاتا تمہارے سہارے کے بغیر وہ ولید بھی کہہ رہا تھا کہ اسے بھی دفتر سے ان دنوں چھٹی ہے۔ ایک دو چھٹیاں اور کر لے گا۔ سب چلیں گے اتنے دنوں بعد تو کوئی خوشی کا موقع آیا ہے۔“ انہوں نے جواب دیا تو اس کا دل خوش ہو گیا۔

(آخری قسط آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

UrduPhoto.com

UrduPhoto.com

UrduPhoto.com



عبیرہ کالج سے نکل کر پوائنٹ کی تلاش میں کھڑی تھی۔

”عبیرہ! عبیرہ! بیٹا“ کسی نے اسے گاڑی میں سے پکارا تو اس نے چونک کر دیکھا۔ آف وہاسٹ سوٹ میں ہم رنگ دوپٹہ اوڑھے مسز حق اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ کچھ جھجک سی گئی۔ ”بیٹا مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔ پلیز کچھ دیر کے لیے میرے ساتھ آئیں گی۔“ ان کا لہجہ ان کی طرح شائستہ اور مہذب تھا۔ وہ انکار نہیں کر سکی۔ ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

”یہاں تو بڑا رش ہے ڈرائیور گاڑی آگے لے جاؤ۔“ وہ ڈرائیور سے بولیں۔

”بس یہیں سائیڈ پر روک دو۔“ کالج کی باؤنڈری وال ختم ہوتے ہی وہ دوسری تیسری کوٹھی کے درمیان گاڑی رکوا کر بولیں۔ ڈرائیور گاڑی روک کر دروازہ کھول کر باہر چلا گیا اور کچھ دور درخت کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا۔

”بیٹا! یہ تو آپ جانتی ہی ہیں کہ میں آپ میں کیوں انٹرسٹڈ ہوں۔“ انہوں نے تمہید باندھی۔ ”اگر اس معاملے میں میں تمہاری رائے پوچھوں تو تم کیا کہو گی۔“

”وہی جو غزالہ آنٹی آپ سے کہیں گی۔“ وہ فوراً بولی۔

”ہوں اچھی بات ہے اچھی اور نیک بیٹیاں ایسے ہی کہتی ہیں۔ خیر یہ تو آپ کو بھی معلوم ہے کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔ وہ مان نہیں رہیں اس رشتے پر۔ میری ہزار کوشش کے باوجود مجھے آپ سے صرف یہ پوچھنا تھا کہ اگر آپ کے تسلسلے میں بات کرنی ہو تو آپ کی غزالہ آنٹی کے علاوہ اور کس سے بات کی جاسکتی ہے؟“

”ان ہی سے۔“ وہ اسی لہجے میں بولی۔

”پھر بھی بیٹا! ان کے علاوہ کوئی اور بڑا۔۔۔ آپ کی دوسری سسٹرز اور بھائی کس کے پاس رہتے ہیں؟“

”میری بڑی سسٹر میرے تایا جان کے پاس کراچی میں رہتی ہیں۔“

”آپ مجھے ان کا ایڈریس دیں گی۔“

”یہ اچھا نہیں لگتا۔ غزالہ آنٹی کیا سوچیں گی۔“ وہ انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔

”میں آپ کا نام بیچ میں نہیں آنے دوں گی۔ بس آپ مجھے ان کا ایڈریس دے دیں بیٹا! میں کوئی غلط کام نہیں کرنا

چاہتی ایک نیک کام جائز اور باعزت طریقے سے کرنا چاہ رہی ہوں اور یہ میرا حق بھی ہے اس پر اپنے تایا کا ایڈریس

”ہاں تو میں تمہارے بغیر جاسکتی ہوں۔ ولید بھی کہہ رہا تھا کہ اس کی بھی دفتر سے ان دنوں چھٹیاں ہیں ایک دو چھٹیاں اور لے لے گا سب چلیں گے اتنے دنوں بعد تو کوئی خوشی کا موقع آیا ہے۔“

انہوں نے جواب دیا تو اس کا دل خوش ہو گیا۔ شاوی کی خوشی کس کو بھی اسے توفیق سے ملنے کا شوق تھا۔

”تائی جی! میں فضہ کو کچھ دنوں کے لیے ادھر لے آؤں؟“ اس نے دوسری فرمائش جڑی۔

تائی جی نے غور سے اس کے چہرے کے بدلنے پر نگاہیں ڈالیں۔

”ہاں لے آنا، بچی تھوڑا خوش ہو لے گی اگر۔ عائف نے اچھا اسے قید کیا ہوا ہے۔“ وہ بھی اچھے موڈ میں تھیں۔

وہ انگلیوں پر گن گن کر دن گزارنے لگی۔

شام کی ٹرین سے انہیں کراچی سے لاہور جانا تھا۔ اسے تو ساری رات نیند نہیں آئی تھی تیاری اس نے رات ہی مکمل کر لی تھی۔ اب بھی صبح اٹھ کر اس نے نماز پڑھی، نماز پڑھ کر وہ باہر نکل آئی۔ تائی جی اور تائی جی کے کمروں میں جھانکا وہ دونوں اٹھ چکے تھے وہ پچھلے صحن کی طرف نکل آئی کہ تائی جی کے کمروں کو دانہ ڈال دے۔

جیسے ہی اس نے صحن میں قدم رکھا، کمروں کے دروازے کو دیکھتے ہی اس کی چیخ نکل گئی۔

بلی اپنا کام کر گئی تھی۔

ایک گوبر اپنے ہی خون میں ڈوبا مردہ پڑا تھا اور باقی تینوں کبوتر زخمی حالت میں تڑپ رہے تھے۔

اس کی چیخ کی آواز سن کر تائی جی جلدی سے آگئے وہ بچن کی طرف ہی جا رہے تھے چائے کا کہنے کہ اس کی چیخ سن کر ادھر آگئے۔

”کیا ہوا؟“ ایمن کیا ہوا؟“ وہ ان کو دیکھ کر اور چیخنے لگی۔

”تائی جی! تائی جی! دیکھیں کبوتروں کی حالت رات تک اچھے بھلے تھے۔“

وہ بتائیں کیوں زور زور سے رونے لگی تھی۔

”ایمن! ایمن! کیا ہو گیا ہے۔ کہیں دروازے کھلے رہ گئے ہوں گے زرات کو بلی کو موقع مل گیا تم حوصلہ کرو۔ بچوں کی طرح رونے لگیں۔“

وہ قریب آ کر اسے ساتھ لگا کر بولے وہ روتی تھی۔

تھوڑی دیر میں تائی جی اور ولید بھی آگئے اس کی کبوتروں کی وجہ سے یہ حالت دیکھ کر ولید تو ہنسنے ہی لگا۔

”تو بے ادبی! چڑیا جتنا دل سے اس کا بھلا کوئی کسی جانور کو مردہ دیکھ کر ایسے بھی روتا ہے۔“

”چلو ایمن! تم اندر۔ ڈر گئی ہے! اتنا منہ اندھیرے ادھر آنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔“ تائی جی نے اسے ساتھ لگا کر ذرا خفگی سے کہا۔

اس کے آنسو نہیں ٹھہر رہے تھے، شام تک اس کی طبیعت بوجھل رہی۔ بہر حال ٹرین کا سفر شروع ہونے پر اس کا دھیان صبح والے واقعے سے کچھ ہٹ گیا لیکن دل کی اداسی نہ گئی اسے اپنی کیفیت خود سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس کی طبیعت میں اسے فضا سے ملنے کی خوشی بھی بھول گئی تھی۔ ”چتا نہیں کیا ہوا ہے مجھے۔“

اس نے جھرا کر کھڑی سے باہر دیکھے ہوئے سوچا۔

اس کی طبیعت میں اسے فضا سے ملنے کی خوشی بھی بھول گئی تھی۔ ”چتا نہیں کیا ہوا ہے مجھے۔“

اس نے جھرا کر کھڑی سے باہر دیکھے ہوئے سوچا۔

اس کی طبیعت میں اسے فضا سے ملنے کی خوشی بھی بھول گئی تھی۔ ”چتا نہیں کیا ہوا ہے مجھے۔“

سے پہلے کوئی نہیں اٹھا۔ وہ دس بجے سے اٹھ کر پیر جلی بلی کی طرح اندر باہر پھر رہی تھی خدا جانے تائی جی کدھر گئے ہوئے تھے ولید بھی نظر نہیں آ رہا تھا اور تائی جی سے تو کچھ کہنا ہی فضول تھا ان کی اپنی طبیعت ٹھیک نہیں تھی شام گئے اسے تائی جی باہر جاتے نظر آئے وہ بھاگ کر ان کے پاس پہنچی۔

”تائی جی! تائی جی! آپ صبح سے کہاں تھے میں صبح سے آپ کو دیکھ رہی تھی۔“ وہ بے قراری سے بولی۔

”بیٹا! باہر کچھ کام تھا دو سرے مدت بعد تو رشتہ داروں سے ملاقات ہوئی ہے ویسے بھی بارہ بجے تو سو کر اٹھا ہوں کیوں تمہیں کوئی کام تھا۔“

اندر باہر رات کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

”جی وہ فضا کی طرف۔ آپ کو بتا تو ہے۔“ وہ انگلیاں چٹکا کر بولی۔

”ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ پر اس وقت تو اچھا نہیں لگتا اب بار بار اتنا روانہ ہونے والی ہے انشاء اللہ کل صبح جس گیارہ بجے چلیں گے۔ تم مجھے یا دو لادنا ویسے مجھے خود بھی یاد ہے۔“

”تائی جی!“ وہ لاچار رہی۔

”بس بیٹا! اب ایک رات کی تو بات ہے، تم فکر نہ کرو کل ہم صبح ہی نکل چلیں گے۔ تمہاری تائی تمہیں اندر بلا رہی تھیں سن لو جا کر۔“

کہتے ہوئے وہ باہر نکل گئے۔ وہ بے بسی سے گھر اسانس لے کر رہ گئی۔ اس شہر میں اگر بھی کس قدر مجبور تھی فون کرنے کا اب اس کا ارادہ نہیں تھا کیونکہ گزشتہ کئی مہینوں سے اس کے فون کرنے پر فضا فون اینڈ نہیں کرتی تھی۔

وہ تو کوئی نہ کوئی بھانا کر دیتے تھے یا پھر فون بند کر دیا جاتا تھا۔

وہ تائی جی کے پاس آ کر رات کے فکشن کی تیاری کرنے لگی۔

رائل بلو سوٹ پر مقبض کا کام تھا اس کے ساتھ میچنگ سلور ٹیگنوں کی جیوری پہنے لائٹ میک اپ میں وہ کئی لوگوں سے اپنی تعریف سن چکی تھی اور تائی جی نے تو بر ملا کہنا شروع کر دیا تھا کہ ”ہاں یہ میری ہونے والی ہو ہے۔“ وہ اس زبردستی پر جبر ہو کر رہ جاتی۔

بارت کی روانگی کے وقت رش کی وجہ سے وہ پیچھے پیچھے ہو کر کھڑی ہو رہی تھی تائی جی پہلے ہی کسی گاڑی میں بیٹھ چکی تھیں وہ ذرا سی پیچھے ہی ایک دم سے کمرے کا فلاش چمکا۔

”کیا ہے تمہیں؟ میری طرف مٹھی جا رہی ہو۔“ نظر نہیں آ رہا۔ میری تصویریں بن رہی ہیں اچھا بھلا اس کوپ

غراب کر رہی ہو اپنی سڑی ہوئی شکل ساتھ میں لا کر پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو۔“

ولید کی تیز آواز پر وہ اچھل ہی پڑی اس کا کوئی کزن اس کی تصویر اتار رہا تھا۔ وہ شرمندہ سی ہو کر دوسری طرف

ہٹ گئی۔

ولید کی تیز آواز پر وہ اچھل ہی پڑی اس کا کوئی کزن اس کی تصویر اتار رہا تھا۔ وہ شرمندہ سی ہو کر دوسری طرف

ہٹ گئی۔

ولید کی تیز آواز پر وہ اچھل ہی پڑی اس کا کوئی کزن اس کی تصویر اتار رہا تھا۔ وہ شرمندہ سی ہو کر دوسری طرف

ہٹ گئی۔

کب گاڑی عاکف چچا کے گیٹ کے اندر جا کر کر رہی۔ اسے کچھ خبر نہ ہو سکی۔ وہ تو اسی خوش کن خیال میں مگن تھی کہ فضلہ سے ملنا ہے ابھی اور اسے ساتھ لے جانے کی بات وہ پہلے ہی تائی جی سے کر چکی تھی۔

عاکف چچا اور نرگس آنٹی گھر پر ہی مل گئے انہیں اپنے سامنے اچانک دیکھ کر حیران رہ گئے۔

”ہم نے سوچا خود ہی مل آئیں جا کر۔ تم نے تو نہ آنے کی قسم کھا رکھی ہے۔“ تائی جی عاکف چچا سے گلے ملے ہوئے بولے۔

”بھائی جان! کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ آپ کو پتا ہے سب۔ کس قدر مصروفیت ہے ادھر۔“ وہ ذرا شرمندگی سے بولے۔

”ہاں۔ ساری خدائی کا بوجھ تمہارے کندھوں پر ہے نا اس لیے۔ اور آپ کا کیا حال ہے؟“ تائی جی نے ان کا مروت نرگس آنٹی سے پوچھا۔

”ٹھیک ہے۔“ ان کا کنبہ رنجی تھا۔

”عاکف! یہ میرا بیٹا ولید ہے اور یہ ایمن ہے یاد ہے نا تمہیں؟“ تائی جی نے اپنے پیچھے کھڑے دونوں کا تعارف کرایا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ مجھے یاد ہے۔“ انہوں نے ولید کو گلے لگایا اور ایمن کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”دیکھیں آپ۔ نرگس! کسی کو چائے کا تو کہنا۔“ وہ تینوں بیٹھ گئے۔

”یہاں شادی تھی۔ تمہاری بھابی کی بہن ہے راشدہ۔ اس کے بیٹے کی اس لیے آئے تھے۔ سوچا فضلہ سے ملتے چلیں، بلکہ اسے ساتھ لینے آئے تھے۔ کچھ دن وہ ہمارے ساتھ رہے گی کراچی میں۔“

تائی جی نے تمہید باندھی عاکف چچا کا چہرہ ایک دم سے سنجیدہ ہو گیا۔

”کہاں ہے یہ فضلہ؟ تم اسے بلاؤ چائے کو چھوڑو آج ادھر ولید ہے۔ وہ آج ہمارے ساتھ چلے۔“ عاکف چچا نے نرگس آنٹی کی طرف دیکھا۔

”بھائی صاحب! وہ تو اپنے کان لڑپ کے ساتھ شمالی علاقہ جات کی سیر کے لیے گئی ہوئی ہے۔ کل گئی تھی۔ پھر دن کا ٹرپ ہے۔ آپ آئے گی اطلاع کرتے تو ہم اسے نہ جانے دیتے۔“ نرگس آنٹی نے جواب دیا۔

”اوہ یہ تو برا ہوا۔ ایمن تو آنٹی اسی لیے تھی ہمارے ساتھ۔ اتنے برس گزر گئے۔ دونوں بہنوں نے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا۔ یہ سب عاکف کی لاپرواہیوں کا نتیجہ ہے۔ خیر میں ایمن کو ادھر ہی چھوڑ جاتا ہوں۔ کل برسوں تک پھر پندرہ دن بعد ولید دوبارہ آئے گا اور ان دونوں کو لے آئے گا کراچی۔“ تائی جی نے ایمن کے دل کی بات کہی۔

”لیکن اس کی تو کلاسز ہو رہی ہیں۔ ایگزام تک وہ کیسے جاسکے گی۔ تھرڈ ایئر میں ہے وہ۔“ نرگس آنٹی کا کنبہ بیزار سا تھا۔

”ساری عمر رہا ہی تو ہے۔ اب پندرہ بیس دن چھٹی کر لے گی۔ میں تو بھی اب ایمن کو مزید ٹال نہیں سکتا۔ عرصہ میں بھی اسے ادھر نہیں لاسکا۔ خیر اب یہ بیس رہ کر فضلہ کا انتظار کرے گی۔ کیوں ایمن رہ لوگی نا؟“

تائی جی نے پوچھا۔

”جی تائی جی! رہ لوگی۔“ وہ فوراً بولی۔

”چلیں جیسے آپ کی مرضی ہم دونوں تو کل چائنا جا رہے ہیں برنس کے سلسلے میں۔ اگلے ماہ سارہ بیٹی کی شادی ہے۔ پھر اس کی تیاری کے سلسلے میں۔ ایسے میں یہ ادھر اکیلی کیسے رہے گی۔ سارہ بیٹی بھی تو ہمارے ساتھ آئے گی۔“ نرگس آنٹی کا موڈ اسے رکھنے کا نہیں تھا۔

”اوہ پھر اب؟“ تائی جی سوچ میں پڑ گئے۔

”ابو! میں پندرہ دن بعد ایمن کو لے آؤں گا، یا اگر فضلہ کو لے جاؤں گا۔ ابھی ایمن ہمارے ساتھ ہی چلے گی۔“ ولید نے کہا۔

”چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔ کیوں ایمن ٹھیک ہے نا؟“ تائی جی نے اس کی رائے چاہی۔

اس نے بے دلی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”میں دیکھوں، چائے نہیں آئی ابھی۔“ نرگس آنٹی مطمئن ہو کر کھڑی ہو گئیں۔

عاکف چچا اور تائی جی سیاست کی باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ولید بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا تو وہ بیزار ہو کر کھڑی ہو گئی۔

”تائی جی میں ذرا بایا ہوں۔“ کہہ کر وہ باہر نکل آئی۔

لاؤنج سے نکل کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ ”کدھر جاؤں۔ موسم اچھا ہو رہا ہے۔ ابر آلود سا۔ باہر کی طرف جانا چاہیے۔“ اس نے پاس سے گزرتے ایک ملازم سے باہر کا راستہ پوچھا اور باہر نکل آئی۔

موسم واقعی خوبصورت ہو رہا تھا۔ ”گلستا ہے بارش ہوگی۔“ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا، ابھی کچھ دیر پہلے تو دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ سیاہ گھنے بادلوں سے آسمان بھر رہا تھا۔ وہ لان میں آگئی۔

”گھر تو بہت خوبصورت ہے عاکف چچا کا۔ میں نے غلطی کی ان سے فضلہ کے کمرے کا پوچھتی۔ وہاں اس کی کوئی تصویر تو ہوگی۔“ اس نے دل میں سوچا۔

”ابھی جا کر پوچھتی ہوں۔“ وہ لان میں گھس گئی۔

”پتا نہیں اب فضلہ کیسی ہو گئی ہوگی۔ اس کا کتنا بڑا ہو گیا ہو گا رنگ اتنا ہی سفید ہو گا۔ آنٹی بتا رہی تھیں وہ اب تھرڈ ایئر میں ہے۔ کاش میں کل آجاتی۔“ وہ ٹپکتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

”یہ شاید انیکسی ہے۔“ وہ انیکسی کے پاس سے گزرتے ہوئے خود سے بولی۔

”پندرہ دن کا ٹرپ تو خاصا لمبا ہے ورنہ میں اتنے دن ادھر رہ لیتی، یہ سرونٹ کو ارٹز لگ رہے ہیں۔“ ساتھ ساتھ بننے والے چھ کو ارٹز کو دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا۔

”یہ بھی کو ارٹز ہے۔ کتنا اکیلا تنہا سا۔ ساری بلڈنگ سے ہٹ کر کتنا عجیب لگ رہا ہے۔“ وہ درختوں کی رو سے گزر کر نیم کے درخت کے پاس پہنچی۔

”یہ بھی امیروں کے جو چھلے ہوتے ہیں۔ نوکروں کی فوج رکھنا۔“ وہ کو ارٹز کے دروازے کے پاس پہنچ کر رک گئی۔

”چلنا چاہیے اب۔ تائی جی سے کہتی ہوں۔ فضلہ کا کمرہ دیکھ کر واپس چلتے ہیں۔ تائی جی انتظار کر رہی ہوں گی۔“

”یہ کو ارٹز عجیب سا لگ رہا ہے۔ الگ تھلگ سا۔ دیکھوں اس میں کون رہتا ہے۔“ کوئی چیز اسے کھینچ رہی تھی۔ وہ واپس مڑی اور کو ارٹز کا دروازہ ہلکے سے دھکیل کر اندر داخل ہو گئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ آگے چھوٹا سا صحن تھا جس کے ایک کونے میں مٹی کے ٹیل کا چولہا اور دو چار گرد آلود برتن پڑے تھے۔ اندر کی طرف ایک کمرہ نظر آتا تھا۔

”تیرے ڈر لگ رہا ہے۔ واپس چلتی ہوں۔“ وہ پھر مڑنے لگی۔ ایک دم اسے لگا کوئی کھانا ہے۔ وہ ٹھٹھک کر اس دروازے میں کون ہو سکتا ہے اندر۔ دیکھنا چاہیے اتنی خوبصورت کوٹھی اور اتنا بوسیدہ سا کو ارٹز۔“ وہ اندر کی طرف بڑھ گئی۔

”اس دروازے میں کون ہو سکتا ہے اندر۔ دیکھنا چاہیے اتنی خوبصورت کوٹھی اور اتنا بوسیدہ سا کو ارٹز۔“ وہ اندر کی طرف بڑھ گئی۔

”اس دروازے میں کون ہو سکتا ہے اندر۔ دیکھنا چاہیے اتنی خوبصورت کوٹھی اور اتنا بوسیدہ سا کو ارٹز۔“ وہ اندر کی طرف بڑھ گئی۔

کمرے میں میٹالا سا اندھیرا تھا۔ روشنی کا واحد ذریعہ کھلی کھڑکی تھی۔ پورا کوارٹر ہی سیلن زدہ تھا۔ گیلی کالی سیاہ دیواریں اور بچھی سی چھت۔ کمرے کا حلیہ صحن سے بھی بدتر تھا۔ فرش پر جا بجا گند بکھرا ہوا تھا۔ مٹی سے اٹا ہوا فرش کمرے کے وسط میں ایک جھلنگا سی چارپائی پڑی تھی۔ ابھی وہ یہ غور ہی کر رہی تھی کہ چارپائی پر کوئی ہے یا یہ خالی ہے کہ پھر اسے کھانسی کی آواز آئی۔ آواز چارپائی ہی سے آئی تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی۔

ایک نحیف و کمزور سا وجود میلے بستر میں لیٹا رہا تھا۔ کمرے میں روشنی کم ہونے کی وجہ سے اسے کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ ”آپ کون ہیں؟“ کھانسی کی وجہ سے ہلتے ہوئے اس ہڈیوں کے پنجرے سے اس نے پوچھا۔ اس کی آواز پر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ایمین ڈر کر پیچھے ہٹ گئی آنکھوں کی جگہ دو تاریک گڑھے تھے۔ ”آپ کون ہیں؟“ اس نے ذرا ہکا بکا کر پوچھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایمین کمرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ کمرے کا واحد فرنیچر تین ٹانگوں کی ایک میز تھی۔ جس کی چوتھی ٹانگہ اینٹوں کا ڈھیر تھی۔ اس کے نیچے اینٹیں اور پتھر پڑے تھے۔ میز پر کچھ بوسیدہ سی کتابیں پڑی تھیں۔ ایک دم سے وہ ہڈیوں کا پنجرہ زور سے کھانسا اور چارپائی سے اٹھ چلا کر اس نے دائیں طرف الٹی کر دی۔ خون کا چھوٹا سا ڈھیر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ خون اگل کر وہ جیسے شانت ہو کر پھر لیٹ گئی۔ ”اوہ میرے خدا یہ تو کوئی لڑکی لگتی ہے۔“ کچھ دیر وہ اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اس نے میز پر سے ایک کتاب اٹھالی۔ پہلا ورق الٹا۔

”پتا نہیں بے چاری کون ہے اور اس حال میں اور اندروالوں کو کچھ خبر نہیں۔“ ”فوضہ سکندر۔“ کتاب کے پہلے ورق پر بڑا بڑا لکھا تھا۔ ”فی فوضہ سکندر!“ سانس اس کے خلق میں اٹک گئی۔ اس نے جلدی سے بستر کی طرف دیکھا وہ شاید ہوش بھی یا سوئی ہوئی۔

”تم تم کون ہو؟“ وہ وحشت سے پلٹی اور اسے کندھوں سے جھنجھوڑنے لگی ”کندھوں کی جگہ جیسے دو کڑے ہڈیاں اس کے ہاتھوں میں تھیں۔“

اس نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھول کر بے حس سے اسے دیکھا۔ ”تم۔۔۔ تم فوضہ ہو؟“ وہ اٹک اٹک کر بولی اسے پھر کھانسی شروع ہو گئی تھی ٹن ٹن جیسے ٹین کا برتن بولنے کوئی لہجہ ہاتھ آتا ہے نہ آواز۔ محض ٹن ٹن۔

”تم۔۔۔ تم کون ہو؟ بولو۔۔۔ تم کون ہو؟ تم فوضہ ہو۔ یہ کتاب فوضہ کی ہے بتاؤ مجھے تم کون ہو؟“ اس پر اسے سوار ہو گئی۔

وہ محض تاریک گڑھوں سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”میں ایمین ہوں۔ فوضہ کی بہن۔ مجھے بتاؤ۔ وہ کہاں ہے بولو۔“ وہ چیخ کر بولی۔

”ڈھانچے نے جیسے پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔“

”آپ! آپ! کالی درخت اس کے لب لباب۔“

”فوضہ! فوضہ! میری جان۔ تم فوضہ ہو۔ بولو میری بہن۔“ وہ اس سے لپٹ کر پیچھے لگی۔ فوضہ نے گے گا۔

”تایا جی! تایا جی!“ وہ چیختی ہوئی باہر بھاگی۔

وہ اتنا تیز اپنی زندگی میں کبھی نہیں بھاگی ہوگی اور نہ اتنی زور سے چیختی ہوگی۔ اس کی چیخوں کی آواز اس

ناکف چچا اور ولید پر لے ہی باہر نکل آئے۔ دو تین ملازم بھی ادھر ادھر سے آگئے تھے۔

”تایا جی! تایا جی! میرے ساتھ آئیں۔ میں آپ کو جیتی جاگتی قیامت دکھاؤں۔“ وہ تایا جی کے پاس پہنچ کر ان کا بازو کھینچتے ہوئے بولی۔

”کیا ہوا ہے ایمین! کچھ بتاؤ تو سہی۔“ تایا جی اس کے ساتھ کھینچتے ہوئے بولے۔

”تایا جی! قہر ٹوٹا ہے۔ تایا جی دیکھیں تو آکر۔ ہمارے ساتھ کیا ظلم ہوا ہے۔ تایا جی! فوضہ! فوضہ! میری گڑیا۔“

وہ پھر سے بھاگنے لگی۔ تایا جی اور ولید نا سمجھی میں اس کے ساتھ تیز تیز چلنے لگے اور عاکف چچا تولان کے وسط میں ہی رک گئے تھے۔

اور کوارٹر میں پہنچ کر جب اس نے روتے ہوئے بستر پر پڑے اس ڈھانچے سے انہیں متعارف کرایا تو وہ لرز کر دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔

”تایا جی! یہ فوضہ ہے۔ تایا جی! ہماری فوضہ! میرے پیپا کی گڑیا۔ تایا جی! میری ماما کی چندا۔ دیکھیں تایا جی! اسے دیکھیں۔ ہماری پریوں جیسی فوضہ ہے یہ۔ تایا جی! یہ میری فوضہ ہے۔“

آنسوؤں کی قطاریں اس کی آنکھوں سے بہہ رہی تھیں۔ وہ زور زور سے رو رہی تھی ”فوضہ شاید بے ہوش تھی۔“

”یہ ابھی بولی تھی۔ تایا جی! ابھی۔“ اس نے آئی۔ کہا تھا۔ ”فوضہ آپ! مرجائے تمہارے لیے۔ فوضہ میری گڑیا! آپ! تمہارے اوپر قربان ہو جائے۔ یہ تم نے کیا کیا اپنے ساتھ آپ! کو خبر بھی نہ کی اور کس رستے پر جا پڑیں فوضہ۔ آپ! کو تو بتایا ہوتا۔ وہ اپنی جان دے کر تمہیں بچا لیتی فوضہ!“ وہ روتی جا رہی تھی۔

”نہیں۔ عاکف ایسا نہیں کر سکتا۔“ تایا جی بڑبڑائے۔ ولید ایک دم سے آگے بڑھا اس نے دونوں ہاتھ بڑھا کر ہڈیوں کے اس ڈھانچے کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ خون کے چھوٹے سے ڈھیر میں اس کے جوتے لٹھڑ گئے وہ اسے اٹھا کر باہر کی طرف بھاگا۔

”ابو جی! میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جا رہا ہوں۔“ وہ جاتے جاتے بولا۔ تایا جی بھی اس کے پیچھے لپکے۔ ایمین بھی مردہ قدموں سے ان دونوں کے ساتھ باہر نکل گئی۔

جب تک وہ لان عبور کرتی۔ ولید اور تایا جی فوضہ کو لے کر جا چکے تھے۔ ایمین کے جسم سے جان ختم ہو چکی تھی۔ گھٹ گھٹ کر اس نے لان عبور کیا تھا۔ کوٹھی تک پہنچ کر وہ بے دم ہو گئی وہیں سیڑھیوں پر ڈھیر ہو گئی۔

”کیا وہ واقعی فوضہ تھی؟“ آنکھ سے بہتے آنسوؤں کو پونچھ کر اس نے سامنے کا دھندلایا ہوا منظر دیکھتے ہوئے سوچا۔

”نہیں یہ ضروری نہیں وہ فوضہ ہو وہ تو اس قدر خوبصورت تھی۔ ابھی کچھ عرصے تک وہ مجھ سے فون پر بات کرتی رہی تھی اور اب یکایک کیا ہو گیا اسے وہ بیمار ہو گئی۔ ڈاکٹر ایڈمٹ کرے گا اسے۔ دو چار ہفتوں یا ایک آدھ مہینے میں ٹھیک ہو جائے گی وہ۔ ہاں مجھے یقین ہے۔ وہ اچھی ہو جائے گی۔ لیکن وہ خون؟“

وہ دونوں کو کات دینے والا لیل اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

”یا اللہ رحم کرنا! اب اور کوئی نیا صدمہ ہم نہیں سہہ سکتے۔“ وہ گھنٹوں میں سردے کر رونے لگی۔ اسے اس حالت میں بیٹھے شاید آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ جب کسی گاڑی کے آنے اور گیٹ کھلنے کی آواز آئی اس نے سر اٹھا کر دیکھا ولید فرنٹ سیٹ پر بیٹھا گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اور تایا جی پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔

وہ تقریباً ”بھائے“ ہوئے گاڑی تک پہنچی گاڑی ولید نے رستے میں ہی روک دی تھی۔ اس نے بے قراری سے

پچھلا دروازہ کھولنا چاہا وہ لاکھڑا تھا۔ تایا جی نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کا لاک کھولا۔
ان کے پاس ہی پچھلی سیٹ پر ہڈیوں کا ڈھیر بے جان پڑا تھا۔
اس نے ایک نظر اس ڈھیر پر ڈالی اور دوسری تایا جی کے تاریک چہرے پر اسے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں

رہی۔
"تایا جی! یہ فضا نہیں ہے نا؟ یہ تو کوئی اور ہے۔ ہماری فضا تو چینی کی گڑیا جیسی تھی۔ سرخ و سفید نازک اور حسین۔ یہ کوئی ان کی ملازمہ ہوگی۔ فضا نہیں ہے نا۔ فضا تو کالج ٹرپ کے ساتھ گئی ہے نا۔ عاکف پچھلا ہی کہہ رہے تھے نا۔"

وہ گاڑی کے پچھلے وہیل کے پاس زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور دیوانوں کی طرح روتے ہوئے زور زور سے بولنے لگی۔

"عاکف! تایا جی بڑبڑائے اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔
ایمن نے ہاتھ بڑھا کر ہڈیوں کے اس بچھر کو چھوٹا چاہا پھر ڈر کر ہاتھ پیچھے کر لیا۔
"تم نے تم نے یہ کیا کیا ہمارے ساتھ؟" اسے تایا جی کی غرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ سر اٹھا کر دیکھنے لگی گاڑی کے پاس ہی عاکف پچھا سر جھکا کر کھڑے تھے تایا جی قدم گن گن کر ان کی طرف بڑھا رہے تھے۔
"اپنے ہی خون کا تم نے اس طرح قتل کیا۔ تم نے اسے نہیں مارا۔ تم نے ہمیں زندہ زمین میں گاڑ دیا ہے۔ ساری زندگی کے لیے شرمساری اور ندامت کو ہمارا مقدر بنا دیا ہے۔ تم دولت کے پجاری۔ آنکھوں کے اندھے بے ایمان۔ دھوکے باز۔ تنگ خاندان۔ تم ہی یہ سب کر سکتے تھے۔ تم ہی مجھے بتا رہے تھے تم اس سے زیادہ گریہ نہیں کر سکتے تھے۔ تم نے ہمیں مار دیا جیتے جی۔ ان شیعوں کی دنیا اجاڑ کر کیا ملا تمہیں؟ کتنے لاکھ کمائے تم نے۔ یہ ظلم کما کر۔ تجھے رحم کیوں نہ آیا عاکف! تجھے رحم کیوں نہ آیا۔ تو نے پھولوں سی ہماری بچی کو پتی پتی کر کے بکھیر دیا۔ ظالم آندھیوں کے حوالے کر دیا۔ عاکف تو۔۔۔"

ان کے منہ سے کف اڑنے لگا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر تڑا تر عاکف پچھا کے منہ پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔
ان کے منہ سے کف اڑنے لگا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر تڑا تر عاکف پچھا کے منہ پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔
بے حس بنے ان سے تھپڑ کھاتے رہے ایک دو تین نامعلوم کتنے۔
"تو نے ہمیں کہیں کانہ چھوڑا۔ تو اتنا ظالم اتنا سفاک ہو گا یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ تو نے اپنے ماں جانے کے خون کے ساتھ یہ سلوک کیا۔ عاکف تیرا دل نہ کانپا۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ کچھ بھی نہ۔ کیسے یہ کالا منہ لے کر سکندر کے سامنے جانے گا۔ تجھے خدا سے بھی ڈر نہیں لگا۔" ان کے ہاتھ رک نہیں رہے تھے اور عاکف پچھا کھڑے پٹ رہے تھے۔

"ابو جی! بس کریں۔ دفع کریں۔ ان کا زندہ رہنا ہی اب ان کے لیے سزا ہے، ہم اور آپ انہیں جو بھی سزا دیں گے۔ وہ ان کے لیے نجات ہوگی ان کی سزا اور والا تجویز کرے گا۔ آپ انہیں چھوڑ دیں۔"

ولید نے باہر نکل کر تایا جی کے ہاتھ پکڑ لیے۔ وہ جیسے بے دم ہو کر ولید سے لپٹ کر زور زور سے رونے لگے۔
ولید انہیں گلے سے لگائے قطبیاں دینے لگا۔ کچھ دیر رونے کے بعد جیسے ان کا جی ہلکا ہو گیا۔
"چلیں ابو! جلتے ہیں سوئے چاندی کے گھل گئی کچھ دے سکتے ہیں۔ ایسا زخم جسے ہم تاجر بھرتے رہیں۔"

چلیں۔ وہ انہیں تمام کر گاڑی تک لے آیا۔
"چلو ایمن! اندر بیٹھو۔" اس نے جھک کر ایمن کا ہاتھ پکڑا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ولید! یہ فضا نہیں ہے نا؟" وہ بے یقینی سے اسے دیکھ کر بولی۔
"ہاں یہ فضا ہی نہیں ہے نا۔ اس نے جھک کر ایمن کا ہاتھ پکڑا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

کو جھلسائے گا مگر ٹپکے گا نہیں چلو بیٹھو۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"یہ کھو فضا! میں نے اسے کما تھا نا کہ میں تمہیں لینے ضرور آؤں گی۔ دیکھو میں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ تم کچھ بولتی کیوں نہیں۔ فضا! تمہیں پتا ہے ہم تمہیں کہاں لے کر جا رہے ہیں۔ تمہیں نہیں پتا نا۔" وہ اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیے بیٹھی تھی۔

"بتاؤں؟" اس کا لہجہ شوخ سا تھا اور چہرہ سپاٹ۔

"ہم تمہیں ماما پاپا کے پاس لے کر جا رہے ہیں اپنے گھر۔ فضا تم انہیں بہت مس کرتی تھیں نا۔ اب سب سے پہلے تم ہی ان سے ملو گی۔ ان سے ملو تو ان سے یہ ضرور پوچھنا۔ ہمیں دنیا کے بے درد ہاتھوں میں کھلونا بنا کر انہوں نے اپنی الگ دنیا کیوں بسائی۔ فضا! تمہیں ڈر تو نہیں لگ رہا۔ تم رو رہی ہو۔ نہیں اب نہیں رونا۔ اب تو سارے دکھ ختم ہو گئے۔ اب تو تمہیں سکون مل جانا چاہیے۔ اب نہیں رونا میری جان۔ میری گڑبلا لانا کی چند اب نہیں رونا۔" وہ اس کے چہرے پر اپنا چہرہ نکا کر رونے لگی۔

"اب تم نہیں روؤ گی۔ اب ہم رو میں گئے روتے رہیں گے تم تو اپنے سارے دکھ اپنے سینے میں چھپا کر جاری ہونا۔ ہمیں کون بتائے گا، تمہیں کیا ہوا تھا۔ اب تمہارے ان جانے دکھوں کو یاد کر کے ہم رویا کریں گے۔ فضا ہم۔" وہ روئی جاری تھی۔

ولید نے آنکھیں صاف کر کے گاڑی اشارت کر دی۔

اس نے فضا کے ہاتھ پکڑ کر جوئے شروع کر دیے۔ بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی یا ہڈی میں ایک انگوٹھی تھی۔ تین خوبصورت جگمگاتے ہیرے اس میں جڑے تھے۔ انگوٹھی کے چھلے کو دھاگا لپیٹ لپیٹ کر تنگ کیا گیا تھا۔ اس کے باوجود وہ انگلی میں ڈھیلی تھی۔ وہ انگوٹھی کو حیرت سے دیکھنے لگی۔

عاکف پچھا اسی طرح جت بنے کھڑے تھے اور کارڈور کی سیڑھیوں پر کھڑی نرگس آئی نے انہیں جاتے دیکھ کر سکون بھرا سا لیا اور اندر کی طرف بڑھ گئیں۔ دور کھڑے سب ملازمین کی آنکھیں بھی اشک بار تھیں۔ گیٹ سے نکلتے ہی ولید نے گاڑی کی اسپید بڑھا دی۔

♥ ♥ ♥ ♥

کراچی ایئر پورٹ پر وہ فضا کی میت سمیت باہر آئے تو ابراہیم بھائی ایمر لینس اور اپنی گاڑی لیے ان کے منتظر تھے۔

"چلو بیٹا! گاڑی میں بیٹھو۔" تایا جی نے اس کے سر سے ڈھلا کا ڈپٹہ درست کرتے ہوئے کہا۔

"تایا جی! ہم کہاں جا رہے ہیں؟" وہ اب بر سکون سی تھی۔

"اپنے گھر بیٹا اور کہاں؟" مائی جی پہلے ہی گاڑی میں جا بیٹھی تھیں۔

"نہیں۔ ہم فضا کو اپنے گھر لے کر جائیں گے۔ اپنے ماما پاپا کے گھر۔ وہ وہیں سے رخصت ہو گی۔ میں اسے کہیں اور نہیں لے کر جاؤں گی۔" وہ دو ٹوک لہجے میں بولی۔

"ایمن بیٹا! ہم ادھر کیسے لے جا سکتے ہیں۔ ادھر تو کرائے دار۔" وہ ذرا عاجزی سے بولے۔

"میں نے کہا نا کہ ہم فضا کو ادھر ہی لے کر جائیں گے اور نہ میں ساری عمر اسے لیے بیٹھ کر رہوں گی۔" وہ اپنے بچپن کے ضدی لہجے میں بولی۔

"جیسا کہ ایسے نہیں کرتے۔" وہ پیار سے بولے۔

"جیسا کہ ساتھ ایسے ہوتا ہے وہ ایسے ہی کرتے ہیں۔ میں نے جو کہا ہے وہی کروں گی جائیں آپ۔" وہ جج کر اپنے منہ سے حق دیکھنے بغیر اپنی طرح آؤٹ ہو جایا کرتی تھی۔ ولید نے تایا جی کو پکڑ کر ایک سائیل پر لے گیا۔

پھر وہ گھٹنے بعد تیا جی اسے ولید کے ساتھ لینے آئے۔
ان کا گھر ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کر گئے تھے۔ ہاں اینٹ پتھر کے گھر ویسے ہی رہتے ہیں، صرف انسان ٹوٹ
پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں اور پھر پیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔
عبیدہ اور غزالہ آنٹی پہلے ہی پہنچ چکی تھیں۔ فضلہ کی ڈیڈ باڈی اسی جگہ رکھی گئی تھی جہاں آج سے اٹھارہ سال
قبل سکندر اور مسز سکندر کے جنازے پڑے تھے۔ آہستہ آہستہ لوگ اکٹھے ہونا شروع ہو گئے۔
”بیٹا! جنازے کا کون سا نام اناؤنس کریں؟“ وہ سرجھکائے فضلہ کے پاس ہی بیٹھی تھی جب تیا جی نے اس سے

پوچھا۔

”جب مون آجائے گا تب۔“ وہ سکون سے بولی۔

”مون!“ تیا جی نے اسے ایسے دیکھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔

”فون تو کر دیا ہے سفینہ کو لیکن وہ کہہ رہی تھی کہ ٹکٹ اتنی جلدی نہیں ملے گا ایک دو روز لگ جائیں گے۔“
وہ تحمل سے بولے۔

”جب تک مون نہیں آئے گا۔ ہم فضلہ کو یہیں رکھیں گے۔ آپ بتادیں سب کو جا کر۔“ وہ فضلہ کی رخ ٹھنڈی
پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

تیا جی اسے ایک نظر دیکھ کر ہار نکل گئے۔

”فضلہ! تمہیں پتا ہے نا۔ آج تمہاری سالگرہ ہے۔ دیکھو کتنے لوگ اکٹھے ہو رہے ہیں۔ فضلہ! ایسا کیوں ہوا
ہے جس موقع کو ہم بہت یادگار طریقے سے منانا چاہتے ہیں۔ وہی ہماری یادوں کے لیے ناسور بن جاتا ہے
فضلہ! تم نے اتنا بڑا فیصلہ اکیلے کیسے کر لیا۔ ہم سے ذرا بھی نہیں پوچھا۔ ماما مجھے تم سب کا خیال رکھنے کو کہہ گئی
تھیں۔ سو ری فضلہ! تمہاری بے بس آنٹی تمہارے لیے کچھ بھی نہ کر سکی کچھ بھی۔“

وہ اس کے پلنگ سے سرخٹ کر رونے لگی، عبیدہ نے اسے اپنی بانسوں میں لے لیا۔ مون سفینہ پھوپھو کی فیملی
کے ساتھ رات تین بجے پہنچا تھا۔

اونچا، لمبا، وجیہ مون اس کے قصور سے بڑھ کر جوان نکلا تھا۔ وہ فضلہ کے پاس کتنی ہی دیر سرجھکائے کسی ٹو
ہوئی شاخ کی طرح بیٹھا رہا تھا۔

اگلی صبح سات بجے جنازہ اٹھایا گیا۔

”فضلہ! میں تمہیں اس لیے تو نہیں لے کر آئی تھی کہ پھر تمہیں پیشہ کے لیے کھودوں۔ فضلہ! میں تو جیسے
بیشہ کے لیے یہاں اپنے پاس رکھنے کے لیے لائی تھی۔ دیکھو ہم سب اپنے گھر میں ہیں۔ ماما بابا کے گھر میں ایک
ایک ساتھ۔ فضلہ! نہ جاؤ۔ فضلہ نہ جاؤ۔ تمہاری ای کی آنٹی تمہیں یاد کر کے مرجائے گی۔ فضلہ! آ جاؤ ہم
رہیں گے، ہمیشہ اکٹھے اب کوئی ہمیں نہیں بانٹ سکے گا۔ کوئی ہمیں تقسیم نہیں کرے گا۔ میں اب کسی کو ایسا
کرنے دوں گی۔ ہمارا مضبوط تو انا بھائی ہمارے ساتھ ہے فضلہ! اب تو کوئی ڈر نہیں، پھر تم ہمیں تقسیم کر کے
جاری ہو۔ پھر ہمیں اوجھلا کر رہی ہو۔ فضلہ! آ جاؤ فضلہ! آ جاؤ۔ مون اسے روکو۔ عبیدہ اسے روک لو۔“

وہ اس کے گھٹنے میں اپنے دل کے وجوہ سے الگ نہیں ہو رہی تھی۔ عبیدہ اور غزالہ آنٹی نے اسے کھینچ کر اپنے
لگا لگا۔ کل شہادت کی آوازوں کے ساتھ ایک تشنہ روح کو اس کی آخری آرام گاہ تک لے جانے کے لیے
کھینچا اور وہ اسے گوازیں دیتے ہوئے بے ہوش ہو گئی۔

وہ بھی تمہارے لیے اس انسان فراموش نہ کیا اور سچ رہا۔ وہانی کو کیا حرکت کی ہے اس نے شادی سے

سارہ کو طلاق بھجوا دی ہے۔ ہائے کیا غضب ہو گیا۔ عاکف! سنتے ہو۔ ہماری ناک کٹ گئی۔ ہم کہیں کے نہیں
رہے۔ اس نے کس جہنم کا بدلہ لیا ہم سے۔ ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ اب تو گھر میں مہمان بھی
آنا شروع ہو گئے ہیں۔ سب انتظامات مکمل ہیں۔ ہم لوگوں کو کیا بتائیں گے اور تمہارے اس ملعون بیچر نے طلاق
نامہ سب کے سامنے کھول کر پڑھ دیا ہے۔ ہم تو کوئی کہانی بھی نہیں گھر سکتے اور میرے خدا۔ یہ کیا ہو گیا ہمارے
ساتھ۔“

نرگس آنٹی چیختی روئی کمرے میں داخل ہوئیں۔ عاکف پچھلے حیرت سے انہیں دیکھا۔

”یہ یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ کہاں جا رہے ہو تم؟“ وہ حیرت سے عاکف کو دیکھ کر بولیں۔ وہ بلیک ٹوپس پہنے
کھڑے تھے ہاتھ میں سوٹ کیس تھا۔

”مجھے سڑکا پور جانا ہے۔ نہیں وہ فضلہ کو کراچی لے کر جانا ہے۔ کراچی کا ٹکٹ نہیں مل رہا۔ میں نے اوھر ہی
رکھا تھا۔ کب سے ڈھونڈ رہا ہوں۔ تم ڈھونڈ دو۔ فضلہ ناراض ہو جائے گی۔ بھائی جان نے بلایا ہے اسے۔ ورنہ وہ
خود آجائیں گے، لیکن میں کیسے جاسکتا ہوں۔ مجھے تو آج یو کے جانا ہے وہاں کا پروڈکشن ٹیجر بڑی گڑبڑ کر رہا ہے۔
لیکن کل تو سارہ کی رخصتی ہے، میں کیا کروں۔ نرگس! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“ وہ بے بسی سے دونوں
ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گئے۔

”تمہیں پتا ہے فضلہ مر گئی ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ اس کی طبیعت اتنی خراب ہے کہ وہ مرجائے گی۔
میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا، مگر اب کیا کروں، میرے پاس تو نام ہی نہیں ہے۔ فلائٹ کا وقت ہو چلا ہے۔
تم آج آفس نہیں جاؤ گی۔ مل میں ہڑتال ہے نا۔ مجھے پروازرز سے بھی ملنا ہے۔ فضلہ کا آج جنازہ ہے، نہیں۔ وہ تو
اوھر کو اڑ رہی ہیں میرا انتظار کر رہی ہے۔ اسے کراچی جانا ہے، مجھے ٹکٹ نہیں مل رہا۔“ وہ اٹھ کر کمرے کی چیزیں
اٹھا اٹھا کر ٹکٹ ڈھونڈنے لگے۔

”یا اللہ یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ عاکف کا پاگل پن بڑھتا جا رہا ہے۔ ہمیں کس گناہ کی سزا مل رہی ہے۔
رسول رات مل میں آگ لگ گئی۔ لاکھوں کروڑوں کا نقصان ہو گیا۔ آج سارہ کی طلاق۔ اومالی گاؤں میں کیا کروں۔
گدھر جاؤں؟ کیسے یہ حالات سنبھالوں؟“

وہ سر پکڑ کر بستر پر گر گئیں۔ عاکف اب صوفوں کو الٹا کر کے ٹکٹ ڈھونڈ رہے تھے۔ نرگس انہیں پھٹی پھٹی
آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔

میرے راتے میں شجر کوئی نہ تھا
سائے تھے ہمراہ اور بشر کوئی نہ تھا
دریا شہروں کی حد تک اٹھ آئے ہیں
اور لہروں کا ہم سفر کوئی نہ تھا
شہر شناسائی میں محبت کی نظر کوئی نہیں
پھولوں کے شہر میں خوشبو کا گھر کوئی نہ تھا

چالیسویں کے بعد تائی جی اسے لے جانے آئیں۔

تائی جی! اب ہم یعنی میں عبیدہ اور مون یہیں رہیں گے، اپنے گھر میں، گرے کلر کے کائین کے سوٹ میں
لوہے سے اپنے وہ کلام پاک پڑھ رہی تھی۔ تائی جی کی بات سن کر اس نے قرآن شریف بند کر دیا۔

”تم اکیلے ادھر کیسے رہ سکتے ہو۔“ تائی جی کچھ حیرت سے بولیں۔

”ہم تین ہیں۔ اکیلے نہیں اور پھر اپنے گھر میں کوئی اکیلا نہیں ہوتا۔“ وہ بولی۔

پھر سارے خاندان نے مل کر زور لگایا۔ لیکن اس کی ”ناں“ ہاں میں نہ بدلی۔

”ہم یہیں رہیں گے۔ میں جاب کروں گی، ہم رہ لیں گے۔“ سفینہ پھوپھو غزالہ آنٹی، تائی جی، تائی جی کس کس نے اسے نہیں سمجھایا مگر وہ نہ مانی۔ آخر سب تھک کر چلے گئے۔ وہ تینوں گھر میں اکیلے رہ گئے۔ مون کا موڈ کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اندر کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ عبیدہ بچن میں چلی گئی اور وہ وہیں صوفے پر بیٹھی ماما پاپا کی تصویر کو غلطی باندھ کر دیکھنے لگی۔

ایک، دو، تین، چار پورے پانچ دن گزر گئے۔ کوئی نہیں آیا اور اسے تو کسی کا انتظار تھا بھی نہیں۔ البتہ مون بہت چپ چاپ تھا اور کچھ اکھڑا اکھڑا بھی۔ عبیدہ بھی خاصی خاموش تھی۔ وہ تو چار دنوں سے بند کمرے میں پڑا سامان لالا کر گھر میں سجا رہی تھی۔ عبیدہ اس کی مدد کر رہی تھی۔ لیکن مون کو جیسے کسی کام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

شام کو ولید آیا۔

”امی ہاتھ روم میں گر گئی ہیں۔ کولے کی ہڈی پر شدید ضرب آئی ہے۔ ہاسپٹل میں ہیں۔ تمہیں یاد کر رہی ہیں۔“

وہ شوکیں میں کرا کر سی جا رہی تھی جب ولید نے آکر کہا۔ وہ کچھ دیر کو ذرا سی پریشان ہوئی۔ تائی جی سے تو پہلے ہی اٹھا بیٹھا نہیں جاتا تھا۔

”اچھا۔ میں کل آجاؤں گی انہیں دیکھنے۔ ابھی تو ادھر اتنی مصروفیت ہے کام ہی بہت ہے۔“ وہ مصروف لہجے میں برتن سجاتے ہوئے بولی۔

ولید کچھ غصے میں کھڑا اس کی بے کاری مصروفیت کو دیکھتا رہا۔ پھر پاؤں پٹختا ہوا چلا گیا۔

اسی وقت مون اور عبیدہ تیار ہو کر آگئے۔

”چلو امی! ہم تائی جی کو دیکھنے جا رہے ہیں۔“ عبیدہ بولی۔

”سارا گھر بکھرا پڑا ہے۔ یہ کام چھوڑ کر میں تائی جی کو دیکھنے چل پڑوں، کل جاؤں گی۔ آج مجھے ڈرائنگ روم سیٹ کرنا ہے۔“ وہ اسی لہجے میں بولی۔

”ایم! عبیدہ کچھ غصے سے بولی۔

”اچھا۔ ہم جا رہے ہیں، چلو مون! تم تو بے حس ہو گئی ہو۔“ وہ کہہ کر ہر نکل گئی۔

”تائی جی کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ ہم رات ہاسپٹل میں ہی رہیں گے۔ تم رہ لو گی نا۔“ آدھے گھنٹے بعد عبیدہ کا فون آیا۔

”ہاں رہ لوں گی۔ اپنے گھر میں کیسا ڈر؟“ وہ پورے اعتماد سے بولی۔ اس نے فون بند کر دیا۔

”تائی جی کو اس کا مطلب ہے۔ زیادہ چوٹ آئی ہے۔ خیر کل جاؤں گی۔“ وہ کہتے ہوئے چکن کی طرف مڑ گئی۔ اسے کیا پتہ تھی کہ یہ رات اس کی زندگی کی خوفناک ترین رات بن جائے گی، اور اس کا اپنا گھر اس کے لیے بھوت بنگلہ بن جائے گا۔ رات کے دس بجے لائٹ چلی گئی۔ ہر طرف گھنگھور اندھیرا چھا گیا اور پھر اندھیرا اور سہل

مل کر اس کی روشنی ختم کر دینے لگا۔ کبھی اسے لگتا تھا کہ وہیں سے کوئی نیچے اتر رہا ہے۔ کبھی اسے لگتا تھا ماما اپنے کمرے سے سفید لٹن پن کر نکل رہی ہیں۔ کبھی وہ دیکھتی پایا اچھے بھلے اس کے سامنے صوفے پر بیٹھے بائیں کر رہے ہیں۔ یہ ایک ان کا سارا وجود خون آلود ہو جاتا ہے۔ پھر اسے لگتا تھا اسے آوازیں دے رہی ہے۔ وہ بستر پر

منہ چھپا کر لیٹ گئی تو فضا مقفل کمرہ کھول کر اندر آگئی اور اس کا بازو کھینچنے لگی۔ اس کی چیخیں نکل گئیں تو فضا زور زور سے ہنسنے لگی۔ وہ کمرے سے نکلنے لگی تو کمرے کا دروازہ غائب ہو گیا۔ وہ دیواروں سے ٹکرانے لگی۔ اس کا سر زخمی ہو گیا۔ وہ سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گئی، رات کے دو بجے لائٹ آگئی روشنی میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔ ہاں اس کا سر درد اور تکلیف سے پھنسا جا رہا تھا۔

”میں تو کبھی بھی اتنی کمزور دل نہیں رہی، پھر رات مجھے کیا ہوا تھا؟“

ساری رات کی دعاؤں کے بعد جیسے ہی پو پٹھی۔ وہ باہر آدے کی سیڑھیوں پر جا کر بیٹھ گئی۔ سات بجے جب ولید عبیدہ کو گیٹ پر آتا کر گیا۔ ایمن تنہائی، خوف اور سنائے کے ہاتھوں ادھ موٹی ہو چکی تھی۔

”مون تو سفینہ پھوپھو کے ساتھ ان کی ہند کے گھر چلا گیا۔ ایک دو روز ادھر رہے گا۔ تائی جی اب کچھ بہتر تھیں۔ مجھے تمہاری فکر تھی۔ اسی لیے صبح صبح آگئی۔ تم ٹھیک ہونا، یہاں کیوں بیٹھی ہو؟“ وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

”ہاں ٹھیک ہوں۔“ اسے اپنی آواز بھی اجنبی لگی۔ ”مون کیوں چلا گیا اسے پتا نہیں تھا کہ ہم ادھر اکیلے ہیں۔“ وہ کچھ غلطی سے بولی۔

”ایمن! تم اس قدر بے وقوف تو نہیں ہو، جیسی آج کل حرکتیں کر رہی ہو۔“ عبیدہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”کیا مطلب؟“ وہ بگڑ کر بولی۔

”ایمن! اتنے دنوں میں تمہیں مون کے روتے کو سمجھ جانا چاہیے تھا۔ وہ اب اس گھر کا نہیں، پھوپھو کے گھر کا لیکن بن چکا ہے۔ ان کا بیٹا۔ زندگی کی آسائشات کا عادی۔ وہ اب یہاں نہیں رہ سکتا۔ تم نے اس کے تئیں نہیں دیکھے۔ اس کا رویہ تو بہت کچھ سمجھا دینے والا ہے۔ پھر تم اتنا بڑا فیصلہ کس بنیاد پر کر رہی ہو۔ وہ پتا نہیں کس کے لحاظ میں چپ بنے وہ ادھر اپنی زندگی میں پوری طرح سے سیٹ ہے پھر اس کی اسٹڈیز کا حرج ہو رہا ہے۔ اس کے کیریئر کا مسئلہ ہے یہاں رہ کر وہ کیا کرے گا۔ پھوپھو کا ارادہ اسے نہیں سے بیٹھنے کا ہے بلکہ پھوپھو سے زیادہ وہ خود فیصلوں میں انٹرنل ہے۔ تم اسے روک سکو گی؟“

ایمن! تم اس حقیقت کو کیوں مان نہیں لیتیں کہ جو وقت گزر جاتا ہے وہ ہماری گرفت سے نکل جاتا ہے۔ پھر ہم لاکھ سرچشیں اسے واپس نہیں لاسکتے، ماما بابا کے ساتھ زندگی بتانے والے دن ہماری گرفت سے ہماری زندگی سے نکل چکے ہیں، اگر اب تم انہیں واپس لانے کی کوشش کرو گی تو کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ ان لوگوں کا خیال کرو۔ جنہوں نے ہمیں اس المناک حادثے کے بعد سنبھالا ہے۔ اب انہیں ہماری ضرورت ہے۔“

”کیا سنبھالا ہے ہمیں بانٹ کر۔ ایک دوسرے سے اس قدر دور دور کر دیا کہ ہم چاہیں بھی تو پاس نہیں آسکتے۔“ وہ تیزی سے عبیدہ کی بات کاٹ کر بولی۔ ”فضہ کہاں گئی؟ کیوں گئی؟ تمہیں معلوم ہے نا ہمارے اپنوں کی مہربانیاں کیا یہ احسان ہیں ان کے ہم پر۔“

”ہاں احسان ہی ہے ان کا۔ شکر کیوں نہیں کرتیں کہ انہوں نے ہمیں کسی یتیم خانے میں نہیں ڈال دیا۔ کسی دارالامان میں نہیں پھینک دیا۔ فٹ پاتھوں کے حوالے نہیں کر دیا۔ کل کو مون کا شاندار مستقبل ہو گا۔ تائی جی اور تائی جی نے پھوپھو کے سامنے تمہیں ولید بھائی کے لیے مانگ لیا ہے۔ ان دونوں کو اس گھر کو اب تمہاری ضرورت ہے۔ غزالہ آنٹی نے اتنے خراب حالات کے باوجود مجھے اخلاقی تعلیم دلوائی۔ یہ ان کا احسان ہے۔ ان لوگوں نے ہماری بہتر تعلیم و تربیت کی۔ کیا یہ احسان نہیں، وہ یہ سب نہ کرتے۔ ہم ان کا کیا بگاڑ لیتے۔“

”کیا احسان ہے اس گھر کا کرایہ کھاتے رہے ہیں تیار تھی اور تمہارے ساتھ کیا کیا غزالہ آنٹی نے؟ تمہارا بیوچر تباہ کر دیا انہوں نے۔ اگر ان کی کسی بیٹی کا میرٹ بننا ہو تا کیا وہ سردھڑا کر کے اسے داخلہ نہ دلواتیں۔ فضلہ کا کیا حال ہوا۔ مون کی ہمارے ساتھ بے کسی کا سبب کون ہے؟“

”تایا جی ہاؤس بلڈنگ والوں کا قرض ادا کرتے رہے ہیں بیو ابھی تک ادا نہیں ہو پایا۔ غزالہ آنٹی کیا کرتیں۔ پانچ بیٹیاں ہیں ان کی۔ اول تو وہ میری سرپرستی سے ہی انکار کر سکتی تھیں۔ انہیں کون مجبور کر سکتا تھا۔ یہ ان کی مہربانی ہے اور مجھے اکیلی کی خاطر کیا وہ ان پانچوں کو مار دیتیں۔ میں تو ان کا یہ احسان کبھی نہیں اتار سکتی۔ انہوں نے اپنے وسائل سے بڑھ کر مجھ پر خرچ کیا ہے۔ ایسی اگر میں ضد کرتی تو کیا ہوتا۔ ماما پاپا کی تربیت کو ان کے خون کو بدنام کرتی۔ مرے ہوؤں کا بھلا زندگی پر کیا حق رہ جاتا ہے۔ ایسی زندگی کے حقائق بہت سنگین ہیں۔ انکل جمال اور غزالہ آنٹی جس طرح سفید پوشی کا بھرم رکھ رہے ہیں یہ ان کا حوصلہ ہے پھر بھی انہوں نے مجھے بھی برا بھلا یا بوجھ نہیں گردانا اور تھوڑا بہت تو والدین بھی ڈنڈی مار رہی جاتے ہیں۔ کیا پتا ماما پاپا زندہ ہوتے وہ ہمارے لیے یہ سب کچھ بھی انورڈ نہ کر سکتے پھر تم کس کو الزام دیتیں؟“

”تائی جی نے کیا تمہارے ساتھ بہت برا کیا؟ انہوں نے تمہاری اچھی تربیت کی برا بھلا خیال رکھا۔ اب رات سے ان کی زبان پر تمہارا نام ہے۔ تمہیں یاد کر رہی ہیں ان کی محبتوں کا یہی صلہ ہو گا۔“

ایسی ادھی کون نہیں ہے یہاں۔ تائی جی تمہارے خیال میں خوش ہیں بننے کی بے وفائی کا داغ لگا ہے انہیں۔ غزالہ آنٹی ساری زندگی معاشی حالات سے جنگ لڑتی رہی ہیں بننے کو ترسی ہیں۔ سفینہ پھوپھو کو اولاد نہ نہ ہونے کا دائمی غم ہے۔ انہوں نے اس طرح مون کا خیال رکھا ہے کہ کہیں وہ انہیں چھوڑ کر نہ چلا جائے۔ ہمارے ماں باپ ہم سے پچھڑ گئے۔ وہ قدرت کا فیصلہ تھا فضلہ کا اس طرح جانا بھی حکم رہتی تھا۔ ہم تم اسے نہیں ٹال سکتے تھے۔ وہ ہمارے پاس رہتے ہوئے بھی اسی طرح مر سکتی تھی۔ تم ان حقائق سے نظریں نہیں چرا سکتیں۔ تم اپنے ہی غم کو محو رہنا کر اس کے گرد گھوم رہی ہو دو سروں کی طرف بھی تو دیکھو وہ کن عذابوں سے گزر رہے ہیں اور ہم ان کے غم کو کیسے کم کر سکتے ہیں۔“

اور اگر ان سب حقائق کے باوجود تم صرف اپنے ہی غم کو سینے سے لگا کر جینا چاہتی ہو تو تم سے بڑا خود غرض کوئی نہیں اور خود غرضی ہمیشہ بے سکونی دیتی ہے۔ دلی سکون تو قربانی اور احساس میں ہے۔ جو گزر گیا اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر بھول جاؤ۔“

ایمن! جب تقدیر میں ایک محرومی لکھ دی جاتی ہے تو بہت سی محرومیاں خود بخود مقتدر بن جاتی ہیں جیسے ایک نعمت ملتی ہے تو بہت سی نعمتیں خود بخود چلی آتی ہیں دولت ملتی ہے تو رزق کی فراوانی اور عیش بھی چلا آتا ہے۔ ماں باپ سے محرومی پر ہمیں بہت سی محرومیاں خود بخود مل گئیں اور جو تقدیر کے لکھے سے صلح کر لیتا ہے۔ وہ بہت کم رنج اٹھاتا ہے۔ ہاں آئندہ کے لیے عہد کر لو کہ جو زیادتیاں انجانے میں یا جانے میں دو سروں نے ہم سے کی ہیں ہم کسی سے نہ کریں۔ ایسی محبت میں سکون ہے۔ اس طرح غم کو سینے سے لگانے سے خدا بھی ناراض ہوتا ہے۔ ہم تو مسلمان ہیں۔ تقدیر پر یقین ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔“

پتا نہیں اس نے اتنی بڑی بڑی باتیں کہاں سے سیکھی تھیں۔ ”تو کیا اس گھر کو پھوپھو پر ان کروں۔ کیا ہماری تقدیر میں یہی لکھا ہے ہم اس کو بدلنے کی کوشش نہیں کر سکتے۔“ ہاؤس بلڈنگ والوں کے جو واجبات تھے۔ وہ فیئر انکل نے ادا کر دیے ہیں اور انہوں نے کہا ہے کہ اس گھر کی قیمت لگا کر تین حصے کر دیں گے۔ میرا اور تمہارا حصہ ہماری شادیوں میں لگا دیں گے۔ میں نے اپنے حصے کی رقم غزالہ آنٹی کو دیے کا فیصلہ کیا ہے اور زبیر انکل یہ گھر خود خرید کر اسے مون کے نام کر دیں گے۔ تین سالوں بعد اس

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن مجیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی بنی مسلمات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع ہو جاتی ہیں ان کے احترام آپ پبلشر سے بعد جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلاط طریقے کے مطابق بے مروتی سے محفوظ رکھیں

کی تعلیم مکمل ہو جائے گی تو وہ ادھر رہی اگر رہے گا۔ یہ گھر اس کے بعد ہمیشہ کے لیے آباد ہو جائے گا۔ ہمارا بھائی اسے آباد کرے گا ہمارے لیے۔ ایسی اٹھیک ہے نا۔ یہی ہونا چاہیے تھا نا؟“ وہ اس کا چہرہ انگلی سے اٹھا کر بولی۔ ”ہاں اور تین سال یہ بند رہے گا۔“

”ہمیں سفینہ پھوپھو اب ادھر رہیں گی۔ انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی کرنی ہے اور میں اور تم بھی پھوپھو کے ساتھ رہیں گے۔ تمہاری رخصتی تک یعنی چار پانچ ماہ تک تم ادھر رہ سکتی ہو۔“ وہ ذرا سا ہنسی۔ ”یہ کس کے فیصلے ہیں مجھ سے بالا ہی بالا۔“ وہ تنک کر بولی۔

”ہمارے بیویوں کے اور میں نے تمہاری نمائندگی کرتے ہوئے ہاں بھری ہے۔ ایسی! میں نے ٹھیک کیا ہے نا۔ تمہیں مجھ پر بھروسہ ہے نا؟“ وہ معصوم شکل بنا کر بولی تو وہ چپ رہی۔

”ایسی! میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی اگر تمہیں ان فیصلوں پر اعتراض ہے تو یقین کرو۔ میں تمہارے ساتھ اکیلی یہاں رہنے کو تیار ہوں۔“

”نہیں عبیرہ! اکیلا یہاں نہیں رہا جا سکتا۔ میں ساری رات ڈرتی رہی ہوں۔“ وہ فوراً بولی۔ ”تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ان سب فیصلوں پر؟“ وہ جلدی سے بولی۔ ”نہیں۔“

”گڈ! میں نے بھی سب سے یہی کہا تھا کہ ایسی مان جائے گی۔ چلو اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ولید بھائی ہمیں گیارہ بجے لینے آئیں گے۔“

”ولید اندر کیوں نہیں آیا؟“ اسے یاد آیا۔

”وہ تم سے ناراض ہیں۔ کل شام جو تمہارا رویہ ان کے ساتھ اس قدر خشک تھا۔“ وہ بولی۔

”اووہ! وہ ہنس پڑی۔“ وہ تو یونی میں اسے چڑا رہی تھی۔

”ایسی! ولید بھائی اچھے ہیں نا؟ تم خوش ہو نا۔“ عبیرہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”ہاں کیونکہ میں ولید کے مزاج کو سمجھتی ہوں اور ویسے بھی اب میں تائی جی کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ان کی خدمت کی عادت جو بڑی گہنی ہے۔ چلو ناشتہ کر کے ہاسپٹل چلتے ہیں مجھے کل ہی جانا چاہیے تھا۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”کل جاتیں تو عقل کیسے آتی۔ وہ تو آج آئی ہے۔“

عبیرہ ہنس کر بولی تو وہ اسے گھورنے لگی۔

”عبیرہ کی بچی! وہ بھی کہہ سکی۔“

دونوں اٹھ کر اندر چلی گئیں اور اسے یقین تھا ان فیصلوں سے سب سے زیادہ ماما پاپا کی روحیں خوش ہوئی ہوں گی۔ ان کو بھلا دینے میں ہی سکون ہے۔ خدا کے فیصلوں پر راضی ہونے سے کتنا سکون ملتا ہے۔ یہ اس کا دل ہی جانتا تھا جو ہلکا چھلکا ہو کر جیسے ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔

